چند یادیں

خواجہ جمیل احمد

اردو اکیڈمی سندھ۔ کراچی

چند یادیں

مُصنّفہ

خواجہ جمیل احمد

اُردو اکیڈمی سِندھ، کراچی

(جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں)

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
ACC No: 056382
MAILSI

پہلی بار: ۱۹۷۷ء

تعداد : ایک ہزار

کتابت : منشی احمد علی

طباعت : باب الاسلام پریس کراچی

TECHNICAL
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

کتاب خانہ سردار جھنڈیر
میلسی (پاکستان)
نمبر شمار: ....
کتاب نمبر: ....

انتساب

میرے روحانی مرشد شاعرِ اسلام ترجمانِ حقیقت

حضرت علامہ اقبالؒ

کے نام

جن کی زندہ جاوید اور ولولہ انگیز شاعری نے

میرے قلب کو سوز و گداز اور میری روح کو بالیدگی عطا کی

اور مجھے

حقیقی اسلام سے روشناس کرایا

فہرستِ مضامین

— خصوصی خاکے —

— مزاحیہ خاکے —

— دیگر خاکے —

. . . .

پیش لفظ

(از جناب سیّد حسین امام۔ سابق رکن مجلسِ عاملہ کل ہند مسلم لیگ
اور سابق صدر کونسل آف اسٹیٹ ہند دہلی)

خواجہ جمیل احمد صاحب سے میری ملاقات اس زمانہ میں ہوئی جب میں ایوب خاں کی جابر حکومت کے خلاف اس ضعیف العمری میں برسرِ پیکار تھا۔ ان کی حکومت عاشقانِ پاکستان یعنی مہاجرین کے حق میں کچھ زیادہ ہی "مہربان" تھی۔ مہاجر دعوے داروں کے کلیم کی زمینوں کی ۸۹ اور ۹۱ کے حکم ناموں کے ذریعہ وہ قطع و برید ہوئی کہ سب کو اقبال کا یہ مصرعہ یاد آگیا۔

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بہرحال یہ ایک طویل داستان ہے اور یہ المیہ ہے، کہ آج اس عوامی حکومت کے دَور میں بھی عہدِ ایوبی کا یہ آمرانہ قانون اپنے جبر و استبداد کے ساتھ پوری طرح موجود ہے۔

خواجہ جمیل احمد صاحب فنون کے طالب علم رہے ہیں۔ وہ حکومت پاکستان کے محکمۂ اطلاعات اور برطانوی محکمۂ اطلاعات کے اہم مناصب پر فائز رہ چکے ہیں، انھوں نے اپنے دورِ ملازمت میں ملک اور بیرون ملک کے موقر جرائد اور روزناموں میں مختلف موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ نیز ریڈیو پاکستان اور وائس آف امریکہ کے لئے سینکڑوں تقاریر اور فیچر لکھے اور نشر کئے ہیں۔ وہ متعدد اہم کتابوں کے مصنف ہیں جن میں انگریزی زبان میں تحریر کردہ "سو عظیم مسلمان" اور "وراثت اسلام" بین الاقوامی شہرت کے مورخوں، ادیبوں اور جرائد سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔

پاکستان میں آخری ملازمت انھوں نے ایک بنک پاکستان صنعتی ترقیاتی بنک (IDBP) میں کی اور وہیں سے ریٹائر بھی ہوئے۔ یہاں بھی وہ بنک کے محکمہ نشرو اشاعت کے سربراہ تھے۔ اس طرح انھوں نے بہی کھاتہ اور جوڑ باقی کے ساتھ ساتھ فنون سے رابطہ قائم رکھا اور اب تصنیف و تالیف کے کام کو زیادہ یکسوئی اور تندہی سے شروع کر دیا ہے۔ وہ انگریزی زبان میں پاکستان کی مستند اور جامع تاریخ لکھ رہے ہیں جو حقایق سے لبریز ہوگی۔ جس میں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے بعد کے واقعات پر حقیقی روشنی ڈالی جائے گی۔ اور ناقابلِ تردید حوالہ جات کے تحت ان واقعات پر بے لاگ تبصرہ کیا جائے گا جس نے پچیس سال کے قلیل عرصے میں دنیا کی سب سے بڑی اس اسلامی سلطنت کو دو نیم کر دیا اور زوال سے ہمکنار کر دیا۔ خواجہ صاحب کی زیر تبصرہ کتاب "چند یادیں" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

انسان اپنی زندگی میں مختلف قسم کے افراد سے ملتا ہے۔ ان کی یادوں کے چراغ کو روشن رکھنا بھی جمیل صاحب کے ذوقِ جمیل کا ثبوت ہے۔ انھوں نے

کرسی نشینوں کی قصیدہ خوانی نہیں کی ہے۔ بلکہ حقیقتوں پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ حسرت موہانی سے زہرہ نگاہ تک کے فاصلہ میں جو بھی موثر شخصیت اُن سے ملی خواہ سیاست داں ہو یا مفکر۔ شاعر ہو یا ادیب فنکار ہو یا معلم اس کی جھلک اس کتاب میں نظر آئے گی۔ خواجہ صاحب کی چند یادیں" جوش صاحب کی "یادوں کی برات" سے ہر لحاظ سے مختلف ہے۔ اس میں نہ وہ طنز ہے نہ راجہ اندر کا اکھاڑہ اور نہ ان بیگمات کا تذکرہ جو صاحب کتاب پر مرمٹا کرتی تھیں۔ جوش صاحب کی "یادوں کی برات" کے برعکس خواجہ صاحب کی "چند یادوں" میں شامل کردہ شخصیات کے کارناموں اور ان کے کردار دونوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سے متعلق مصنف کے ذاتی تاثرات نے ان کے قلمی چہروں کو بہت دل کش بنادیا ہے۔ ان میں متعدد ایسی تاریخ ساز شخصیات بھی ہیں جنھوں نے حصولِ پاکستان میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کے اور دیگر شخصیات کے اخلاقی پہلو کو اُجاگر کر کے مصنف نے پاکستانی لیڈروں کو مشعل راہ دکھائی ہے۔ خواجہ صاحب نے ایک واقعہ نگار کی طرح ہمارے سامنے سیدھے سادھے موثر الفاظ میں ان شخصیتوں کی تصویر کھینچی ہے۔ ان کی طرز تحریر کی سادگی، فن پر ان کی مضبوط گرفت کی دلیل ہے۔

تعجب ہے کہ خواجہ صاحب جو ایک بنگارہ چکے ہیں۔ انھوں نے کس طرح گھاٹے کا سودا کرنے کا فیصلہ کیا۔ آج کے دور میں جب لوگوں کو دال چاول کا بھاؤ اچھی طرح معلوم ہو رہا ہے اور وہ صبح سے شام تک پیٹ بھرنے اور سفید پوشی کو نبھانے کے لئے سرگرداں رہتے ہیں انھوں نے ایک کتاب کا اضافہ کر دیا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے ہی زیادہ تر علم دوست

ہوتے ہیں لیکن آج کل جبکہ وہ ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں۔ انھیں۔ حسرت موہانی سے زہرہ نگاہ تک پڑھنے کی فرصت کہاں ؟

پاکستانی معاشرہ جو آج کل تفریح کے لئے ہلکے پھلکے مضامین، افسانوں اور جاسوسی ناولوں کا دلدادہ ہو گیا ہے اُسے سنجیدہ اور فکر انگیز ادب سے کیا واسطہ! غرضکہ خواجہ جمیل صاحب نے اس امانت کو جو یادوں کی شکل میں ان کے دل میں چھپی ہوئی تھی، قوم کی جانب لوٹا دی ہے۔ اب اس کا فیصلہ پڑھنے والوں کو کرنا ہے کہ وہ اس میں کس حد تک کامیاب رہے۔

حسین امام

کراچی : ۱۷ر جولائی ۷۸ء

عرضِ حال

ہر شخص کی زندگی میں کچھ ایسی یادگار شخصیتیں آتی ہیں جو کسی حالت میں بھی بُھلائی نہیں جا سکتی ہیں۔ ان کے نقوش اس کے لوحِ دل اور دماغ پر اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ انھیں کسی صُورت سے بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ جو زندگی کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتے ہیں۔ اس میں ماضی کی کچھ ایسی یادیں ہوتی ہیں جو اس شخص کا سرمایۂ حیات ہوتی ہیں، اور کچھ ایسے مزاحیہ خاکے ہوتے ہیں جو اُسے اکثر ہنسایا کرتے ہیں، اور جنھیں بیان کرتے وہ دوسروں کو بھی کبھی ہنسایا کرتا ہے۔

"چند یادوں میں" میں نے ایسے ہی اشخاص کے کچھ خاکے لوحِ دماغ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیئے ہیں جنھوں نے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے۔ اور جن کو میں نے قریب اور دُور سے دیکھا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوا ہے میں نے ان اشخاص سے متعلق اپنے تاثرات کی صحیح عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔

مزاحیہ خاکوں میں اگر کہیں کہیں ابتذال پیدا ہو گیا ہے تو یہ اس صحیح عکاسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں اگر رواداری سے کام لیا جاتا تو یہ خاکے حقیقت سے دور ہو جاتے اور ان میں وہ تاثر نہ پیدا ہوتا جو ان خاکوں کی جان ہیں۔ عکاسی میں رواداری اور مبالغہ آرائی دونوں سے خاکوں کے اصلی خد و خال نہیں ابھرتے ہیں اور ان میں وہ خلوص پیدا نہیں ہوتا ہے جو ان کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ اس کتاب میں کہیں کہیں ایسی روایات پر انحصار کیا گیا ہے جو خلاف واقعہ ہو سکتی ہیں، اور جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن جہاں تک ممکن ہوا ہے شنیدہ کو پرکھنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔

شخصیتوں کے انتخاب میں کسی جانبداری کا خیال نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ ذاتی تاثر کا نتیجہ ہے جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے ان شخصیتوں سے متعلق صحیح واقعات بیان کئے گئے ہیں اور ان شخصیتوں کی عظمت یا ان کی مخصوص عادات اور اطوار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس میں کچھ ایسی شخصیتوں کے خاکے بھی ہیں جنھیں پاکستان میں بڑا تلخ تجربہ ہوا ہے جن کے لئے ان کے خوابوں کی یہ جنت محض ایک سراب ثابت ہوئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ با صلاحیت افراد۔ عظیم دانشوروں، ادیبوں۔ فنکاروں۔ سائنس دانوں، پروفیسروں اور فنی ماہروں کی جیسی ناقدری اس مملکت خداداد پاکستان میں ہوئی ہے اس کی مثال کسی دوسری جگہ مشکل سے مل سکتی ہے۔ کھرے اور کھوٹے میں یہاں کبھی تمیز نہیں کی گئی۔ بلکہ علاقائی، صوبائی اور انفرادی عصبیتوں کے تحت یہاں اکثر و بیشتر پٹیل کو

سونے پر ترجیح دی گئی۔ بڑے بڑے با صلاحیت افراد پاکستان کے صاحبِ اقتدار حضرات کی سرد مہریوں اور خود غرضیوں کا شکار ہو کر پیوندِ خاک ہو گئے اور کچھ غیر ممالک کو ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ جہاں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

مملکت خداداد پاکستان نے جو در حقیقت ایک نظریاتی مملکت کی حیثیت سے عالم وجود میں آئی تھی زوال پذیری کی ایسی بدترین مثال قائم کی ہے جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی ہے۔ جو شخص بھی یہاں برسرِ اقتدار آتا ہے وہ اپنی سات پشت کا انتظام کرنے کی پہلے فکر کرتا ہے اور اس غریب ملک کے غریب عوام کے پیسے سے جی بھر کے گل چھرّے اُڑاتا ہے۔ یہی وجہ ہے پچیس سال کے قلیل عرصے میں اس ملک کا نصف حصہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ اس کی نوّے ہزار جری فوج نے دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دئے۔ اور مسلمانوں نے ایک ہفتہ کے اندر پندرہ لاکھ مسلمانوں کو اس ملک میں انتہائی شقادت کے ساتھ تہہ تیغ کر دیا۔

یہ سب کیوں ہوا۔ یہ ایک الگ داستان ہے لیکن بادی النظر میں اس کی صرف دو وجوہات ہیں۔ اول اس مملکت خداداد پاکستان میں ان نظریات سے فریب کیا گیا، جن کو پروان چڑھانے کے لئے یہ قائم ہوئی تھی۔ اور جس کے لئے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں نثار کی تھیں اور کروڑوں مسلمانوں نے اپنا گھر بار اور وطن چھوڑا تھا۔ اسلام جس کو فروغ دینے کے لئے یہ مملکت عالم وجود میں آئی تھی اس کی جتنی یہاں مٹی پلید ہوئی، اس کی نظیر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتی ہے۔ زبان سے اسلام اسلام اور عمل

سے شیطان کی پیروی یہاں ہوتی رہی ہے۔ اس طرح پچیس سالہ زندگی میں اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انتہائی نفس پرور۔ مصلحت کوش اور غیر اسلامی معاشرہ پرورش پاتا رہا۔ دویم، قومی نظریہ اور قومی یک جہتی، قومی ترقی کا ضامن ہوا کرتی ہے لیکن یہاں ان کو فروغ دینے کے بجائے صوبائی علاقائی، طبقاتی اور انفرادی عصبیتوں کو ہوا دی گئی اور ان کے تحت ہر قسم کی ناانصافیاں روا رکھی گئیں۔

اس کتاب کے افراد سے متعلق جو واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ عوامی حکومت کے قیام سے ماقبل زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ درحقیقت سقوط مشرقی پاکستان اسی نوزائیدہ مملکت کی زوال پذیری کی منتہا تھی۔ اس ٹوٹے ہوئے پاکستان کی خاکستر پر قائدِ عوام ذوالفقار علی بھٹو کی دانشمندانہ قیادت میں ایک نئے پاکستان کی تعمیر بہت کامیابی سے شروع کی گئی ہے جس میں عوام کو طاقت کا سرچشمہ تسلیم کیا گیا ہے۔ خداوند قدوس سے یہ دعا ہے کہ نیا پاکستان قائدِ اعظم کے خواب کی تعبیر اور پاکستان کی نشاۃ ثانیہ ثابت ہو۔

اس کتاب میں مختلف شخصیتوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے اگر اس سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچے تو میں معذرت خواہ ہوں اور انھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس میں کوئی مخاصمانہ یا انتقامی جذبہ کارفرما نہیں ہے۔

خواجہ جمیل احمد

کاشانۂ زبیدہ۔ ناظم آباد

کراچی ۱۹۷۳ء

مولانا حسرت موہانی

قیام پاکستان سے چار پانچ سال قبل میں چمن گنج کانپور کے عقب احاطہ کمال خاں میں اپنے ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ ان کے مکان کے سامنے پانی کا ایک نلکا لگا ہوا تھا۔ جس سے آس پاس کے غریب لوگ جن کے مکان میں نل نہیں تھے، پانی بھرا کرتے تھے۔ میں اپنے دوست کے بیرونی کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹے قد کے ایک بزرگ جن کی چوڑی گرد اور داڑھی ان کے چہرے پر چھائی ہوئی تھی، دو بالٹیاں لے کر نلکے سے پانی بھرنے آئے۔ میرے دوست نے اشارہ سے کہا: "ان کو تم جانتے ہو؟" میں نے نفی میں جواب دیا۔ وہ بڑے متعجب ہوئے: "ارے تم مولانا حسرت موہانی کو نہیں جانتے!" میں نے کہا: "بھلا ان سے کون واقف نہیں ہوگا۔ لیکن یہ مولانا ہیں؟" "ہاں ہاں وہی ہیں۔" میرے دوست نے میرے استعجاب کو دور کرتے ہوئے کہا: "وہ سامنے ان کا مکان ہے۔ وہ اپنے مکان کا پانی

تو بھرتے ہی ہیں۔ ایسی غریب خواتین کے گھروں کا بھی پانی بھر دیتے اور سودا سلف لا دیتے ہیں جن کے مرد پردیس یا کام پر گئے ہوتے ہیں۔"

میں نے مولانا حسرت موہانی کی سادگی اور خلوص کے متعلق بہت کچھ سُنا تھا، آج میں نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا۔ ہمارے اسلاف کی یہ زندہ یادگار حسرت موہانی ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے فرسٹ کلاس گریجویٹ ہوئے۔ جب علی گڑھ سے تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہونے والے گریجویٹ ڈپٹی کلکٹر ہوا کرتے تھے۔ مولانا کو میں نے بڑی عقیدت سے دیکھا۔ جی یہی چاہتا تھا کہ قرونِ اولیٰ کے اس سچے اور پاک باطن مومن کے قدم چوم لوں، لیکن میرے دوست نے مجھے ایسا کرنے سے باز رکھا انھوں نے مجھے بتایا کہ "مولانا عقیدت کے اس قسم کے اظہار کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ اس سے افراد میں انا بیدار ہوتی ہے۔ جو مولانا ایسے درویش صفت انسان کی فطرت کے خلاف ہے۔"

مولانا حسرت ایسے جامع الصفات اور درویش صفت انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر۔ ادیب۔ نقاد۔ بیباک لیڈر، سادگی اور خلوص کا پیکر اور سب سے بڑھ کر ایک ایسا انسان جس کے قول و فعل میں کبھی کوئی تضاد نہیں تھا۔ مولانا حسرت صحیح معنوں میں اقبال کے مردِ مومن کا زندہ جاوید نمونہ تھے، جن کے متعلق وہ کہہ گئے ہیں ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

چھوٹا قد، گرد اور گھنی داڑھی۔ سر پر پرانی ترکی ٹوپی۔ معمولی شیروانی اور چوڑی مہری کا پائجامہ زیب تن کیے۔ پیر میں سلیپر سٹر سٹراتے۔ مولانا حسرت کو کوئی دیکھتا تو مخبوط الحواس سمجھتا، لیکن سادگی اور سچائی کے اس بظاہر غیر موثر پیکر میں قدرت نے ایسا عزم اور استقلال بھر دیا تھا جو پہاڑوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ جس نے برطانوی سامراج کو اس وقت للکارا اور اس کے نتیجہ میں قید و بند کے مصائب برداشت کیے جب جیل میں اے اور بی کلاس نہیں ہوا کرتے تھے اور سیاسی قیدیوں کو ہر قسم کی سختیاں جھیلنی پڑتی تھیں چکی پیسنی پڑتی تھی اور کوڑے کھانے پڑتے تھے۔

مولانا حسرت کوئی بڑے مقرر نہ تھے۔ ان کی آواز جھینگر سے ملتی جلتی تھی، لیکن ان کی بے پناہ روحانی قوت اور اخلاقی جرأت۔ خلوص اور صداقت کے سامنے برصغیر کا بڑے سے بڑا لیڈر بھی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ آزادی کا ایسا شیدائی اس برصغیر نے صدیوں کے بعد پیدا کیا تھا جو اظہارِ خیال میں انتہائی بے باک تھا۔ اور نعرۂ حق کو بلند کرنے میں بڑے سے بڑے فرعون کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اس نے آزادیٔ خیال کی بدولت بڑی بڑی صعوبتیں جھیلیں بڑے بڑے مصائب برداشت کیے لیکن اس کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی، انھوں نے کانگریس میں آزادیٔ کامل کی آواز اس وقت اٹھائی جب گاندھی جی داخلی آزادی سے آگے سوچ نہیں سکتے تھے۔ انھوں نے مسلم لیگ میں بھی نعرۂ حق بلند کیا وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے

بھارتی پارلیمنٹ میں نہرو اور پٹیل کی مسلم کش پالیسی کو چیلنج کیا۔

سید فضل الحسن حسرت موہانی یوپی کے ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبہ موہان کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ اور مڈل کے امتحان میں وہ سارے صوبہ میں اوّل آئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول فتحپور سے امتیاز کے ساتھ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے وظیفہ حاصل کیا۔ اور ۱۹۰۳ء میں اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ سے امتیاز کے ساتھ بی۔اے پاس کیا۔

حسرت موہانی ابتدا ہی سے بہت آزاد خیال اور برطانوی استعمار کے سخت خلاف تھے۔ انھوں نے سرکاری ملازمت کی جانب کبھی التفات نہیں کیا اور ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ انھوں نے علی گڑھ سے ۱۹۰۴ء میں اردوئے معلیٰ جاری کیا جس میں اردو کے ادیبوں پر بہت پر مغز اور معلوماتی مضامین لکھے جاتے تھے۔ اس جریدے نے اردو ادب اور تنقید کو فروغ دینے میں بہت نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس زمانے میں اردوئے معلیٰ میں ایک مضمون "مصر میں برطانوی حکمت عملی" شائع ہوا جس میں برطانوی حکمت عملی پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ حکومتِ ہند نے اس مضمون کو باغیانہ قرار دیا، اور حسرت موہانی سے مضمون نگار کا نام دریافت کیا۔ یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر اور ادیب اقبال سہیل صاحب نے لکھا تھا۔ مولانا نے مضمون نگار کا نام ظاہر کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے خمیازہ میں دو سال کی قید

بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ منظور کرلیا۔ جرمانہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں مولانا کے کتب خانہ کی نادر کتابیں کوڑیوں کے مول اونے پونے نیلام کردی گئیں۔ یہی ان کی زندگی کا سرمایہ تھا، جس کا انھیں زندگی بھر قلق رہا۔

مولانا حسرت پہلے شخص تھے جنھیں پریس کے قانون کے تحت ہندوستان میں قید بامشقت جھیلنی پڑی۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے برخلاف جو قید خانہ میں اول درجہ کی آسائشوں سے لطف اندوز ہوئے، مولانا کو عام اخلاقی مجرموں کی طرح قید بامشقت کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں۔ اور رمضان کے مہینے میں سارے سارے دن چکی پیسنا پڑتی تھی۔ اسی زمانہ کا یہ شعر ہے ؎

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دن بھر میں ایک ایک من گندم انھیں پیسنا پڑتا تھا اور گندم کم ہونے کی صورت میں انھیں کوڑے کی سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ کوڑوں کے نشان ان کے جسم پر جا بجا نمایاں تھے۔ انھیں قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی۔ ایک جانگیا اور جیکٹ ان کا لباس تھا جس سے نماز پڑھنے میں بہت زحمت ہوتی تھی۔ انھوں نے اردوئے معلےٰ میں لکھا تھا کہ ابتداء میں اس طرز زندگی میں بڑی تکلیف محسوس ہوئی، لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو گئے، اور انھیں اس میں وہ روحانی لذت اور سکون میسر ہوا، جس نے غیر ملکی استعمار کے خلاف ان کے خیالات کو انتہائی پختگی عطا کی۔

زمانہ مابعد میں برطانوی استعمار کی سختیاں اور تر غیبات ان کے آہنی عزم کو متزلزل نہ کر سکیں۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ کے دوران انھوں نے اطالوی حملہ آوروں کے خلاف مضامین لکھے اور ہندوستان میں اطالوی مال کے بائیکاٹ پر زور دیا۔ جس کی بنا پر حکومت یوپی نے ان سے تین ہزار روپے کی مزید ضمانت طلب کی۔ مولانا کے پاس اتنا سرمایہ کہاں تھا۔ انھوں نے اپنا جریدہ بند کر دیا۔ اور "تذکرہ شعراء" کے نام سے دوسرا نکالا۔

سیفٹی ایکٹ کے تحت ۱۹۱۶ء میں حکومت نے انھیں مزید دو سال کے لئے جیل میں بند کر دیا۔ کونسی ایسی سختی تھی جو اس بطل حریت پر برطانوی حکومت نے آزمائی نہ ہو۔ لیکن بقول چکبست ؎

مجھے اسیر کرو یا میری زباں کاٹو
میرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

قید و بند کے مصائب نے ان کے خیالات کو اور پختہ کر دیا، اور برطانوی استعمار کا مقابلہ کرنے کے لئے انھیں روحانی طاقت عطا کی۔

مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی نے کانگریس کو دستوری سے ایک فعال جماعت بنایا۔ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس کے سالانہ اجلاس میں مولانا حسرت نے ہندوستان کے لئے مکمل آزادی کی قرارداد پیش کی۔ گاندھی جی اس وقت آزادی کامل کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ داخلی خود مختاری کا مطالبہ کر سکتے تھے۔

مولانا حسرت نے کانگریس اور خلافت کی تحریکوں میں نمایاں حصّہ لیا۔ اور کانگریس کی عدم تعاون کی تحریک میں وہ پیش پیش رہے جس کی بنا پر ۱۹۲۴ء میں انھیں ایک بار پھر جیل بھیجدیا گیا۔

پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند کی سنہ ۱۹۲۳ء میں شدھی سنگھٹن تحریک نے ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے مثالی اتحاد کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس پر گاندھی جی کی پراسرار خاموشی نے مسلمانوں کے دلوں میں کانگریس کی جانب سے شکوک پیدا کر دیئے۔ مولانا حسرت اور علی برادران نے ہندوستان میں فرقہ وارانہ نفاق کو دور کرنے کی ہزار کوشش کی لیکن ہندو کانگریس کے عدم تعاون نے ان کوششوں کو بارآور نہیں ہونے دیا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد جب ہندو کانگریس اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر ہوگئی۔ مولانا حسرت اور علی برادران کو بادلِ ناخواستہ کانگریس سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

مولانا حسرت نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی، اور ان کی قیادت نے مسلم لیگ کو جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوابوں کی جماعت سے ایک عوامی جماعت بنادیا۔ مسلم لیگ کو عوام میں مقبول بنانے میں مولانا حسرت اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا حسرت نے بھارت میں قیام کا فیصلہ کیا وہ ہندوستان میں رہنے والے لاچار اور بیکس مسلمانوں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد جب بھارتی لوک سبھا (پارلیمنٹ) میں

سارے اراکین نہرو اور پٹیل کو مبارک باد دینے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مولانا نے ہندوستان کے مرد آہن سردار پٹیل کو للکارا۔ انھوں نے کہا: "تم یہ نہ سمجھو کہ پاکستان بن جانے کے بعد ہندوستان کے مسلمان یتیم ہو گئے ہیں، میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک ان کے حقوق کے لئے جنگ کرتا رہوں گا۔" مولانا حسرت کی جرأت آمیز تقریر سے سارے ایوان میں سناٹا چھا گیا۔ پٹیل تو خاموش رہے، نہرو جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اس پر مولانا نے ان پر طنز کیا: "تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم ایک ایسے شخص کا جواب دینے کے لئے کھڑے ہوئے ہو، جس کے سامنے تمھارے باپ کو بھی کبھی بولنے کی جرأت نہیں ہوئی۔" اس جملہ پر نہرو فوراً بیٹھ گئے۔

مولانا حسرت ایک جامع الصفات انسان کے ساتھ ساتھ صحیح معنوں میں ایک مسلمان تھے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی سادگی، خلوص اور بیباکی کی وہ ایک زندہ مثال تھے۔ وہ ہمیشہ ریل کے تیسرے درجہ میں سفر کرتے تھے۔ ہر سال جہاز راں کمپنیاں انھیں حج کے لئے درجہ اوّل کا ٹکٹ دیتی تھیں لیکن وہ ہمیشہ عرشے پر سفر کرتے تھے۔ اس طویل سفر کے لئے ان کا سارا سامان ایک چھوٹے سے بستر اور لوٹے پر مشتمل ہوتا تھا جسے وہ خود اٹھا لیتے تھے۔

مولانا حسرت کے بلند کردار کی وجہ سے دوست دشمن۔ ہندو مسلمان سبھی ان کی عزت کرتے تھے۔ ایک بار لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر

مسٹر کول نے انھیں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن آکر اپنی غزل سنانے کی دعوت دی۔ مولانا مقررہ وقت پر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔ جب وہاں سے رخصت ہونے لگے تو اسٹیشن ڈائرکٹر دروازے تک مولانا کو چھوڑنے آیا اور انھیں آنے جانے کا سیکنڈ کلاس کا سفر خرچ اور معاوضہ کا چیک پیش کیا۔ مولانا نے کہا۔ "یہ میں لے کر کیا کروں گا۔ ریل کا تھرڈ کلاس کا کانپور سے لکھنؤ تک کا آمد و رفت کا کرایہ ایک روپیہ دس آنے اور یکہ کا دو طرف کا کرایہ چار آنے میرے خرچ ہوئے ہیں۔ یہ مجھے دے دو۔" ڈائرکٹر نے ایسا بے نفس انسان شاید زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے بہت اصرار کیا۔ لیکن مولانا نے ایک روپیہ چودہ آنے سے زائد لینے سے انکار کر دیا۔

مولانا حاجت مندوں اور غریبوں کی ہر قسم کی حتی الامکان امداد کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ محلہ کے ایک صاحب مولانا کے پاس آئے انھوں نے بتایا کہ پولیس نے انھیں ایک غلط مقدمہ میں پھانس دیا ہے اور مولانا سے درخواست کی کہ "آپ ڈپٹی کمشنر سے کہہ دیجئے تو مجھے پولیس سے چھٹکارا مل جائے گا" دوست دشمن سبھی مولانا کا احترام کرتے تھے۔ مولانا فوراً تیار ہو گئے۔ اس وقت کانپور کا ڈپٹی کمشنر ایک کٹر مہا سبھائی تھا، اور مولانا ایک پرجوش مسلم لیگی لیڈر بن چکے تھے۔ مولانا پیدل ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر پہنچے۔ اطلاع کرائی۔ ڈپٹی کمشنر فوراً دفتر سے نکل کر آیا اور مولانا کو لے جا کر اپنے پاس بٹھایا۔ مولانا نے

آنے کا مقصد بیان کیا۔ اس پر مہا سبھائی ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا۔ "مولانا صاحب آپ کو بھلا زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کسی سے کہلوا دیتے کافی تھا۔ آپ جیسے عظیم انسان تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں جو ملک اور قوم کے لئے باعثِ فخر ہوتے ہیں۔ سارے ہندوستان کو آپ پر ناز ہے۔"
ڈپٹی کمشنر نے مولانا کا کام اُسی وقت کرا دیا۔ اور اپنے بنگلہ کے باہر دروازہ تک مولانا کو چھوڑنے آیا۔ قائدِ اعظم بھی مولانا کی بڑی عزت کرتے تھے۔

سادگی اور خلوص کا یہ پیکر ایک ایسا عظیم انسان جس کا سر خدائے قدوس کے سوا کسی فانی ہستی کے سامنے کبھی نہیں جھکا وہ بطل حریت جس نے برطانوی سامراج سے ٹکر لی، اور ہندو قیادت کو للکارا۔ آخر کار ۱۳ رمئی ۱۹۵۱ء کو اس دار فانی سے کوچ کر کے اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔ اقبال نے شاید ایسے ہی مرد قلندر کے لئے کہا تھا ؎

ہزار خوف ہو پر دل رہے زبان کا رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

سردار عبدالرب نشتر۔ جنہیں تحریک خلافت میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ ان کی پرخلوص قیادت اور مثالی زندگی سے بہت متاثر تھے۔ مولانا حسرت کے انتقال پر نشتر صاحب نے فرمایا۔ "مولانا حسرت ایک عظیم شاعر، ایک عظیم قائد اور ایک عظیم ادیب تھے، لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھے۔"

مولانا محمد علی جوہر

اس صدی میں اسلامی ہند کے عظیم رہنماؤں میں محمد علی جوہر کا نام سر فہرست ہے۔ درحقیقت اس دور میں اسلامی ہند کی بیداری مولانا محمد علی اور حسرت موہانی کی پر خلوص اور پُر جوش قیادت اور علامہ اقبال کی ولولہ انگیز شاعری کی مرہونِ منت ہے۔ اردو اور انگریزی کے پُر زور مقرر اور ادیب۔ نامور شاعر اور صحافی۔ عظیم قائد اور سیاست داں مولانا محمد علی ایک جامع الصفات اور مجموعہ کمالات انسان تھے، جن کے متعلق انگلستان کے نامور ناول نگار اور ادیب ایچ جی ویلز نے کہا تھا "محمد علی کا قلم میکالے کا قلم۔ محمد علی کی زبان برک کی زبان۔ محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا"۔ ایسے ہی اشخاص کے متعلق شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

غالباً سنہ ۱۹۲۹ء یا سنہ ۱۹۳۰ء کا زمانہ تھا۔ حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ جس کی صدارت رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر نے کی تھی۔ ملک کے دوردراز حصوں سے مسلم زعماء اس کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ میں اس وقت اسی اسکول میں آٹھویں درجہ کا طالب علم تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مولانا محمد علی تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو سارا پنڈال اللہ اکبر اور مولانا محمد علی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ مولانا نے ایک بڑی پرجوش تقریر کی جو تاریخی دلائل سے بھری ہوئی تھی، اور جس نے سامعین کو مسحور کر دیا تھا۔ مولانا کی سحربیانی اور زورِ قلم کے دوست دشمن سبھی قائل تھے۔ جنھوں نے ہندوستانی عوام کی بیداری اور کانگریس کو ایک فعال جماعت بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔

ہندوستانی قائدین کے زمرہ میں محمد علی ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ ان کی فعال شخصیت اور دلیرانہ قیادت نے ہندوستانی عوام میں خوداعتمادی پیدا کی اور انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرکے غیر ملکی سامراج کا مقابلہ کرنے پر تیار کیا۔ محمد علی کی تحریروں اور تقریروں نے سارے ملک میں آگ لگا دی، اور عوام کے دلوں سے احساسِ کمتری کو دور کرکے انھیں برطانوی حکمرانوں سے ٹکر لینے پر آمادہ کیا۔ برطانوی حکومت سے تعاون سے متعلق سرسید احمد خاں کی حکمتِ عملی کی جگہ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے احیاءِ اسلام اور احیاءِ خلافت سے متعلق انقلابی تحریک سے اسلامی ہند کو متعارف کرایا۔ وہ سراپا اسلام تھے۔ اللہ کے

سوا کسی دوسرے کے سامنے جھکنے کو تیار نہ تھے۔ ان کے نزدیک خدا کی نافرمانی کر کے بندوں کی فرمانبرداری نہیں ہو سکتی تھی۔

محمد علی یوپی کی ریاست رام پور میں سنہ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبد العلی خاں جو ریاست کے بڑے عہدے دار تھے۔ ایام جوانی میں انتقال کر گئے اس وقت محمد علی کی عمر صرف دو سال تھی۔ ان کی روشن خیال والدہ آبادی بانو نے محمد علی اور ان کے دو بڑے بھائیوں کی تربیت کی اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ میں محمد علی کے جوہر کھلے۔ مسلمانوں کی اس عظیم درسگاہ کے وہ بہترین طالب علم مقرر اور فرزند ثابت ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سنہ ۱۸۹۶ء میں بی کے امتحان میں وہ سارے صوبے میں اوّل آئے۔ بعد ازاں وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے انگلستان چلے گئے۔ جہاں برطانیہ کی مشہور آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہندوستانی مجلس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ انگلستان کی اس قدیم یونیورسٹی میں وہ اپنے زمانے کے سب سے پُر زور مقرر تسلیم کئے گئے۔ یونی ورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد محمد علی نے انڈین سول سروس کا امتحان دیا، جو اُس زمانے میں امرا کے لئے مخصوص تھی۔ لیکن ان کی انتہائی خوش قسمتی تھی وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ سول سروس کی پابند اور محدود زندگی برصغیر کو اپنے ایک عظیم انقلابی اور جامع الصفات شخصیت سے محروم کر دیتی۔

وطن واپسی کے بعد محمد علی رامپور اور بروده کی ریاستوں میں اہم مناصب پر فائز ہوئے۔ لیکن ملازمت کی پابندیاں ان جیسے آزاد منش اور حریت پسند انسان کے لئے بہت گراں تھیں۔ قدرت نے انھیں کسی اور کام کے لئے پیدا

کیا تھا۔ ملازمت کی پابندیاں ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مانع تھیں۔

محمد علی نے آخر کار برودہ کی ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور جنوری سنہ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار 'کامریڈ' کا اجراء کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے برصغیر میں پریس کے سخت قوانین کے متعلق اپنی موثر آواز بلند کی۔ کامریڈ نے جدید ہندوستان کی سیاست اور صحافت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان کا جریدہ ہندوستان اور انگلستان کے اعلیٰ ترین حلقوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں جب ترکی جرمنی کا حلیف بنا تو لندن ٹائمز نے ترکوں کے خلاف ایک سخت اداریہ لکھا جس کے جواب میں محمد علی نے "کامریڈ" میں ۳۶ گھنٹہ کی مسلسل محنت کے بعد "ترکوں کا انتخاب" کے زیرِ عنوان ایک یادگار اداریہ لکھا جس کی بنا پر اخبار کی ضمانت ضبط کر لی گئی۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں کامریڈ دہلی منتقل کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں محمد علی نے دہلی سے اردو روزنامہ 'ہمدرد' جاری کیا۔ جس نے ظفر علی خاں کے زمیندار اور ابوالکلام آزاد کے الہلال کے دوش بدوش اسلامی ہند کی سیاسی بیداری میں اہم کردار ادا کیا۔

محمد علی اب ہندوستان کے اہم ترین سیاسی لیڈر بن چکے تھے۔ انھوں نے غیر ملکی سامراج کے خلاف ہندوستانی عوام کو سیاسی جدوجہد کے لئے تیار کیا۔ ان کی پُرجوش قیادت میں مسلمان ایک خوددار اور بیدار قوم بن چکے تھے۔ آزادی کا ایسا دلدادہ اور جبر و استبداد کا ایسا پکا دشمن جدید ہندوستان نے ابھی تک پیدا نہیں کیا تھا۔ محمد علی برصغیر کے سیاسی افق پر بیسویں صدی کے اولین حصہ میں

چھائے رہتے۔ کانگریس میں ان کی شمولیت نے غیر ملکی سامراج سے تعاون کرنے والی جماعت کو ایک فعال اور انقلابی جماعت بنا دیا۔ گاندھی جی کو ایک عوامی اور انقلابی لیڈر علی برادران اور مولانا حسرت موہانی کی بیباک قیادت نے بنایا۔

اس صدی کے ابتدائی زمانے میں دنیائے اسلام کا انحطاط اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ خلافت عثمانیہ چہار جانب سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی، جو اسے ختم کر دینے کے لئے اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔ خلیفہ جو یورپ کے مرد بیمار کے نام سے مشہور تھا۔ نزع کے عالم میں تھا۔ ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے خلافت عثمانیہ کے زیر حکومت ملک طرابلس پر حملہ کر دیا اور وہاں ظلم وستم کے سارے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ ۱۹۱۲ء میں جزیرہ نما بلقان میں ترکوں کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ اور سوچی سمجھی سازش کے تحت بلقان کی باجگزار عیسائی ریاستوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ محمد علی نے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک وفد ترکی روانہ کیا۔ جنہے وہاں بہت مفید خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد میں نہتے مسلمانوں پر برطانوی حکومت کی وحشیانہ گولی سے سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے۔ ان واقعات نے محمد علی ایسے حساس شخص کو ایک انقلابی لیڈر بنا دیا۔ مچھلی بازار کانپور کی مسجد پر برطانوی حکومت کی وحشیانہ فائرنگ نے اسلامی ہند میں آگ لگا دی۔ محمد علی ایک وفد لے کر برطانیہ گئے، اور وہاں اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ کانپور کی مسجد کے المیہ کے متعلق کسی باعزت سمجھوتہ پر برطانوی حکام کو آمادہ کرنا چاہا۔ لیکن برطانوی سامراج۔ پر طاقت کا ایسا نشہ طاری تھا کہ وہ کوئی معقول بات سننے کو تیار نہ ہوئی۔

جبر و استبداد کے سخت ترین دشمن ہونے کی وجہ سے محمد علی اب برِ صغیر کے ایک عظیم انقلابی لیڈر تسلیم کیے جاتے تھے۔ سید احمد بریلوی کے بعد وہ برِ صغیر میں عوامی تحریک کے عظیم ترین قائد تھے۔ انھوں نے لارڈ ہیسکے کے نام خط میں لکھا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ حکومت ہند نے ان کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے انھیں پانچ سال کے لئے نومبر ۱۹۱۵ء میں نظر بند کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب وہ اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی نظر بندی سے رہا ہوئے تو ہندوستان عوامی تحریکوں اور سیاسی سرگرمیوں سے سورش کدہ بنا ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ کا المیہ ہوا۔ جس میں سینکڑوں ہندو مسلمان سیاسی کارکن برطانوی فوج کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ اس واقعہ نے سارے ہندوستان میں آگ لگا دی۔ اسی زمانے میں محمد علی نے خلافت تحریک شروع کی جس نے کانگریس سے تعاون کیا۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں مثالی ہندو مسلم اتحاد کو جنم دیا۔

جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ اتحادی فتح یاب ہو گئے تھے۔ جرمنی کا حلیف ترکی اب اتحادیوں کے رحم و کرم پر تھا۔ جنھوں نے معاہدہ سردس کے تحت خلافت عثمانیہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا منصوبہ بنایا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کے اتحادیوں کی سازشوں اور سرگرمیوں نے ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے عظیم قائد محمد علی کو بے چین کر دیا تھا۔ انھوں نے ترکی کی دامے۔ درمے سخنے ہر قسم کی امداد کی۔ مسلمان عورتوں نے اپنے زیور ترکوں کی امداد کے لئے نذر کر دیے۔ ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے

تحت برطانوی افواج میں مسلمانوں کی شمولیت کو حرام قرار دیا گیا۔ اس کی بنا پر محمد علی اور ان کے رفقائے کار پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا اور انھیں دو سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ کراچی کے مقدمہ میں محمد علی نے جج کے سامنے جو عالمانہ بیان دیا، وہ قانون کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ خلافت کانفرنس کی قرارداد کو ملک کے گوشہ گوشہ میں منظور کیا گیا۔ تمام اخباروں نے اسے شائع کیا۔ اس کی موافقت میں اداریئے لکھے۔ برطانوی حکومت اپنے خلاف اس عوامی طوفان کو بھلا کیسے روک سکتی تھی۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔

غیر ملکی سامراج کی سختیوں نے محمد علی اور ان کے رفقائے کار کے عزائم کو اور پختہ کر دیا اور ۱۹۲۳ء میں وہ برطانوی حکومت سے بھرپور ٹکر لینے کے عزم کے ساتھ جیل سے رہا ہوئے۔ اسی سال انھیں کوکناڈا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا۔ محمد علی نے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں جو خطبہ دیا وہ اپنے افکار اور زبان کے اعتبار سے اس جماعت کی صد سالہ تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسی سال حکومت کے ساتھ تعاون کی تحریک کے سلسلے میں سینکڑوں مسلمانوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ جب بند نہ ہو سکی تو مولانا محمد علی نے جامعہ ملیہ کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر برصغیر کا عظیم تعلیمی ادارہ بن گیا۔

برطانوی حکومت نے آخر کار جب محسوس کیا کہ جبر و استبداد کے ذریعہ

اس عوامی طوفان کو نہیں روکا جا سکتا ہے تو اس نے اپنی روایتی حکمت عملی سے کام لیا پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس نے کانگریس کے حلقوں میں پھوٹ ڈالنے کی منصوبہ بندی کی۔ ۲۴-۱۹۲۳ء میں اس نے کانگریسی لیڈر مدن موہن مالویہ کو اچانک قید خانہ سے رہا کر دیا۔ انھوں نے برطانوی وائسرائے سے خفیہ ملاقات کی اور سوامی شردھانند کے ساتھ مالوی جی نے شدھی سنگھٹن تحریک شروع کی۔ جس نے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور سارے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔

کانگریس اب ہندو کانگریس بن کر اپنے اصلی خدوخال میں نمایاں ہو چکی تھی۔ محمد علی نے بڑی کوشش کی کہ گاندھی جی شدھی سنگھٹن تحریک اور اس کے علمبرداراں خصوصاً مدن موہن مالویہ کے خلاف کوئی اخباری بیان جاری کر دیں۔ لیکن گاندھی جی اس پر تیار نہیں ہوئے۔ محمد علی اور دیگر کانگریسی مسلمانوں نے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق متعدد کانفرنسیں منعقد کیں۔ لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ نے ہندو کانگریسیوں کے فرقہ وارانہ عزائم کو پوری طرح بے نقاب کر دیا۔ اب کانگریسی مسلمانوں کے لئے اس قومی ادارہ سے کنارہ کشی کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ رہ گیا تھا۔
محمد علی اور ان کے رفقائے کار نے بادلِ ناخواستہ کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کی جسے انھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ جس کے لئے انھوں نے عظیم قربانیاں دی تھیں، اور جسے ایک عوامی اور انقلابی جماعت بنانے کے لئے انھوں نے اپنی لاثانی صلاحیتوں کو وقف کر دیا تھا۔ کانگریس سے کنارہ کشی نے محمد علی کو دل شکستہ

کر دیا۔ وہ پہلے ہی سے ذیابیطس کے موذی مرض میں گرفتار تھے۔ ان کا دل ٹوٹ گیا تھا، وہ صاحب فراش ہو گئے۔

۱۹۳۰ء کی پہلی گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرنے کے لئے وہ لندن مدعو کئے گئے۔ اس وقت وہ صاحب فراش تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں سفر کرنے کی سختی سے ممانعت کی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کا یہ عظیم مجاہد اپنا آخری فریضہ پورا کرنے کے لئے لندن جانا چاہتا ہے۔ اس کے آہنی عزم کے سامنے ڈاکٹروں کی کچھ نہیں چلی اور اسٹریچر پر لاد کر وہ بحری جہاز پر سوار کیا گیا۔

لندن کے قیام کے دوران اس نے اپنے بستر مرگ سے گول میز کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں جو تقریر کی وہ آزادی اور حریت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اس نے کہا:

"میں اپنے ملک میں ایک غلام کی حیثیت سے واپس جانا نہیں چاہتا۔ اگر آپ میرے ملک کو آزادی دینے کو تیار نہیں ہیں تو مجھے قبر کے لئے جگہ دینا ہوگی۔"

خداوند قدوس نے اس کی آرزو پوری کر دی۔ لندن میں ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو وہ اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔ زمین قدس نے اس کے لئے آغوش وا کر دی، اور اس کی آخری آرام گاہ پیغمبروں کے متبرک شہر اور مسلمانوں کے قبلہ اول بیت المقدس میں بنائی گئی۔

سارے عالم اسلام اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس بطل حریت

اور آزادی کے اس دیوانے کا ماتم کیا گیا۔ دوست دشمن سب ہی نے اشکبار آنکھوں اور فگار دل سے اس کو خراجِ تحسین ادا کیا۔

اقبال نے کہا:

"سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گزشت"

نواب بہادر یار جنگ

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۹۴۲ء میں الہ آباد میں منعقد ہو رہا تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح اس کی صدارت کر رہے تھے۔ سارا پنڈال سامعین اور نمائندوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جو ملک کے گوشے گوشے سے اس میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ اسٹیج پر مسلم لیگ کے بڑے بڑے زعماء کے درمیان میں قائدِ اعظم جلوہ افروز تھے۔ قائدِ اعظم نے اپنا ولولہ انگیز خطبۂ صدارت دیا۔ متعدد رہنماؤں نے تقاریر کیں۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ لیکن سامعین جلسہ گاہ چھوڑنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ انھیں کسی مقرر کا انتظار تھا۔ آخر کار وہ شخص اسٹیج پر نمودار ہوا جس کا انھیں شدید انتظار تھا اور جس کی روح پرور اور جان افروز تقریر سننے کے لئے وہ بے قرار تھے۔ ایک لمبا چوڑا وجیہہ انسان، خشخشی داڑھی، ترکی ٹوپی اور شیروانی زیب تن کئے مائیکروفون کے سامنے آیا۔ آہستہ آہستہ مدھم آواز میں اس نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی خطابت کا جادو

سارے مجمع پر چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فصاحت اور خطابت کا ایک دریا رواں ہے، جو سامعین کو اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا ہے۔ اور جس نے سامعین کے قلوب سے وقت کا احساس مٹا دیا ہے۔ گھنٹوں اس کی تقریر جاری رہی لیکن سامعین سحر زدہ انسانوں کی طرح اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ جب اس نے اپنی تقریر ختم کی تو ایسا محسوس ہوا کہ سارا مجمع نیند سے بیدار اور سحر سے آزاد ہو گیا ہے۔ ان کی تقریر سن کر ایسا محسوس ہوتا۔

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہ مسلم لیگ کے سحر بیاں مقرر نواب بہادر یار جنگ تھے۔ جنھیں دیکھنے اور سننے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔

محمد بہادر خاں نام، تاریخ پیدائش ۳ فروری ۱۹۰۵ء، ان کے جد امجد احمد شاہ ابدالی کے زمانے میں افغانستان سے ہندوستان آئے اور ریاست جے پور میں رہائش اختیار کی، بعد ازاں انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول میں حیدر آباد کو مراجعت کر گئے جہاں مرہٹوں کے خلاف عسکری خدمات انجام دینے پر ان کے آبا و اجداد کو جاگیر اور اعزازات عطا کئے گئے۔

محمد بہادر خاں جو بعد ازاں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے مشہور ہوئے، ایک سچے مرد مومن اور عاشق رسول تھے۔ وہ ایک سحر بیاں خطیب ہی نہ تھے بلکہ بذاتِ خود ایک انجمن تھے۔ ایثار اور ہمدردی کا یہ پیکر اپنی شخصیت میں ایک خاندانی نواب کے وقار کے ساتھ ساتھ وہ ایک مرد مومن کی استغنا اور درویشی۔ حلم و مروّت۔ بلند اخلاق اور کردار رکھتا تھا۔ وہ گفتار کے غازی

کے ساتھ کردار کے بھی غازی تھے۔ وہ ایک بڑے جاگیردار ہونے کے باوجود امیرانہ مشاغل سے بیگانہ تھے۔ ان کی دولت عام روساء اور جاگیرداروں کی طرح رقص و سرود اور عیش و عشرت کے بجائے غریبوں اور ناداروں کی دست گیری پر صرف ہوتی تھی۔ ان کی ڈیوڑھی "بیت الامت" جو صحیح معنوں میں مسلمانوں کا گھر تھی، غریب اور امیر پر یکساں کھلی رہتی تھی۔

وہ اقبال کے کلام کے بڑے مداح تھے۔ اور ان کے مرد مومن کی زندہ تفسیر۔ وہ مسلمان نوجوانوں کو بھی اقبال کے مرد مومن اور مشاہیر کا عملی نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ وہ سچے عاشق رسولؐ تھے۔ گفتگو کے دوران جب وہ قرآنِ پاک کی تفسیر بیان کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ قرآن اردو میں نازل ہو رہا ہے۔ ان کی تفسیر فصاحت اور بلاغت کا مجموعہ ہوتی تھی۔

انھیں اقبال سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اپنی تقریروں میں وہ اقبال کے اشعار سے اکثر حوالے دیا کرتے تھے۔ اپنے گھر "بیت الامت" میں وہ ہفتہ وار درس اقبال کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ اس میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اقبال کا مرد مومن اپنے مخصوص انداز میں اقبال کے اشعار کی تفسیر بیان کر رہا ہے۔ اقبال سے ان کی عقیدت نے مسلمان نوجوانوں میں کلام اقبال سے عشق پیدا کر دیا تھا۔

نواب صاحب کی قومی زندگی کا آغاز میلادالنبیؐ کی محفلوں سے ہوا۔ ایک ایسی ہی میلاد کی تقریب میں بہادر خاں تقریر کر رہے تھے۔ سامعین میں نظام حیدرآباد بھی تھے۔ بہادر خاں نے نظام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اے محمدِ عربی کے تخت نشین غلام ۔ آ میں تجھ کو بتاؤں کہ عرب کے ایک بوریہ نشین نے جس کی عظمت و جلال کے آگے قیصر و کسریٰ کا رعب شاہی تھرا اُٹھا تھا۔ سلاطین اور ملوک کے لئے جہاں بانی اور حکمرانی کی کیا کیا مثالیں چھوڑی ہیں"

نظامِ دکن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور سامعین پر سناٹا طاری تھا۔ محفل ختم ہوئی تو نظام خاموشی سے اپنے محل کو روانہ ہو گئے۔ بہادر خاں گھر پہنچے تو چوبدار سلطنت آصفیہ کی تاریخ کا عجیب ترین فرمان لئے کھڑا تھا۔ جس کے تحت محمد بہادر خاں کو "نواب بہادر یار جنگ" کا شاہی خطاب عطا کیا گیا تھا۔

مورخ اسلام اور سیرت النبیؐ کے زندہ جاوید مصنف سید سلیمان ندوی کے قول کے مطابق نواب بہادر یار جنگ کی تقریروں میں فصاحت و بلاغت اور بدائع تینوں جوہر موجود تھے۔ شاعری وہ نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی نثر شاعری کا نمونہ ہوتی تھی"

دہلی مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ مسلم لیگ کے سارے زعماء ڈائس پر جلوہ افروز تھے۔ جلسہ گاہ سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ رات کے بارہ بجے آخری اجلاس ختم ہوا تو قائدِ اعظم نے نواب بہادر یار جنگ کو تقریر کرنے کے لئے کہا۔ آگے بڑھ کر ایک رضا کار نے گھڑی اور گھنٹی میز سے اٹھا دی۔ مطلب یہ تھا کہ اب وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ نواب صاحب کی بارعب اور وجیہہ شخصیت مائیکروفون کے سامنے نمودار ہوئی۔

سامعین نے اللہ اکبر۔ قائدِ اعظم زندہ باد۔ نواب بہادر یار جنگ زندہ باد۔ کے فلک شگاف نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ جس سے سارا پنڈال اُڑا جاتا تھا۔ نواب صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کا آغاز کیا اور قائدِ اعظم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"ساری تعریف اسی خدائے قدیر اور قیوم کو لازم ہے جس کا تختِ عظمت و جلال ہمیشہ آراستہ رہا ہے، اور ہمیشہ آراستہ رہے گا۔ جس کی بارگاہِ ذوالجلال میں انہیں افراد اور قوم نے جگہ پائی ہے جن کا عمل صالح رہا، اور دھتکار دیئے گئے وہ جو کچھ نہ کرکے سب کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

میاں بشیر احمد نے "ایک ساقی ایک مطربہ" کے زیرِ عنوان شاہ پارہ اس تقریر سے متعلق تحریر کیا ہے:

"وقت کا اندازہ اس وقت ہوا جب فجر کی اذان کی صدا بلند ہوئی۔ سامعین کے قلوب میں جذبات کا تلاطم برپا تھا جلسے کی ابتدا میں قائدِ اعظم نے ایک لاکھ روپے چندہ کی اپیل کی تھی۔ لیکن صرف چند ہزار جمع ہوئے تھے۔ نواب بہادر نے جب اپنی تقریر میں یہ الفاظ ادا کئے: "جو مال کا ایثار نہیں کرسکتے وہ جان کیا دیں گے۔" تو سامعین بے تحاشا ڈائس کی جانب دوڑے۔ جس کی جیب میں جو تھا اس نے حوالہ کردیا۔ شمار کیا گیا تو رقم سوا لاکھ سے زیادہ تھی۔ یہ نواب صاحب کی

خطابت کا کمال تھا۔"

نواب بہادر یار جنگ ریاست حیدر آباد کی مقبول ترین شخصیت تھے۔ ہندو مسلمانوں میں وہ یکساں مقبول تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے تھے۔ جا بجا فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے۔ حیدر آباد بھی اس سے محفوظ نہ رہا۔ ایک فرقہ وارانہ فساد میں، ہندوؤں نے نواب صاحب کے سگے بھانجوں کو قتل کر دیا، اور اس مسجد میں جس میں وہ درس قرآن دیا کرتے تھے، سور کا گوشت پھینک دیا۔ اس واقعہ سے سارے حیدر آباد میں آگ لگ گئی اور خطرہ تھا کہ وہاں کے مسلمان دریائے موسی کو ہندوؤں کے خون سے رنگین کر دیں گے۔ نظام دکن کے اختیار سے بات باہر ہو چکی تھی۔ آخر کار انھوں نے نواب صاحب سے درخواست کی کہ: "تم ہی اس سیلاب کو روک سکتے ہو" نواب صاحب جن کا دل صدمہ سے پارہ پارہ تھا مگر ایک اعلیٰ ظرف مومن کی طرح انھوں نے اپنی خطابت کے جادو سے اس سیلاب کو روک دیا۔

نواب بہادر یار جنگ کی زندگی خدمت خلق کے لئے وقف تھی۔ اس شاہین صفت انسان کی زندگی کا ہر لمحہ سکون نا آشنا تھا، جو اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کے لئے صرف کیا جاتا تھا۔ یو۔پی مسلم لیگ کے سابق سکریٹری عبد الوحید خاں صاحب نے اپنے مضمون "حیدر آباد کا ٹیپو" میں نواب بہادر یار جنگ کے متعلق لکھا ہے:

گلستاں میں ہر صبح و شام گل کھلتے ہیں اور مرجھا جاتے ہیں روزانہ

ہزاروں کلیاں چٹکتی ہیں، اور چند روز بہارِ جانفزا دکھلا کر خس و خاشاک بن جاتی ہیں۔ نہ باغباں کو ان کے کھلنے کا علم ہوتا ہے، نہ گلچیں کو اس کی پرواہ۔ لیکن اس چمن کی کسی شاخ سے کبھی کبھی ایسے حیات افزا اور روح پرور پھول بھی پھوٹ نکلتے ہیں جن کی خوشبو سے باغ کا گوشہ گوشہ مہک اٹھتا ہے، اور جن کی رعنائی اور زیبائی کا سکہ ہر روش پر بیٹھ جاتا ہے۔ بہادر یار جنگ ہمارے چمنستان سیاست میں ایسے ہی گل رنگین بن کر نمودار ہوئے جن کی خوشبو سے گلستاں کا گلستاں مہک اٹھا ان کی مختصر سی حیات سیاسی کا ہر لمحہ بیش از بیش سرخی و رعنائی سے ہمکنار ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے ہر گوشہ اور قریہ میں ان کا چرچا ان کی آب و تاب کا شہرہ اور ان کے کمال اور ہنر کا تذکرہ ہونے لگا۔"

نواب بہادر یار جنگ کی تقاریر فصاحت و بلاغت اور خطابت کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں۔ وہ جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو سحر زدہ سامعین کے قلوب سے وقت کا احساس ختم ہو جاتا تھا، اور دل یہی چاہتا کہ وہ بولتے جائیں اور وہ سنتے جائیں اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ مجھے ان کی دو چار تقاریر سننے کا اتفاق ہوا، لیکن ہمیشہ تشنگی باقی رہی۔ بعض ایسی دلکش چیزیں ہوتی ہیں جن سے لطف اندوز ہو کر پیاس بجھتی نہیں، بڑھتی ہے۔ کوئی مسحور کن قدرتی منظر۔ کوئی دل میں اتر جانے والی موسیقی۔ کوئی بیحد پرکشش چہرہ ان سے

بہرہ مند ہونے سے دل کبھی نہیں بھرتا بلکہ خواہش دوبالا ہو جاتی ہے۔ یہی حال نواب صاحب کی جادو بیان خطابت کا تھا۔ جب کبھی وہ جوش میں آتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے، اور اپنے ساتھ جذبات کی رو میں سامعین کو بہائے لئے جا رہا ہے۔ جب کبھی وہ غم والم کا نقشہ کھینچتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ سامعین کے دل پھٹے پڑ رہے ہیں اور سینے سے نکل جائیں گے۔ آنکھوں سے سیلاب اشک رواں ہو جاتا اور لب سے آہ آہ کی صدا۔

ایک تقریر میں انھوں نے فرمایا:

"دوستو! دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ کثرت تعداد میں نہیں بلکہ قلت اور تنظیم میں قوموں کی فتح مندی کا راز پوشیدہ ہے۔ دنیا کے کسی فاتح کا نام نہ دے سکو گے جس نے اپنی مفتوح قوم کے مقابلے میں اس کی تعداد سے زیادہ فوج لے کر چڑھائی کی ہو۔ مصر کے قبطی عمرو بن عاص کے دس ہزار ساتھیوں سے سوگنا زیادہ تھے اور ہندوستان کے ہندو محمد بن قاسم کے مٹھی بھر نبرد آزماؤں سے ہزار گنا بڑھ کر۔ اصل چیز کثرت ایمان اور قوت تنظیم ہے۔ اگر تمھارے بعض ساتھی اس میدانِ عمل و ابتلا میں ثابت قدم نہ رہ سکے اور ہٹ گئے تو فکر مت کرو۔ دنیا میں آئے دن یہی ہوتا رہتا ہے۔ آسمان سے لاکھوں قطرے برستے ہیں۔ لیکن ان میں سے ہر ایک

اس قابل نہیں کہ وہ کوہ نور کی طرح زینت تاج بنے۔ امتحان عمل میں آنے کے بعد صرف خالص سونا ہی نکل سکتا ہے میل کچیل ہمیشہ سونے کے ساتھ داخل تو ہوتے ہیں۔ لیکن تاب سوختن و تپیدن نہیں لا سکتے۔ اور فنا ہو جاتے ہیں۔"

ایک دوسری تقریر میں فرماتے ہیں:

"دوستو! دنیا کے کسی فرد نے تکلیف کے بغیر آرام کی صورت دیکھی نہ کسی قوم نے جس کو تلاش راحت ہے اس کو مبتلائے مصائب ہونا چاہیئے۔ ہمارا عہد حاضر کا شاعر کہتا ہے:

آ تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

جن قوموں نے اس راز حیات اور سر زندگی کو پہچانا، ان کی رفعت و مرتبت کو پہچاننا دنیا والوں کے لئے مشکل ہو گیا جن امتوں نے عالم ذلت اور رسوائی میں بھی شمشیر و سناں سے بیگانہ ہو کر چنگ و رباب سے دوستی کی وہ دنیا میں کسی کے لئے قابل رشک نہیں رہیں۔ کیا تم کو ان راتوں کی یاد دلانے کی ضرورت ہے جبکہ دو جہاں کے سردار، صاحب لولاک، خاتم النبیین اور رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنی راتیں گھوڑوں کی ننگی کاٹھیوں پر بسر کرتے تھے اور راتوں کو جاگتے تھے، آپ کے قدم مبارک متورم ہو جاتے

تھے۔ کیا تم نے تاریخ کے ان ایام پر نظر نہیں ڈالی جبکہ فاروق اعظم
میدانِ جنگ میں آنے والے نامہ بر کی تلاش میں مدینہ سے میلوں
دور جایا کرتے تھے۔ کیا تم نے ان دنوں کو بھلا دیا جبکہ دنیا سے
امیر و غریب، چھوٹے بڑے، عرب و عجم کا فرق مٹانے والا کفر و
ایمان کے درمیان ایک خندق کے ذریعے حد فاصل کھینچ رہا
تھا اور اس کے شکم اطہر پر پتھر بندھے ہوئے تھے۔"

نواب بہادر یار جنگ کی سیاسی زندگی بہت مختصر تھی وہ ایک آفتاب کے
مانند تھے جو دکن کی افق پر نمودار ہوا اور بلند ہوتا گیا۔ آخر کار اس نے سارے
برصغیر کو منور کر دیا، اور جلد ہی غروب ہو گیا۔ اتحاد المسلمین اور کل ہند مسلم لیگ میں
انھوں نے بہت شاندار کردار ادا کیا ہے۔ مسلم لیگ کو ایک عوامی اور مقبول
عام جماعت بنانے میں نواب صاحب کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ریاستی مسلم لیگ کے
صدر۔ قائدِ اعظم کے خصوصی معتمد اور مسلم لیگ کے عظیم خطیب اور مبلغ تھے۔
۲۵ جون ۱۹۴۴ء کو جسٹس ہاشم خاں کے یہاں ایک عشائیہ میں شریک ہوئے
کھانے کے بعد حقے کا پہلا کش لیتے ہی ان کی روح پرواز کر گئی، اور اسلامی ہند
کا یہ خوش بیان مقرر اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مولانا شوکت علی

قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ میں الٰہ آباد یونیورسٹی کا طالبعلم تھا اور مسلم بورڈنگ ہاؤس میں رہائش پذیر تھا۔ ہم لوگ بورڈنگ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ ایک بھاری بھرکم دیوقامت شخص ہال میں داخل ہوا۔ جس سے سب ہی طلبار واقف تھے۔ ان کی بے شمار تصاویر ہم لوگوں نے دیکھی تھیں اور ان کے کارناموں سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف تھا۔ طلبار انھیں دیکھتے ہی ادب سے کھڑے ہو گئے۔ یہ مولانا شوکت علی تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات میں مرکزی اسمبلی میں وسطی یوپی کی شہری مسلم نشست کے لئے امیدوار تھے۔ مولانا نے ہال میں داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہا۔ اور میرے قریب بیٹھے ہوئے دُبلے پتلے میرے ایک ہم جماعت کی پلیٹ میں گوشت کی ایک بوٹی دیکھ کر کہنے لگے "اتنا ذرا سا کھاتے ہو جب ہی تو تمھارے بدن پر گوشت نہیں چڑھتا۔

خوب کھائیے" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ ہم لوگوں نے اپنا کھانا چھوڑ کر مولانا شوکت علی کو گھیر لیا۔ انھوں نے ہم لوگوں سے بہت مفید اور دلچسپ گفتگو کی۔ نصیحتیں بھی کیں، اور فضیحتیں بھی۔ چلتے وقت اتنا کہہ گئے کہ انتخابات ایک قومی فریضہ ہیں اس میں ووٹ بہت سوچ سمجھ کر دینا چاہیئے۔

مولانا شوکت علی بڑی بھاری بھرکم اور دیو قامت شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا وزن پانچ من کے لگ بھگ تھا۔ ان کا مقولہ تھا کہ وہ گاندھی جی کو اپنی ایک جیب میں رکھ سکتے ہیں۔

وہ بغیر اسٹاپ کے بولتے تھے۔ الفاظ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے تھے کہ بعض وقت سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بدن دوگنا تین گنا نہیں بلکہ چار گنا تھا۔ وہ بڑے وجیہہ انسان تھے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ علی گڑھ محمڈن اینگلو کالج سے فارغ التحصیل ہو کر ایک بڑے سرکاری عہدہ پر فائز ہوئے تو اپنی شاندار زندگی اور شان و شوکت کے لئے مشہور تھے۔ قیمتی سگار اور عمدہ سلک کی قمیص ان کی پسندیدہ اشیاء تھیں۔ جہاں کہیں جاتے، کلب کی زندگی کے وہ روح رواں ہوتے۔ لیکن جب سرکاری ملازمت کو طلاق دے کر کانگریس اور خلافت میں شامل ہوئے تو ایسے بدلے کہ پھر زندگی بھر کھدر کے علاوہ کسی دوسرے کپڑے کو استعمال نہیں کیا۔ زندگی کے سارے سرد و گرم برداشت کئے لیکن ان کے پایۂ ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔

شوکت علی ۱۸۷۳ء میں رام پور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔

بچپن ہی سے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، ان کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری ان کی عظیم والدہ بی اماں پر پڑی جنھوں نے اسے بحسن وخوبی سرانجام دیا۔ شوکت علی اور ان کے بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ شوکت علی محمڈن اینگلو کالج علی گڑھ میں داخل ہوگئے جہاں وہ طلباء میں بہت ہر دلعزیز اور کرکٹ کے کپتان تھے۔ ان کے زمانے میں کالج کی کرکٹ ٹیم سارے ہندوستان میں سب سے اچھی ٹیم تسلیم کی گئی۔ آج بھی ان کی ایک زبردست ہٹ کی تختی یونیورسٹی کی مسجد کے مینارے پر لگی ہے جو اس کی یاد دلاتی ہے۔

علی گڑھ محمڈن اینگلو کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ افیون کے محکمہ میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس دوران میں ان کے چھوٹے بھائی محمد علی الہ آباد یونیورسٹی کے بی اے کے امتحان میں اول آئے۔ شوکت علی نے اپنے چھوٹے بھائی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل کرایا اور اپنی تنخواہ سے ان کے اخراجات پورے کئے۔

شوکت علی بڑے دلیر اور باہمت انسان تھے۔ مایوسی کا لفظ ان کی لغت میں پایا نہیں جاتا تھا۔ ان کے عظیم برادر خورد محمد علی نے ان کے متعلق ایک بار کہا تھا:

"جب ہم ناامید ہو جاتے اور مایوسی کا ہم پر غلبہ ہو جاتا تو ہمارے بڑے بھائی ہمارے لئے امید کی کرن ثابت ہوتے اور صحیح سمت میں ہماری رہبری کرتے۔ وہ تھکنا نہیں جانتے، ان کی لغت میں مایوسی کا لفظ مفقود ہے۔ اپنے دیو ہیکل جثہ اور چار پانچ من وزن کی

وجہ سے وہ ایسے پہاڑ کے مانند نظر آتے ہیں جو حرکت میں ہو۔"

۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد برطانیہ کی مسلم کش پالیسی زیادہ نمایاں ہوگئی۔ بین الاقوامی سیاست میں بھی حکومت برطانیہ کی پالیسی مسلمانوں کے خلافت عثمانیہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی سازش کر رہی تھی اور یورپ کی عیسائی حکومتوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت اور برد آزمائی پر اکسا رہی تھی۔ جنگِ عظیم اول اور اس کے بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ برطانیہ خلافتِ عثمانیہ اور اسلامی مرکزیت کا سب سے بڑا دشمن ہے، اور وہ اس کو ختم کر کے مشرقِ وسطیٰ میں اپنی اور دیگر عیسائی ممالک کی چودھراہٹ قائم کرنا چاہتا تھا۔ فلسطین میں یہودیوں کی مملکت کی تجویز برطانیہ کی اس مسلم کش حکمتِ عملی کا شاخسانہ تھی۔

محمد علی نے اپنی اعلیٰ ملازمت سے استعفیٰ دے کر جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ" جاری کیا جو سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں یکساں مقبول تھا۔ شوکت علی نے بھی ۱۹۱۲ء میں اپنی اعلیٰ سرکاری ملازمت کی آسائشوں کو طلاق دے کر قید و بند اور مصائب کی زندگی کو ترجیح دی۔ محمد علی نے ایک بار اس تبدیلی کی بابت لکھا تھا:

"ان کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ ایک اعلیٰ سرکاری افسر کے یورپین لباس کو ترک کر کے انھوں نے ایک غریب بمبئی والے کا لباس زیبِ تن کر لیا۔"

شوکت علی اور ان کے چھوٹے بھائی محمد علی نے ہندوستانی عوام اور خصوصاً

مسلم عوام کو بیدار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے انجمن خدامِ کعبہ جماعت کی بنیاد ڈالی جو مسلمانانِ عالم کی خدمت کے لئے عالمِ وجود میں آئی تھی۔ ان کی فعال قیادت برطانوی سامراج کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن کر ابھری۔ کانگریس میں ان کی شمولیت نے اس حکام پرست جماعت کو ایک فعال انقلابی جماعت بنادیا، اور گاندھی جی کو برصغیر کے عظیم لیڈر کی حیثیت سے روشناس کرانے اور مقبول بنانے میں علی برادران کا ہاتھ رہا ہے۔ علی برادران نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ہاتھ پر بیعت کی اور انھیں اپنا روحانی مرشد تسلیم کیا۔

جنگِ عظیم اول کے دوران محمد علی کے اخبار کامریڈ" کو حکومتِ ہند نے بند کردیا تو علی برادران کو نظر بند کردیا گیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب وہ نظر بندی سے رہا ہوئے تو امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہوا جس میں جنرل ڈائر کے بندوقچیوں نے ہزاروں ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ برطانوی سامراج کے اس ظلم وستم نے سارے ملک میں آگ لگادی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت شوکت علی نے کی۔

جنگِ عظیم اول کے بعد اتحادیوں نے یورپ کے مردِ بیمار عثمانی خلیفہ کی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے ختم کردینے کی سازش کی تھی۔ علی برادران نے اس کے خلاف ہندوستان میں خلافت تحریک کا آغاز کیا۔ انھوں نے سارے ملک کا طوفانی دورہ کیا، جس کی وجہ سے برصغیر کے طول وعرض میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔ محمد علی نے اپنے شہرۂ آفاق روزنامے 'ہمدرد' میں ایک بار لکھا تھا:

"فرانس کے شہنشاہ لوئیس چہار دہم نے کہا تھا کہ میں مملکت ہوں شوکت اس سے زیادہ استحقاق سے کہ سکتے ہیں کہ میں خلافت تحریک ہوں۔"

علی برادران کو دیگر رہنماؤں کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں گرفتار کر لیا گیا اور کراچی میں ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا۔ شوکت صاحب نے کراچی کی عدالت کو بتادیا:

"جب تک آپ کی حکومت، ترکوں کے ساتھ انصاف نہیں کرے گی اور پنجاب میں ہونے والی غلطیوں کا ازالہ نہیں کرے گی اور ہمیں آزادی نہیں دے گی، ہم اس کے خلاف وہ سارے حربے استعمال کریں گے جو ہم کر سکتے ہیں، اور انشاءاللہ اسے اپنی سرزمین سے نکال باہر کریں گے۔"

علی برادران کو دو سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ قید فرنگ سے آزاد ہوئے تو آزادی ہند کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور ہندو مسلمانوں کے بے مثل اتحاد سے برطانوی سامراج کو سخت خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند کے ذریعے شدھی سنگھٹن تحریک کا آغاز کرایا۔ جس سے جا بجا سارے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ علی برادران نے سخت کوشش کی کہ برصغیر کو فرقہ وارانہ جذبات سے پاک کر کے قومی یک جہتی اور اتحاد پیدا کیا جائے جو غیر ملکی سامراج کو ملک بدر

کرنے کے لئے لازمی تھا۔ لیکن گاندھی جی اور دیگر ہندو لیڈروں کی سرد مہری نے اس اتحاد کو دوبارہ حاصل کرنے کے مواقع نہیں فراہم کیے۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ نے اس اتحاد کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور علی برادران مولانا حسرت موہانی اور دیگر قومی لیڈروں کو کانگریس سے بدظن کر دیا اور اس ادارے سے کنارہ کشی کرنے پر مجبور کیا جسے انھوں نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ اس رپورٹ میں سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنانے سے متعلق مسلمانوں کے متفقہ مطالبے کو بھی منظور نہیں کیا گیا تھا۔

اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے اگست ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی گئی۔ محمد علی اس زمانے میں بغرضِ علاج یورپ گئے ہوئے تھے اس کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری کر رہے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر انصاری، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر عالم سب ہی اس رپورٹ کو تسلیم کرنے کے حق میں تھے۔ بڑے لیڈروں میں شوکت علی اور حسرت موہانی اس رپورٹ کے مخالفین میں تھے۔ ڈاکٹر عالم نے پنجاب کی جانب سے اس رپورٹ کی حمایت کی۔ اب شوکت علی کی باری تھی۔ سبھاش چندر بوس اور سین گپتا نے مولانا شوکت علی پر بہت دباؤ ڈالا کہ وہ اس رپورٹ کی مخالفت نہ کریں۔ جس کا انھوں نے ترش روئی سے جواب دیا: "میں ہندی مسلمانوں کے حقوق کا سودا نہیں کر سکتا۔"

ان کی دیو قامت شخصیت تقریر کرنے کے لئے جب اسٹیج پر نمودار ہوئی تو سارا پنڈال پرزور تالیوں سے گونج اٹھا۔ انھوں نے کہا:

"جب تک سرحد اور سندھ کو علیحدہ صوبہ نہیں بنایا جاتا اور جب تک پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو تسلیم نہیں کیا جاتا، میں اس رپورٹ کو تسلیم نہیں کروں گا۔"

اس پر ڈاکٹر عالم بول اٹھے: "مولانا لیکن پنجاب نے تو اس رپورٹ کو پہلے ہی تسلیم کر لیا ہے۔"

مولانا شوکت علی نے اس پر جواب دیا:

"آپ کوئی پنجاب نہیں ہیں۔ آپ کو پنجاب کے مسلمانوں کے حقوق کا سودا کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ پنجاب کا دورہ کریں اور دیکھیں کہ وہاں کے مسلمان آپ کی بات سنتے ہیں، یا میری۔"

شوکت علی نے نہرو رپورٹ کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے ملک کا طوفانی دورہ کیا۔ اس رپورٹ کے بعد علی برادران اور مسلمانوں کے متعدد مقتدر لیڈروں نے کانگریس سے ہمیشہ کے لئے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ جس نے اس قومی جماعت کو ہندوؤں کی ایک فرقہ وارانہ جماعت میں تبدیل کر دیا، اور اسے ہندی مسلمانوں کے اعتماد سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔

جنوری ۱۹۳۱ء میں ان کے عظیم بھائی کی وفات سے ان کا دایاں بازو ٹوٹ گیا۔ انھوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی، اور محمد علی جناح کو اپنا قائد تسلیم کر لیا۔ ۱۹۳۵ء میں مسلم عوام محمد علی جناح سے روشناس نہ تھے۔ مسلم لیگ میں مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی

کی شمولیت نے اسے مسلم عوام کی مقبول ترین جماعت بنا دیا۔ کانگریس کے اس دعوی کو کہ مسلم لیگ نوابوں کی ٹوڈیوں کی جماعت ہے، مولانا شوکت علی اور حسرت موہانی کی شمولیت نے غلط ثابت کر دیا اور اسے مسلم عوام میں مقبول بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو کانگریس میں شامل کرنے کے لئے مسلم عوام سے رابطہ تحریک شروع کی تھی جو بری طرح ناکام رہی اور یو پی کی متعدد مسلم نشستوں کے ضمنی انتخابات میں کانگریس کو شکست فاش ہوئی۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں جھانسی بندھیلکنڈ کی مسلم نشست میں کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس انتخاب میں مولانا شوکت علی نے تنہا انتخابی مہم میں کانگریسی علماء کے پروپیگنڈے کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح مولانا کی مقناطیسی شخصیت نے مراد آباد۔ سہارن پور، اور بلند شہر کے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کو کامیاب کرایا۔ مولانا شوکت علی جب ہزارہ کے الیکشن سے واپس ہوئے تو ۲۷ر نومبر ۱۹۳۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ سارا دہلی اپنے عظیم قائد کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے لئے امڈ آیا تھا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح جو ان کے جنازہ میں شریک تھے جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر دو گھنٹہ کھڑے رہے۔ مولانا شوکت علی کو سرمد شہید کے پہلو میں جامع مسجد کے سایہ تلے دفن کیا گیا۔ جنازہ میں شریک ہونے والوں کے قول کے مطابق "کسی مرنے والے کا اتنا شگفتہ چہرہ انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔" قائدِ اعظم نے مرحوم لیڈر کو خراجِ تحسین ادا کرنے

ہوئے کہا:

"مولانا شوکت علی ایک عظیم انسان تھے۔ ایک ایسے شخص جو اپنے نصب العین کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ میرے ساتھی اور ذاتی دوست تھے۔ جادہ حق سے ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنے آخری دم تک مسلم لیگ کی بڑے خلوص اور جوش و خروش کے ساتھ خدمت کی۔"

مولانا شبیر احمد عثمانی

بیسویں صدی عیسوی میں اسلامی ہند نے جن عظیم علماء کو جنم دیا ہے۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا مقام کافی بلند ہے۔ ان عظیم علماء میں مولانا اشرف علی تھانوی۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مفتی کفایت اللہ۔ سید سلیمان ندوی۔ مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحبان خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

دراز قد۔ درمیانی جسم۔ شرعی داڑھی، اور گندمی رنگ رکھنے والے مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے زمانہ کے شہرہ آفاق محدث اور مفسر قرآن، نیز بلند پایہ مقرر اور استاد تھے۔

شبیر احمد عثمانی جو خلیفہ سوم حضرت عثمان بن عفان کی اولاد میں تھے ۱۰ محرم ۱۳۰۵ھ ہجری مطابق ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا فضل الرحمٰن نے ان کی ابتدائی تعلیم اور تربیت گھر پر کی۔ شبیر احمد عثمانی نے اپنی تعلیم کی تکمیل

ہندوستان کے مشہور اسلامی تعلیمی ادارے دار العلوم دیوبند میں کی۔ جہاں ان کے وہ بڑے بھائی مفتی عزیز الرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن اس مدرسے میں اہم مناصب پر فائز تھے۔

شبیر احمد عثمانی ۱۹۰۸ء میں دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے یہاں انھوں نے اردو، فارسی، عربی کے علاوہ قرآن۔ حدیث۔ تاریخ اسلام اور اسلامی فقہ میں اعلیٰ ترین قابلیت اور مہارت حاصل کی۔

انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز مسجد فتحپوری کے مدرسہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے کی۔ بعد ازاں وہ ضلع سورت کے جامع ڈابھیل میں تفسیر اور حدیث کے معلم مقرر ہوئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں دار العلوم دیوبند کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔

مولانا ایک بلند پایہ مفسر قرآن تھے۔ انھوں نے اپنے استاد شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اسیر مالٹا کے اردو ترجمہ قرآن پر جو تفسیر لکھی ہے وہ بہت عالمانہ اور محققانہ ہے۔ اردو زبان میں قرآن پاک کی ایسی شاذ و نادر ہی کوئی تفسیر لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے صحیح مسلم کی بھی تفسیر لکھی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے مشورہ پر شبیر احمد عثمانی نے علم الکلام سے متعلق "العقل والنقل" نامی کتاب لکھی۔ ان کی دیگر تصانیف اعجاز القرآن۔ الشہاب۔ معارف القرآن اور لطائف حدیث ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی ایک عالم باعمل تھے۔ انھوں نے جنگ بلقان میں ترکی کے ہلال احمر کے لئے چندہ جمع کیا۔ ہندوستان میں وہ خلافت تحریک کے

پرزور مبلغ تھے۔ علمائے دیوبند نے قومی آزادی کی تحریکوں میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ کانگریس اور خلافت کی قومی تحریکوں میں وہ پیش پیش تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو برطانوی ہند کی تحریک کی بنا پر شریف مکہ کی حکومت نے مکہ معظمہ میں گرفتار کر لیا۔ شریف مکہ جو حکومت برطانیہ کا آوردہ اور آلہ کار تھا، انگریزوں کے اشارہ پر ناچتا تھا۔ شیخ الہند کو پانچ سال کے لئے مالٹا کے جزیرے میں نظر بند کر دیا گیا۔

اس نظر بندی کے دوران مولانا شبیر احمد عثمانی نے رائے عامہ کو برطانوی حکومت کی اس حرکت کے خلاف بیدار کرنے کے لئے سارے ملک کا دورہ کیا۔ ان کی موثر تقریروں نے حکومت کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں میں آزادی کی لہر دوڑا دی۔ ۱۹۲۰ء میں جب شیخ الہند مالٹا کی نظر بندیوں سے رہا ہوئے تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کے ساتھ سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب جمعیۃ العلمائے ہند قائم ہوئی تو شبیر احمد عثمانی اس کی مجلس عمل کے رکن منتخب ہوئے۔ مولانا عثمانی کی ولولہ انگیز تقریروں نے جمعیۃ العلماء کو مسلم عوام سے روشناس کرانے اور ان میں مقبول بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

آخر کار پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند کی شدھی سنگھٹن تحریک نے ہندو مسلمانوں کے بے مثل اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا اور دوسرے ہندو لیڈروں کی خاموشی نے مسلمانوں کو کانگریس سے بدظن کر دیا، اور نہرو رپورٹ کے بعد تو ہندو کانگریس اپنے اصلی رنگ و روپ میں ظاہر ہوگئی۔ اس نے

علی برادران اور دوسرے مسلمان قوم پرست قائدین کو آخر کار کانگریس سے مایوس کر دیا اور اس سے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا، جس کو ایک فعال اور مقبول جماعت بنانے میں انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو وقف کر دیا تھا اور اپنی زندگی کے آرام و سکون کو اس کے لئے قربان کر دیا تھا۔

گول میز کانفرنس اور حکومت ہند ایکٹ ۱۹۳۵ء کے سلسلے میں جب ہندی مسلمانوں نے اپنی علیحدہ تنظیم کی ضرورت محسوس کی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح کی زیر قیادت جب مسلم لیگ کا احیاء کیا گیا تو مسلم قائدین بڑی تعداد میں قائدِ اعظم کے شریک کار ہوئے۔ ان میں مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ڈاکٹر محمد اقبال۔ نواب اسماعیل خاں۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ راجہ محمود آباد۔ نواب بہادر یار جنگ۔ سردار عبدالرب نشتر اور حسین شہید سہروردی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی علماء کی ایک جماعت بھی مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئی۔ کانگریس اور قوم پرست مسلمانوں کا مسلم لیگ پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ عوامی جماعت نہیں ہے، بلکہ نوابوں۔ راجاؤں۔ ٹوڈیوں اور مفاد پرستوں کی جماعت ہے۔ اس لئے اس سے جمہوری اسلامی حکومت کے قیام کی امید عبث ہے۔ ان کا یہ اعتراض بڑی حد تک درست تھا، لیکن مسلم لیگ میں مولانا حسرت موہانی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی شمولیت نے اس کو مسلم عوام میں بے حد مقبول بنا دیا اور صحیح معنوں میں یہ ہندوستانی مسلمانوں کی عوامی جماعت بن گئی۔

جمعیتہ العلمائے ہند کے زیادہ تر ارکان قوم پرست مسلمانوں اور انڈین کانگریس کے شریک کار رہے۔ ان کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی اور ان کے ساتھ مولانا احمد سعید۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور کسی حد تک مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ موخرالذکر انڈین کانگریس کے اس زمانے میں صدر بھی تھے۔ ان کے برخلاف مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھی مسلم لیگ کے شریک کار تھے۔ انھوں نے جمعیتہ العلمائے ہند کی جماعت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں جب پاکستان کی قرارداد لاہور میں منظور کی گئی تو مولانا حسین احمد مدنی کی سرگردگی میں جمعیتہ العلمائے ہند نے اس کی مخالفت کی اور متحدہ ہندوستان کی پرجوش حمایت کی۔ لیکن ہندو کانگریس اب پوری طور پر بے نقاب ہو چکی تھی، اور اسی لئے جمعیتہ العلمائے ہند اور قوم پرست مسلمانوں کی ساکھ مسلم عوام سے اکھڑ چکی تھی۔ اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کی نمایاں کامیابی نے اس کی مقبولیت اور قوم پرست مسلمانوں کی غیر مقبولیت کا پردہ پوری طور سے چاک کر دیا۔

مسلم لیگ کی اس بے مثال کامیابی میں ہندو کانگریس کی مسلم کش پالیسی قائدِ اعظم کی ماہرانہ قیادت نیز مولانا حسرت موہانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی ولولہ انگیز اور پرخلوص کوششوں کو بڑا دخل تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے ۱۹۴۵ء میں کلکتہ میں جمعیتہ العلمائے اسلام کی بنا ڈالی۔ جس کے وہ خود صدر تھے۔ اس جماعت میں مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی ایسے پرجوش مبلغین ان کے ساتھ تھے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی نے ۱۹۴۷ء میں صوبہ سرحد کی رائے شماری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اور یہ انھیں کی پرجوش تقریروں کا نتیجہ تھا جس نے کانگریس اور خدائی خدمت گار کے اس گڑھ میں مسلم لیگ کا جھنڈا گاڑ دیا اور یہاں کے مسلم عوام کو پاکستان اور مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ کر دیا۔

پاکستان میں مولانا عثمانی کا ایک عظیم کارنامہ پاکستان کی مجلس دستور ساز میں ۱۹۴۹ء میں قرار داد مقاصد کی منظوری سے متعلق ہے۔ جس کی تیاری میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی سال کراچی میں منعقد ہونے والی موتمر عالم اسلامی کی کانفرنس میں مولانا کی ولولہ انگیز اور مدلل تقریر عرصہ تک یاد کی جائے گی۔

قیام پاکستان سے قبل مولانا شبیر احمد عثمانی سے مجھے کئی بار نیاز حاصل ہو چکا تھا۔ متعدد عوامی جلسوں میں ان کی موثر اور پرخلوص تقاریر سن کر میں بہت متاثر ہوا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی میرے ضلع فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ لیکن اسی ضلع میں مسلم لیگی امیدوار کو انتخاب میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ مولانا حسین احمد مدنی مسلم لیگ اور پاکستان کی مخالفت کی وجہ سے اپنے ہی ضلع کے مسلمانوں میں بہت غیر مقبول ہو گئے تھے۔ مولانا عثمانی اس کے برخلاف مسلم عوام میں ہر جگہ بہت مقبول تھے، اور عوام ان کی ولولہ انگیز اور موثر تقریروں سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

ہندوستان میں میں جی، آئی، پی ریلوے میں ملازم تھا۔ قائدِ اعظم کے ارشاد کے مطابق وہاں سے میں نے اپنی ملازمت پاکستان میں منتقل کرالی۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں جب میں بحری جہاز کے ذریعے بمبئی سے کراچی پہنچا تو مولانا

شبیر احمد عثمانی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولانا جیکب لائن میں اے۔ایم قریشی کے ایک بوسیدہ بنگلے کے ایک کمرے میں صاحب فراش تھے۔ قائدِ اعظم مولانا شبیر احمد عثمانی کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد وہ برابر علیل رہے۔ پاکستان کے دیگر صاحب اقتدار افراد بڑی بڑی کوٹھیوں میں براجمان تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ایسے پاکستان کے حقیقی معماروں کی جانب توجہ کرنے کی کسی کو فرصت اور ضرورت نہیں تھی۔ مطلب نکل چکا تھا پھر نظریں پھیر لینے میں کیا مضائقہ تھا۔ بے چارے قریشی نے انھیں اپنے مکان میں جگہ دی اور ہر طرح سے ان کی تواضع کی۔ جس کے لئے وہ باقیماندہ زندگی میں قریشی کے شکر گزار رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اے ایم قریشی نے تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کراچی میں فروغ تعلیم کے لئے جو نمایاں کردار ادا کیا ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے۔

مولانا اس زمانے میں علیل تھے، اور پاکستان کی جانب سے وہ کافی مایوس تھے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں کے صاحب اقتدار افراد نے اونچی کرسیوں پر براجمان ہونے کے بعد اپنے پر پرزے نکالنے شروع کر دئے تھے۔ اور وہ تمام وعدے اور نظریات جن کو بروئے کار لانے کے لئے پاکستان عالمِ وجود میں آیا تھا، اب سرد مہریوں اور عدم توجہی کا شکار ہو رہے تھے۔ پاکستان کی اس صورت حال نے مولانا کو بڑا دکھ پہنچایا تھا، اور وہ پاکستان کے صاحبِ اقتدار افراد سے بہت شاکی تھے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام انھیں سراب نظر آنے لگا تھا۔ ان کی گفتگو سے مایوسی ٹپکتی تھی۔ اور انھیں یہ

احساس ہو چلا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام کا خواب دکھا کر ہندوستانی مسلمانوں سے دھوکہ اور فریب کیا گیا ہے۔

مولانا کو پاکستان کے صاحب اقتدار افراد کا بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا۔ میں ریلوے کا ملازم تھا۔ میں کراچی میں رہنا چاہتا تھا۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ اس سلسلے میں وہ میری سفارش کر دیں۔ میں نے کہا "بھلا آپ کی بات کو پاکستان میں کون ٹال سکتا ہے" کہنے لگے "میاں تم ابھی پاکستان سے واقف نہیں ہو۔ یہاں اب میری کوئی نہیں سنتا۔ ایک نشتر ہیں، کہو تو ان کو لکھ دوں، وہ ان سب میں بہتر اور پُر خلوص آدمی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "وہی تو ریلوے کے وزیر ہیں۔" مولانا نے نشتر صاحب کو ایک تعارفی خط لکھ دیا۔

مولانا زیادہ عرصہ تک پاکستان میں زندہ نہیں رہے۔ قائد اعظم کی طرح جلد ہی وہ اس ملک سے سدھار گئے۔ اور اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ اچھا ہی ہوا ورنہ اس ملک خداداد میں معلوم نہیں کیسے دن دیکھنے پڑتے، بہاولپور کے شہر بغداد الجدید میں ایک اسلامی مدرسہ کا افتتاح کرنے وہ تشریف لے گئے تھے جہاں ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ کراچی میں اے ایم قریشی کے اسلامیہ کالج کے احاطہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ بعد ازاں انھیں کے پہلو میں مورخ اسلام علامہ سلیمان ندوی کو بھی جگہ ملی۔

نواب اِسمٰعیل خاں

غیر منقسم ہند کی مسلم لیگ میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد سب سے زیادہ سر برآوردہ باوقار اور ہر دلعزیز شخصیت نواب اسمٰعیل خاں کی تھی۔ قائدِ اعظم بھی جن کی بڑی عزت کیا کرتے تھے اور انھیں ہمیشہ نواب صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ قائدِ اعظم کو نواب صاحب پر اتنا اعتماد تھا کہ مسلم لیگ میں متعدد اہم مناصب ان کے حوالے کر رکھے تھے۔

نواب صاحب مسلم لیگ مجلس عمل اور راست اقدام کمیٹی اور مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے صدر تھے۔ موصوف یوپی کی صوبائی مسلم لیگ کے بھی صدر تھے۔ جو قیامِ پاکستان سے قبل برِصغیر کی ساری صوبائی مسلم لیگی جماعتوں میں سب سے زیادہ فعال جماعت تھی اور جس نے قیامِ پاکستان میں سب سے زیادہ نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ درحقیقت پاکستان کی جنگ یوپی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں لڑی گئی تھی، اور اسی جنگ میں یوپی کے مسلمانوں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا

تھا۔ اس لئے کانگریس اور پنڈت جواہر لال کے مشہور انگریزی روزنامے نیشنل ہیرالڈ نے اپنے اداریہ میں ایک بار لکھا تھا کہ: "یو، پی کے مسلمانوں نے مسٹر جناح کے لئے پاکستان بنایا۔"

نواب اسمٰعیل خاں خاندانی نواب تھے۔ لیکن درحقیقت وہ ایک عوامی آدمی تھے اور نوابوں کی خُوبو ان میں نہیں پائی جاتی تھی۔ ان کے خاندان نے برصغیر کی جدوجہد آزادی اور اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے دادا نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر، غالب کے ہمعصر اور دوست تھے۔ ان کے والد نواب محمد اسحٰق خاں ایم اے او، کالج علی گڑھ کے جو بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا سیکریٹری تھے، اور اسلامی ہند کی اس عظیم درسگاہ کی تعمیر اور ترقی میں انھوں نے شاندار کارنامے سرانجام دیئے۔

نواب اسمٰعیل خاں کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ میں تحصیل علم کیا اور بعد ازاں بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے بڑے گھرانوں میں مغربی لباس اور ثقافت کو بڑی تیزی سے اپنایا جا رہا تھا، اور کوئی ہندوستانی مسلمان انگلستان کی ہوا کھا لیتا تھا تو وہ اپنے آپ کو ایک برتر مخلوق سمجھتا تھا، اور ہندوستانی کہلانے کے بجائے کالا صاحب کہلانا زیادہ پسند کرتا تھا۔

نواب اسمٰعیل خاں صاحب کے گھرانے میں مشرقیت کا دور دورہ تھا۔

اگرچہ وہ انگلستان سے فارغ التحصیل ہوکر آئے تھے لیکن نہ تو انھوں نے مغربی لباس اختیار کیا تھا، نہ مغربی تہذیب، اور طور طریقوں کو اپنایا تھا۔ وہ ساری زندگی مشرقی تہذیب کے دلدادہ رہے۔ شیروانی۔ چوڑی دار پائجامہ اور بالدار انور کیپ ہمیشہ سے ان کا مخصوص لباس رہا۔ انھوں نے جس وضعداری کا ثبوت دیا اس کی مثال ایسے مسلمان گھرانوں میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ جن کے افراد مغرب کی ہوا کھا چکے ہیں۔ مغرب کی ہوا کھانے کے باوجود، نواب اسمٰعیل خاں مشرقی رہے۔

بیرسٹری کی سند حاصل کرنے کے باوجود نواب صاحب نے اس پیشے میں کبھی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ جب وہ انگلستان سے واپس آئے تو ہندوستان میں خلافت تحریک اپنے شباب پر تھی۔ نواب صاحب بھی اپنی جاگیر اور نوابی سے بے پروا ہوکر علی برادران۔ حسرت موہانی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی معیت میں اس تحریک کے ایک سرگرم کارکن ہوگئے۔ سارے ہندوستان کا دورہ کرکے انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی۔ نواب صاحب نے ۱۹۲۷ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے آل انڈیا خلافت کمیٹی کے آخری اجلاس کی صدارت کی۔

نواب صاحب کے خلوص اور ایثار کے دوست دشمن سب ہی قائل تھے۔ شاید وہ مولانا حسرت موہانی کے بعد تنہا مسلمان رہنما تھے جن کی دوست دشمن یکساں عزت کرتے تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ خلافت کمیٹی اور لبرل جماعتوں میں ان کی انتہائی تکریم کی جاتی تھی۔ اسلامی ہند کی شاید ہی کوئی

ایسی تحریک ہوگی جس میں نواب صاحب نے حصہ نہیں لیا ہوگا۔

نواب صاحب سے میری ملاقات ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ وہ مہاراجہ محمود آباد کے بٹلر پیلس میں مسلم لیگ کی مجلس عمل کی صدارت کر رہے تھے۔ جس میں پنڈت جواہر لال نہرو کی مسلم عوام سے رابطہ تحریک کے سوال پر غور اور یوپی میں مسلمانوں کی نشستوں پر ضمنی انتخابات کے انتظامات سے متعلق تبادلۂ خیال ہو رہا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اجلاس میں بڑی جذباتی تقاریر کی گئیں لیکن نواب صاحب تحمل اور بردباری کا پیکر بنے رہے۔ وہ اسٹیج کے مرد میدان نہیں تھے بلکہ وہ عمل اور کردار کے عظیم پیکر تھے۔

اس کے بعد مجھے نواب صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن میں نے انھیں ہمیشہ ایک مخلص اور خاموش انسان پایا۔ ان کی شرافت اور وضعداری۔ ان کی چال ڈھال۔ لباس اور گفتگو سے عیاں ہوتی تھی۔

۱۹۳۷ء میں جب وہ مسلم لیگ سے عملی طور سے وابستہ ہوئے، تو قائدِ اعظم نے انھیں اپنا دست راست بنایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلم لیگ میں مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور نواب اسمٰعیل خاں کی شمولیت نے اسے ایک عوامی جماعت بنا دیا، اور مسلم عوام میں اس کی مقبولیت میں بے انتہا اضافہ کیا۔ ورنہ اس کے قبل تو کانگریسی اور قوم پرست مسلمان مسلم لیگ کو نوابوں اور ٹوڈیوں کی جماعت کہتے تھے۔ جب نواب صاحب اور مولانا حسرت موہانی نے اس میں شمولیت اختیار کی تو مسلم لیگیوں کو کہنے کا موقع مل گیا کہ مسلم لیگ اگر ٹوڈیوں کی جماعت ہوتی تو رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی۔

خادم کعبہ مولانا شوکت علی اور قومی رہنما نواب اسمٰعیل خاں اس میں کیسے شامل ہوتے۔ اس طرح مسلم لیگ میں ان رہنماؤں کی شمولیت نے مسلم لیگ کے خلاف کانگریسی پروپیگنڈے کو باطل کر دیا۔ جس کی وجہ سے پنڈت نہرو کی مسلم عوام رابطہ تحریک بری طرح ناکام ہوئی۔ مسلم نشستوں کے لئے ضمنی انتخابات میں مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کو بری طرح شکست ہوئی اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں سارے ہندوستان میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی ہوئی جو آخر کار قیام پاکستان کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

نواب صاحب قالین کے شیر نہیں تھے، بلکہ میدانِ عمل کے شیر تھے۔ مسلم لیگ کی تنظیم میں انھوں نے سب سے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مسلم لیگ کے دستور کی تاسیس کمیٹی کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ اور ان کے مرتب کردہ دستور کو ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں بالاتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔ انھوں نے لاہور میں ۱۹۴۰ء کے قرارداد پاکستان کی ترتیب میں بھی نمایاں حصہ لیا۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح نواب صاحب کی فراست اور تدبر کے بہت قائل تھے۔ جب کبھی مسلم لیگ کے حلقوں میں انتشار یا اختلافات رونما ہوتے تو اس کو دور کرنے کے لئے قائد اعظم کی نگاہ انتخاب نواب صاحب پر پڑتی تھی۔ نواب صاحب اپنی بردباری تحمل اور ٹھنڈے مزاج سے اس قسم کے اختلافات کو دور کر دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی ہند میں قائدِ اعظم کے بعد نواب صاحب پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا تھا، اور ان کے فیصلوں

کو سب ہی قبول کرتے تھے۔

قائد اعظم نے مسلم لیگ مجلس عمل قائم کی تو اس کی صدارت کے لئے ان کی نظر انتخاب نواب صاحب پر پڑی۔ مسلم لیگ کے صدر کے بعد اس تنظیم میں یہ سب سے اہم عہدہ تھا۔ نواب صاحب نے اس سے متعلق فرائض کو بحسن وخوبی سر انجام دیا۔ انھوں نے قومی مفاد کو ذاتی مفاد سے ہمیشہ بالاتر رکھا۔ اور اصولوں کی قربانی کو مفاد پرستی پر کبھی جائز تصور نہیں کیا۔ یہی سبب تھا کہ نواب صاحب کے فیصلوں کو کبھی کوئی چیلنج نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ یہ انصاف پر مبنی ہوتے تھے، اور سبھی کو نواب صاحب کی دیانت داری پر مکمل اعتماد تھا۔

مئی سنہ ۱۹۴۶ء میں شملہ میں جب وزارتی مشن سے کانگریس، اور مسلم لیگ کو برصغیر کی آزادی سے متعلق گفتگو کرنے کی دعوت دی گئی تو مسلم لیگ کی پارٹی میں قائد اعظم۔ نواب اسمٰعیل خاں۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں۔ اور سردار عبدالرب نشتر شامل تھے۔ جبکہ کانگریس پارٹی میں آزاد۔ نہرو۔ پٹیل اور غفار خاں شریک تھے۔

نواب صاحب ایک انتہائی مخلص۔ دیانتدار۔ لائق اور خاموش کارکن تھے۔ غالب کے قول کے مطابق:

"نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ"

کے اصول پر عمل کرتے ہوئے انھوں نے اپنی خدمات جلیلہ کا کبھی کوئی صلہ طلب نہیں کیا بلکہ اس کا تصوّر بھی نہیں کیا۔ پاکستان میں وہ یقیناً قائد اعظم کے

جانشین ہونے کے نہ صرف حقدار بلکہ مستحق تھے۔ نواب صاحب اگر قائدِ اعظم کے بعد پاکستان کے سربراہ ہوتے تو آج پاکستان ایک متحد مستحکم اور عظیم ملک ہوتا، جہاں ہر چھوٹے بڑے سے انصاف کیا جاتا جہاں غیر مستحق کو مستحق پر ترجیح نہ دی جاتی اور جہاں لسانی اور قومی انتشار نہ پیدا ہوتا، جو ناانصافیوں اور مفاد پرستیوں کی پیداوار ہے، اور جس کی وجہ سے پاکستان کا ایک بڑا حصہ اس سے کٹ گیا ہے۔

نواب صاحب اپنی بے لوث خدمات کا کوئی صلہ پاکستان میں نہیں چاہتے تھے۔ اور ایک عظیم مجاہد کی طرح قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنے آپ کو ہندوستان کے اِن بے یار و مددگار مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا، جو قیام پاکستان کے بعد پژمردگی اور سیاسی جمود کا شکار ہو گئے تھے۔ مولانا حسرت موہانی کی طرح نواب صاحب نے بھی اِن بے سہارا مسلمانوں کے تحفظ کے لئے کانگریسی حکومتوں سے جنگ کی۔ اور انھیں چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنا گوارا نہیں کیا۔

آخر کار اسلامی ہند کا یہ عظیم مجاہد ہندوستان میں ۲۸ جون ۱۹۵۸ء کو اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔

اسلامی ہند کے لئے نواب صاحب کی خاموش اور پُر خلوص خدمات سے متعلق اردو کا ایک مشہور شعر یاد آتا ہے:

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جتنا جس میں ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

حسین شہید سہروردی

غالباً ۱۹۵۰ء کے دسمبر کا مہینہ تھا۔ میں اس زمانہ میں مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات کے محکمہ اطلاعات (پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ) میں افسر ملاقات تھا۔ میرا کام پاکستان میں آنے والے غیر ملکی صحافیوں کو ہر قسم کی سہولت پہنچانا اور یہاں کے برسرِ اقتدار افراد سے ملاقات کے انتظامات کرانا تھا۔

انھیں دنوں حسین شہید سہروردی صاحب پاکستان کے نئے وزیرِ اعظم مقرر ہوئے تھے۔ ویسے بھی سہروردی صاحب کا شمار پاکستان کے عظیم ترین قائدین میں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قائدِ اعظم کے بعد پاکستان آنے والے ممتاز اور مقبول ترین لیڈر تھے۔ بین الاقوامی دنیا میں بھی ان کی بڑی ساکھ تھی۔ جب وہ پاکستان کے وزیرِ اعظم ہوئے تو متعدد غیر ملکی صحافیوں نے ان سے ملاقات کرنے اور انٹرویو کرنے کے لئے پاکستان کا رخ کیا۔ ان میں سے ایک نیویارک ٹائمز کا دہلی میں مقیم نامہ نگار مشہور صحافی روز نتھال بھی تھا۔

وہ پہلے بھی سہروردی صاحب سے مل چکا تھا اس نے دہلی سے سہروردی سے ملنے کی درخواست کی جو منظور ہوئی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ کراچی پہنچا۔ میں نے وزیر اعظم کے سکریٹری سے رابطہ پیدا کر کے سہروردی صاحب سے روزنتھال کی ملاقات کا وقت مقرر کروا دیا۔

ملاقات کا وقت سات بجے شام کا مقرر ہوا تھا۔ میں روزنتھال کو ساتھ لے کر پونے سات بجے وزیر اعظم کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ وزیر اعظم صاحب کسی تقریب میں پیلس ہوٹل گئے ہیں۔ ہم لوگوں کو ایک وسیع ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ سات بجنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ سہروردی صاحب کی گاڑی پورچ میں رکی۔ اور وہ اپنے پرائیویٹ سکریٹری آفتاب احمد خاں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ روزنتھال کو وہ پہلے سے جانتے تھے اُسے دیکھ کر انھوں نے خوش آمدید کہا۔ مجھے تعارف کے فرائض ادا نہیں کرنے پڑے۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک وزیر اعظم روزنتھال سے مصروف گفتگو رہے۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی موضوعات پر گفتگو رہی۔ اسی دوران میں چائے سے بھی تواضع کی گئی۔ اور آخر کار سہروردی صاحب نے روزنتھال کو جب رخصت کیا تو میں نے راستے میں اس سے پوچھا کہ تم نے ہمارے وزیر اعظم کو کیسا پایا۔ اس نے برجستہ کہا کہ: "سہروردی کا شمار اس صدی کے عظیم ترین سیاست دانوں میں ہوتا ہے"

وہ وزیر اعظم پاکستان کی سیاسی سوجھ بوجھ سے بڑا متاثر تھا ساتھ ساتھ وہ اس بات پر افسوس کر رہا تھا کہ نئے پاکستان کی تعمیر کے لئے انھیں

موقع نہیں دیا گیا، اور اس کے خیال میں پاکستان کی یہ بڑی قسمتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد اگر کوئی شخص پاکستان کی صحیح معنوں میں تعمیر کر سکتا تھا تو وہ سہروردی تھے۔ ان کے بعد دوسرے نمبر پر سردار عبدالرب نشتر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے خلوص اور اہلیت پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن پاکستان میں دونوں کو اقتدارِ اعلیٰ سے محروم رکھا گیا۔

قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد پاکستان کے اقتدار پر ایسے افراد فائز رہے جنھوں نے سیاسی اور ذاتی مصلحتوں کی بنا پر ایسے غلط اقدامات کئے جو آگے چل کر قومی انتشار اور افتراق۔ علاقائی اور صوبائی عصبیتوں کو فروغ دینے کے باعث ہوئے، اور جن کی بنا پر آخر کار ملک کا بڑا حصہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔ ان غلط اقدامات میں دستور سازی میں بے جا تاخیر کوٹہ سسٹم کا نفاذ۔ قومی زبان کے مسئلہ کی جانب سرد مہری، اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک پاکستان میں غیر اسلامی شعائر کی حوصلہ افزائی شامل ہے۔ ان مفاد پرست افراد نے اقتدار کی کرسی پر جلوہ افروز ہونے کے بعد ان تمام نظریات کو یکسر فراموش کر دیا۔ جن کے حصول کے لئے پاکستان عالمِ وجود میں آیا تھا۔ جس کے لئے برصغیر کے لاکھوں افراد نے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ اور کروڑوں مسلمانوں نے اپنا گھر بار چھوڑا تھا۔ ان خود غرض صاحبِ اقتدار افراد نے ذاتی مفاد کے تحت قومی یکجہتی اور قومی نظریات کو فروغ دینے کے بجائے علاقائی اور صوبائی عصبیتوں کو ہوا دی جس نے آخر کار چھبیس سال کے قلیل عرصے میں پاکستان کے بڑے حصے کو اس سے

علیحدہ کر دیا۔ ترقی معکوس کی ایسی مثال جیسی پاکستان نے پیش کی ہے تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔

حسین شہید سہروردی کو جو ایک عوامی لیڈر تھے اور پاکستان میں حقیقی جمہوریت قائم کرنا چاہتے تھے قصداً پاکستان کے اقتدار اعلیٰ سے محروم رکھا گیا۔ وہ بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے اور بنگال کے مشہور سہروردی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ انھوں نے آکسفورڈ سے ایم اے اور بی سی ایل (B.C.L) کیا۔ اپنے زمانہ کے بہت دلیر۔ پرخلوص اور عظیم مدبر اور شہرۂ آفاق، قانون داں تھے۔ پاکستان کے وہ دو چار افراد میں سے تھے۔ جن میں خلوص، ایمانداری اور اہلیت بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔

قیام پاکستان میں سہروردی نے بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ متحدہ بنگال میں ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی مثالی کامیابی سہروردی کی پرجوش قیادت اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھی۔ جنھوں نے بنگال کے قریہ قریہ کا دورہ کر کے مسلم عوام کو بیدار کیا۔ اور پاکستان کا پیغام گھر گھر پہنچایا، جبکہ پاکستان میں شامل ہونے والے دیگر صوبوں۔ سندھ۔ پنجاب۔ سرحد وغیرہ میں مسلم لیگ کی کامیابی زیادہ نمایاں نہ تھی، اور سرحد میں تو کانگریسی اکثریت قائم ہو گئی تھی۔ بنگال میں مسلم لیگ نے ۹۷ فیصد ووٹ حاصل کئے تھے۔ ہندوستان کے مسلم اقلیتی صوبوں کے علاوہ مسلم لیگ کو کسی دوسرے صوبے میں ایسی شاندار کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

سہروردی میں محنت کرنے کی غضب کی صلاحیت تھی۔ وہ دن میں اٹھارہ بیس گھنٹے کام کرنے کے عادی تھے۔ بنگال کے قحط کے دوران جب وہ وزیر تھے، اور

کلکتہ کے ہندو مسلم فسادات کے دوران جب وہ متحدہ بنگال کے وزیر اعظم تھے، انھوں نے آرام کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ کلکتہ کے فسادات میں انھوں نے پولیس کنٹرول روم کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور فساد زدہ علاقوں میں وہ تنِ تنہا امداد کے لئے پہنچ جاتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد برصغیر کے نامور مسلم قائدین مولانا حسرت موہانی اور نواب اسمٰعیل کی طرح سہروردی بھی ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ اور ان کے لئے سازگار فضا تیار کرنے کے لئے بھارت میں ٹھہر گئے۔ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھوں نے گاندھی جی کے ہمراہ فرقہ وارانہ جنون کے شکار بھارت کا دورہ کیا، اور اس طرح انھوں نے مشرقی پنجاب میں ہونے والے مسلمانوں کے قتل عام اور غارتگری سے مغربی بنگال کو محفوظ رکھا۔ ورنہ مشرقی پاکستان میں بھی مسلمان مہاجرین کا اتنا زبردست ریلا ہوتا کہ پاکستان کے اس حصّہ کی معاشی حالت جو پہلے ہی سے غذائی قلت کا شکار تھا بالکل تباہ ہو جاتی۔

اس سلسلے میں انھیں متعدد بار اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنا پڑا، اور ان پر متعدد بار قاتلانہ حملے ہوئے، لیکن ایک مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کا عقیدہ تھا کہ موت کا وقت معین ہے جو ایک ساعت بھی ٹل نہیں سکتا۔ وہ ایک انتہائی دلیر اور باہمت انسان تھے۔ زندگی کی مشکلات اور خطرات انھیں کبھی اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکیں۔

سہروردی صاحب پر چھ بار قاتلانہ حملے ہوئے لیکن خدا نے ہر بار انھیں بچا لیا۔ ۱۹۴۶ء میں کلکتہ کے ہندو مسلم فسادات کے دوران ان کی کار پر

بم پھینکا گیا۔ جس سے وہ خفیف زخمی ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد وہ کلکتہ میں گاندھی جی کے ساتھ فرقہ وارانہ امن قائم کرنے میں مصروف تھے۔ ایک دن بیلی گھاٹ (کلکتہ) کے مقام پر بیس ہزار ہندوؤں نے سہروردی پر حملہ کر دیا۔ سہروردی مکان سے باہر نکل آئے، اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا: "کہ تم میری جان لے سکتے ہو لیکن وعدہ کرو کہ اس کے بعد کسی مسلمان کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔" باہر سے شور و شغف کی آواز سن کر گاندھی جی بھی جو مکان کے اندر موجود تھے، باہر نکل آئے اور مجمع کو مخاطب کر کے کہا: "اگر تم لوگ شہید کو مارنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے ختم کر دو۔" اس پر سارا مجمع وہاں سے غائب ہو گیا۔

اس زمانے میں سہروردی صاحب دہلی کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ جہاں انھیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ ایک شخص کو اس بات کے لئے تیار کیا گیا، اس نے اس کمرے کے روشن دان سے جس میں سہروردی صاحب استراحت فرما رہے تھے، اپنے پستول کی نالی ان کی جانب کی تو اسے دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک کانا شخص جس کی ایک آنکھ بند ہے بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا ہے۔ اس نے خیال کیا کہ یہ سہروردی صاحب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ کانے نہیں ہیں، وہ وہاں سے چلا آیا۔ درحقیقت سہروردی صاحب کی عادت تھی کہ زیادہ استغراق کے موقع پر اپنی ایک آنکھ وہ بند کر لیا کرتے تھے۔

گاندھی جی کے قتل کے مقدمہ کے دوران بھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ قاتلوں نے گاندھی، سہروردی، اور نہرو کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ کراچی میں بھی جب وہ اپنے خسر سر عبدالرحیم کے بنگلہ واقع کچہری روڈ پر مقیم تھے، تو

ایک شخص نے شب کی تاریکی میں چاقو سے حملہ کیا۔ لیکن وہ پکڑا گیا۔ جب پر اس نے رونا شروع کیا۔ سہروردی صاحب کو اس پر ترس آ گیا، اور انھوں نے اس کو پولیس کے حوالے کرنے کی بجائے چھوڑ دیا۔ گجرانوالہ کے اسٹیشن پر ۱۹۶۲ء میں ان پر گولی چلائی گئی۔ لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ اور عوامی لیگ کا ایک کارکن اس کا شکار ہو گیا۔

سہروردی صاحب ایک عظیم مدبر سیاست داں اور پاکستان کے چوٹی کے وکیل تھے۔ وہ ایک عوامی لیڈر تھے۔ عوام کے دکھ درد اور خوشی میں وہ ایک عام پاکستانی کی طرح حصّہ لیتے تھے۔ جب پاکستان کے خود غرض صاحبِ اقتدار افراد کے زمانے میں مسلم لیگ ایک عوامی جماعت سے خانہ زاد خواص کی جماعت ہو گئی تو سہروردی نے عوامی لیگ قائم کی۔ قائدِ اعظم نے سہروردی کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور انھیں پاکستان سے متعلق متعدد اہم منصبوں کی پیش کش کی۔ لیکن اس زمانے میں سہروردی صاحب گاندھی جی کے ساتھ بھارت میں ہندو مسلم کشیدگی دور کرنے کا اہم کام انجام دے رہے تھے۔ قائدِ اعظم کے انتقال کے بعد ان کے جانشینوں نے جو سہروردی کی مقبولیت اور صلاحیتوں سے سخت خوفزدہ تھے اور جنھیں خدشہ تھا کہ کہیں سہروردی پاکستان کے اقتدارِ اعلیٰ پر قابض نہ ہو جائے، سہروردی کو ہر طرح سے بدنام کرنے، یہاں تک کہ ان کی پاکستانی شہریت اور پاکستان دستور ساز اسمبلی میں ان کی رکنیت ختم کرنے کی سازش کی۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں جب سہروردی پاکستان کے وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز ہوئے تو انھوں نے ملک میں صحیح قسم کی جمہوریت قائم کرنے کی کوشش کی، اور متعدد بہت مفید اور کار آمد اقدامات کئے۔ مہاجرین کو معاوضہ دینے کی اسکیم بھی انھوں نے نافذ کی۔ لیکن ایسا جمہوریت نواز شخص پاکستان میں زیادہ عرصہ تک کہاں چل سکتا تھا۔ ایک سال کے قلیل عرصہ میں وہ علاقائی سازشوں کا شکار ہو گئے۔

سہروردی ایک انتہائی مخیر انسان تھے۔ انسانی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ متحدہ بنگال کے ایک انتہائی متمول اور مشہور خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ کافی عرصہ تک متحدہ بنگال میں وزیر اور بعد ازاں وزیر اعلیٰ کے عہدوں پر فائز رہے۔ وہ پاکستان کے چوٹی کے وکیل تھے۔ وکالت سے انھوں نے لاکھوں روپے کمائے، لیکن جب ان کا انتقال ہوا تو تیرہ ہزار روپے کا بینک کا قرضہ چھوڑ کر مرے۔ ان کے پاس کوئی مکان کوئی جائداد نہ تھی۔ خاندان بھی مختصر سا ہے۔ صرف ایک لڑکی ہے جس کے ساتھ وہ رہتے تھے۔ ہزاروں روپے ماہوار وہ نادار طلبا، بیواؤں اور یتیموں کو دیا کرتے تھے۔ لیکن کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہوتی تھی۔ دوست ان کی سخاوت سے غلط فائدے اٹھاتے تھے۔ ان کی دولت دوستوں کو تو چھوڑیئے، غیروں کے لئے بھی وقف رہتی تھی۔ ایک بار ایک خستہ حال شخص ان کے پاس آیا۔ اور ان کے یہاں مقیم ہوا۔ رات میں اس نے سہروردی صاحب کے بٹوہ سے تین ہزار روپے اڑا لئے۔ ان کے ساتھیوں

نے اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہا۔ لیکن سہروردی صاحب نے ایسا کرنے سے انھیں باز رکھا اور مکان بنانے کے لئے آٹھ ہزار روپے مزید دے کر اسے رخصت کیا۔

سہروردی صاحب ایک عوامی اور انسان دوست آدمی تھے۔ وہ جب انتخابی دورے پر جاتے تو عام آدمی کی طرح زندگی بسر کرتے۔ خدا نے انھیں سخت سے سخت محنت کی صلاحیت عطا کی تھی، وہ اٹھارہ اور بیس گھنٹے روزانہ کام کیا کرتے تھے۔

سہروردی کے ساتھی، اور ان کے ہمدرد سہروردی سے بڑی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ قائدِ اعظم کے بعد پاکستان کے وہ تنہا لیڈر تھے جو مشرقی اور مغربی پاکستان میں یکساں مقبول تھے۔ ان کے چیلے شیخ مجیب الرحمٰن تو انھیں غیر معمولی انسان سمجھتے، اور ان کی پرستش کرتے تھے۔

پاکستان کی گندی سیاست نے سہروردی کو اپنی آخری عمر میں بہت دل شکستہ اور دل برداشتہ کر دیا تھا۔ زمانہ کی مشکلات اور وطن میں مفاد پرستوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف مسلسل جہاد کرنے والا پاکستان کا یہ عظیم فرزند آخرکار دل کا مریض ہو گیا۔ اس نے ۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کو بیروت کے ایک ہوٹل میں انتہائی کسمپرسی کی حالت میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اس وقت اس کے پاس اس کا کوئی ہمدرد، یہاں تک کہ اس کی لڑکی بھی نہ تھی۔ پاکستان کا یہ عظیم فرزند جس نے زندگی میں کروڑوں روپے کمائے جب مرا تو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ بقول شاعر:

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا ۔۔۔ ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

سردار عبدالرّب نشتر

نومبر ۱۹۴۷ء کا کوئی دن تھا - ارنڈا جہاز بمبئی سے چل کر کیماڑی کی گودی میں جا لگا۔ یہ جہاز جس میں مشکل سے ڈھائی ہزار مسافروں کی گنجائش تھی۔ سات ہزار تارکینِ وطن کو لے کر آیا تھا۔ جنھوں نے اپنے آبا و اجداد کے گھربار کو چھوڑ کر اپنے خوابوں کی جنّت، پاکستان میں نئی زندگی کی ابتدا کرنے کا دلفریب تصور باندھ رکھا تھا۔ ان میں، کافی تعداد میں ہندوستانی ریلویز کے مسلمان ملازمین اور ان کے خاندان والے بھی شامل تھے۔ جنھوں نے پاکستان میں اپنی ملازمتوں کا تبادلہ کرا لیا تھا۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔

کیماڑی میں جب جہاز لنگر انداز ہوا تو مسافروں کے خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ساری فضا جہازیوں کے نعرہ اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد، کے نعروں سے گونج اٹھی۔ لیکن کیماڑی میں ان کا جواب دینے والا کوئی

نہ تھا۔ تھوڑے سے افراد جو غالباً جہاز کی آمد کی خبر سن کر اپنے عزیزوں کو لینے آئے تھے۔ خاموش تماشائی کی طرح جہاز سے مسافروں کو اترتے دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہیں اپنے عزیزوں کو تلاش کرتی رہیں۔

شام ہو چلی تھی۔ مسافروں کا سامان ابھی جہاز کے تہ خانے سے نہیں اتارا گیا تھا۔ اس لئے زیادہ تر مسافروں نے رات کیماڑی کے شیڈ میں بسر کی۔ ہندوستان کے مقابلہ میں کراچی میں پھلوں اور کھانے کی فراوانی اور ارزانی کافی خوش کن تھی۔

دوسرے دن ہم بھی ایک عزیز کے یہاں پناہ گزیں ہوئے، جو پہلے سے کراچی میں آباد تھے۔ یہاں بڑا سکون نصیب ہوا۔ دو تین دن تو تھکان اتارتے رہے۔ اسی دوران ایک عزیز سے معلوم ہوا، کہ مولانا شبیر احمد عثمانی جیکب لائنز میں اے ایم قریشی کے مکان میں فروکش ہیں۔ مولانا سے ہماری بھی یاد اللہ تھی۔ ہم بھی ان کے معتقدوں بلکہ نیاز مندوں میں تھے۔ دوسرے ہی دن خدمت میں باریاب ہوئے۔ مولانا ایک کمرے میں پلنگ پر دراز تھے۔ قدرے علیل تھے۔ اور کافی دل برداشتہ معلوم ہوتے تھے۔ سفر کی تفصیلات اور ملازمت کے تبادلہ کو سن کر کہنے لگے۔ خدا پاکستان کو قائم دائم رکھے، اور حقیقی معنوں میں اسلامی مملکت بنائے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم نے تو اسی تصور کی خاطر گھر بار چھوڑا ہے۔ میں نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ میرا تقرر اگر کراچی میں کرا دیں تو گھر والوں کو بڑی سہولت ہو۔ مولانا کی بات کو پاکستان میں بھلا کون ٹالنے کی ہمت کرے گا۔

اس پر مولانا تھوڑی دیر خاموش رہے۔ کہنے لگے یہاں آکر مجھے بڑا تلخ تجربہ ہوا۔ یہاں میری کوئی نہیں سنتا۔ ایک نشتر ہیں جو اب بھی میری عزت کرتے ہیں۔ کہو تو انھیں لکھ دوں۔ لیکن اگر یہ بات حکومت کی پالیسی کے خلاف ہوگی تو میں اس کی سفارش نہیں کروں گا۔ اسی طرز کا خط انھوں نے سردار صاحب کو لکھ دیا۔

دوسرے دن میں سردار نشتر صاحب وزیر مواصلات کی کوٹھی پر پہنچا جو غالباً کلفٹن کے پُل کے قریب واقع تھی۔ خیال تھا کہ وزیر کی کوٹھی ہے، کافی پہرہ ہوگا۔ خدا جانے وہاں تک رسائی ہو سکے گی یا نہیں۔ لیکن خلافِ توقع گیٹ پر مجھے کسی نے نہیں روکا اور میں کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہو گیا۔ جس کے چاروں طرف لکڑی کی جالی لگی ہوئی تھی۔ برآمدے میں ایک صاحبزادے نے میری آمد کا سبب پوچھا۔ میں نے انھیں مولانا کا خط دے دیا۔ ابھی میں برآمدے میں سلیقے سے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ صاحبزادے نے مجھے کمرے کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں نشتر صاحب نے اپنی کرسی سے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ کرتے اور پائجامے میں ملبوس تھے۔ ریلوے کے ایک معمولی ملازم کی اپنے وزیر سے یہ بڑی غیر متوقع ملاقات تھی۔ ایک وزیر سے ایسے اخلاق کا اظہار میرے خواب و خیال میں نہ تھا۔ کہاں ریلوے کا ادنیٰ ملازم اور کہاں ریلوے کا وزیر۔ زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ کانگریسی وزیروں کو دیکھا تھا کہ وہ عوام سے کسی تصنع کے بغیر ملتے تھے۔ اور پہرہ چوکی ان کی کوٹھیوں پر بھی نہیں

ہوتا تھا۔ لیکن ایک پاکستانی وزیر کا میرے لئے یہ بڑا دل خوش کن تجربہ تھا۔ نشتر صاحب نے میرے سفر اور ضرورتوں کے متعلق متعدد سوالات کئے۔ اور میری داستان بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنی۔ کہنے لگے۔

"بھائی مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے لیکن جو ریلوے ملازمین ہندوستان سے آتے ہیں زیادہ تر کراچی میں قیام کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سارے کراچی میں تعینات کر دیئے جائیں تو پنجاب۔ سرحد اور سندھ کی گاڑیاں کون چلائیگا اس لئے میں نے اس میں دخل نہ دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آپ لوگوں نے پاکستان کے لئے اتنی قربانیاں دی ہیں، گھر بار چھوڑا ہے۔ پھر یہ تو بہت معمولی بات ہوگی، اگر آپ کو کراچی کے بجائے حیدرآباد۔ سکھر۔ ملتان۔ لاہور یا پشاور میں تعینات کر دیا جائے۔ یہ آپ کا ملک ہے آپ کو اس کی تعمیر میں اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیئے۔"

بات بڑی معقول تھی۔ آگے کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ تقریباً بیس منٹ تک نشتر صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ اور جب میں نے خود ہی ان سے جانے کی اجازت چاہی تو وہ مجھے برآمدے تک چھوڑنے آئے۔

نشتر صاحب کے اخلاق، خلوص اور صاف گوئی کے انمٹ نقوش اپنے دل پر لے کر میں گھر لوٹا۔ دل نے کہا، جب تک پاکستان میں ایسے مخلص لیڈر موجود ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ لیکن

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ اس نوزائیدہ ملک میں خود غرضیوں اور عصبیتوں کی پھیلتی ہوئی تاریکی کو نشتر اور سہروردی ایسے مخلص لیڈروں کی روشنی بھی دور نہ کر سکی، اور بادِ مخالف نے ان روشنیوں کو پھیلنے کا موقع ہی نہیں دیا، اور آخر کار گل کر دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں صحیح قسم کے عوامی اور مخلص لیڈر ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے، جو عوام کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔ جو عوام میں سے اٹھتے ہیں، اور انھیں کی طرح رہتے ہیں۔ وہی کھاتے ہیں جو عوام کھاتے ہیں۔ وہی پیتے ہیں جو عوام پیتے ہیں۔ ان کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہتی ہے اور خواہ وہ کسی بڑے سے بڑے عہدے پر پہنچ جائیں عوام کو ان تک پہنچنے کے لئے روک ٹوک نہیں ہوتی ہے۔ ایسے عوامی لیڈر ہندوستان کی کانگریس اور سوشلسٹ پارٹیوں میں تو ملتے ہیں، پاکستان میں نہیں۔

لندن کے ایک مشہور اخبار کے مطابق پاکستان میں غریبوں کے لیڈر شہزادوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب مطلب ہوتا ہے تو یہ لیڈر جھوٹے سچے وعدوں سے عوام کی خوشامد کرتے ہیں اور کام نکل جانے اور وزارتوں کی کرسیوں پر متمکن ہونے کے بعد یہ لیڈر عوام سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پولیس اور فوج ان کے اور عوام کے درمیان حائل ہو جاتی ہے، اور ان تک عوام کی رسائی ناممکن بنا دیتی ہے۔

نشتر صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ ٹکڑوں میں ناک والے تھے، اس لئے نکو بن گئے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ وہ خلوص۔ سادگی اور پاکیزگی کا

پیکر تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ مولانا محمد علی جوہر ایسے مخلص اور بے باک عوامی لیڈر سے فیضیاب ہونے کا انھیں پورا موقع ملا تھا، اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے وہ جوہر کا نقش ثانی تھے۔ محمد علی کا خلوص۔ بیباکی ان کا سوز وگداز اور سحر بیانی نشتر کو بھی ورثہ میں ملی تھی۔ اقبال نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا تھا۔

نگہ بلند سخن دلنواز ، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

اس کے بعد نشتر صاحب کو بارہا میں نے قریب سے دیکھا۔ ملاقات کی۔ اور سنا اور ہر بار میں نے انھیں اپنے نقش اول کے مطابق پایا۔ اس خوب صورت پیکر میں قدرت نے کتنی خوب صورت صفات، ہمدردی، انسانیت، اور خلوص بھر دیا تھا اس کی دوسری مثال مجھے پاکستان میں کہیں اور نظر نہیں آئی۔ پاکستانی عوام کے وہ محبوب ترین لیڈر تھے۔ اور کراچی والے تو ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی آواز کے جادو نے لاکھوں سامعین کو مسحور کیا تھا۔ ہزاروں قلوب میں سوز وگداز پیدا کیا تھا۔ اور سینکڑوں آنکھوں کو نمناک کیا تھا۔

کراچی میں یوم محمد علی جوہر اور یوم حسرت ہر سال منایا جاتا ہے۔ جوہر اور حسرت کے چند معتقدین اور مداحین کراچی کے کسی ہال میں جمع ہو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں اور حریت کے ان عظیم علمبرداروں کی یاد تازہ کر لیتے ہیں۔ کبھی کسی وزیر۔ سفیر یا بڑے پاکستانی لیڈر کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ آکر ان عظیم انسانوں کے متعلق چند باتیں سن لیں۔ جنھوں نے

مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ پاکستان بنوایا، اور جن کی بدولت پاکستان کے یہ وزراء اور سفرا بڑی بڑی کرسیوں پر براجمان ہوئے۔ نشتر صاحب ان میں سے نہ تھے، ان کو میں نے کئی بار یوم جوہر اور حسرت کی صدارت کرتے اور ان میں تقریر کرتے سنا۔ حسرت اور جوہر سے متعلق ان کی وہ تقاریر آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ تقریر کیا تھی، ان بزرگوں کی پاکبازی اور پرخلوص زندگی کے چند نشتر تھے جو نشتر صاحب کی سحر انگیز زبان سے نکل کر سامعین کے قلوب میں جاگزیں ہو گئے۔ جنھوں نے بہت سے سامعین کے آنسوؤں کے ان بندوں کو توڑ دیا جو مسلمانوں کے ان عظیم قائدین کی احسان فراموش قوم سے متعلق ان کے قلوب میں نہاں تھے۔

سردار نشتر نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز خلافت اور کانگریس سے کیا۔ وہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی کے مقلدوں میں تھے اور انھیں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ خلافت تحریک کے سلسلے میں جیل بھی گئے، لیکن جب نہرو رپورٹ کے بعد کانگریس کی ہندو نواز پالیسی نے مسلمانوں کو کانگریس سے برگشتہ کیا اور جوہر اور حسرت ایسے عظیم لیڈروں نے جنھوں نے کانگریس کو ایک فعال جماعت بنایا تھا، اس سے علیحدگی اختیار کرلی تو نشتر بھی کانگریس سے علیحدہ ہو گئے، اور مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔

سردار نشتر ۱۹۳۷ء میں صوبہ سرحد کی صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ قائدِ اعظم کی دوربین نگاہوں نے "اپنے نشتر" کو فوراً پہچان لیا اور انھیں تمام ہند مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا۔

بعد ازاں سردار عبدالرب نشتر قائدِ اعظم کے خاص معتقدین کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ شملہ کانفرنس۔ کیبنٹ مشن اور دیگر اہم کانفرنسوں میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے قائدِ اعظم کے ساتھ حکومت برطانیہ اور کانگریس کے نمائندوں سے گفتگو میں شریک ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ہندوستان کی عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی جانب سے وزیر مواصلات مقرر ہوئے۔ انھوں نے برصغیر کے اس پرہیجان اور طوفانی دور میں بڑی استقامت اور جوانمردی سے کانگریسی وزراء کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کیا۔

پاکستان جب قائم ہو گیا تو پاکستان میں بھی سردار نشتر وزیر مواصلات کے عہدہ پر برقرار رہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں انھیں نائب وزیر اعظم نامزد کرنا چاہتے تھے، لیکن اکتوبر ۱۹۵۱ء میں راولپنڈی میں لیاقت علی خاں کی شہادت نے انھیں سردار نشتر کو یہ موقع فراہم کرنے کی مہلت نہ دی۔ پاکستان کی یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ لیاقت علی خاں کے بعد سردار نشتر کو وزیر اعظم نہیں بنایا گیا۔ وہ اگر وزیر اعظم بن جاتے تو آج پاکستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ اور وہ صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بن جاتا۔ ان میں خلوص، صلاحیت اور کردار سب ہی پایا جاتا تھا۔ خواجہ ناظم الدین صاحب بھی بلاشبہ بڑے مخلص اور صاحب کردار مسلمان تھے۔ لیکن ان میں انتظامی صلاحیت بہت کم تھی۔ اسی لیئے وہ محلاتی سازشوں کا شکار ہو گئے۔

سردار عبدالرب نشتر ۱۹۵۴ء میں پاکستانی تاریخ کے ایک ہنگامی دور میں پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے اور انھوں نے جس غیر جانبداری، مستعدی اور خلوص کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔ اس نے انھیں پنجاب میں بہت ہر دلعزیز بنادیا۔

اسی زمانہ میں مس فاطمہ جناح لاہور تشریف لے گئیں تو نشتر بذاتِ خود ان کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر حاضر ہوئے اور گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرنے پر اصرار کیا۔ مس جناح کسی طرح اس پر راضی نہیں ہوتی تھیں۔ اس پر نشتر صاحب نے بڑی عاجزی سے فرمایا: "آپ مجھے گورنر سمجھتی ہیں۔ لیکن میں آپ کا خادم عبدالرب نشتر بھی تو ہوں۔"

خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی برخاستگی کے بعد نشتر صاحب نے حکومت پاکستان سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اور اپنا سارا وقت انھوں نے مسلم لیگ کی تنظیم نو پر صرف کرنے کا تہیہ کرلیا۔ پاکستان کے اس تاریک دور میں جب اس ملک کی گندی سیاست نے اس ملک کو محلاتی سازشوں کا اکھاڑہ بنادیا تھا۔ نشتر صاحب نے اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود مسلم لیگ کی سیاست میں دوبارہ جان ڈالنے کی جان توڑ کوشش کی۔ پاکستان کے طول و عرض کا وسیع دورہ کیا اور اپنی جادو بیانی اور پُرتاثیر آواز سے عوام کے قلوب میں وہی جوش و خروش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جس کی بدولت پاکستان عالم وجود میں آیا تھا۔ لیکن پاکستان کا یہ بوڑھا سپاہی بہت تھک چکا تھا۔ وہ اس تکان کو برداشت نہ کرسکا، اور آخر کار ۱۴ فروری ۱۹۵۸ء کو اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔

پاکستان کے وزیر اعظم فیروز خاں نون نے نشتر صاحب کو قائدِ اعظم کے قریب دفن کرنے پر اعتراض کیا، لیکن اہالیانِ کراچی نے حکومت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نشتر صاحب کو قائدِ اعظم کے پہلو میں دفن کرنے پر اصرار کیا۔ سارا کراچی اپنے ہر دلعزیز قائد کو آخری خراجِ تحسین ادا کرنے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔ حکومت کی مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اہالیانِ کراچی نے اپنے محبوب قائد سردار نشتر کو قائدِ اعظم کے پہلو میں دفن کر کے دم لیا۔

سردار عبدالرب نشتر بڑے جامہ زیب اور وضعدار انسان تھے انھوں نے ہمیشہ شیروانی اور شلوار زیب تن کیا۔ وہ صاحبِ سیف و قلم کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ دل مسلمان تھے۔

سردار صاحب کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ پاکستان میں اس کے حقیقی معماروں اور صحیح قسم کے پر خلوص افراد سے کام نہیں لیا گیا۔ جنھوں نے قیامِ پاکستان میں بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اسی لئے وہ اپنی تقریروں میں محسن بھوپالی کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھنا،
منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

رفیع احمد قدوائی

۱۹۳۷ء میں یو، پی میں کانگریسی وزارت قائم ہو چکی تھی۔ پنڈت گوبند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ اور رفیع احمد قدوائی وزیر داخلہ مقرر ہوئے تھے۔ میں اس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ کسی کام سے لکھنؤ آیا تھا۔ خیال تھا کہ رفیع صاحب سے ملاقات کر لی جائے۔ ان کی بڑی تعریف سنی تھی۔ ان کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ اسمبلی کی عمارت سے متصل پنت جی کی کوٹھی میں کسی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے گئے ہوئے ہیں۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ شام کو الہ آباد واپس جانا تھا۔ پنت جی کی کوٹھی پر پہنچا۔ یہ وہی کوٹھی تھی۔ جس میں پہلے ہوم منسٹر صاحبان رہتے تھے اور کوئی پرندہ اس میں پر نہیں مار سکتا تھا۔ آج اس کا بڑا دروازہ ہر خاص و عام کے لئے کھلا تھا۔ اس پر کوئی سنتری بھی تعنیات نہ تھا۔ میں ڈرتا ڈرتا کوٹھی کے پورچ میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا، اندر سے بات چیت اور بحث و مباحثہ کی ہلکی اور کبھی تیز آوازیں آرہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد کوٹھی کے اندر سے ایک صاحب

برآمد ہوئے جو شکل و شباہت سے وزیر اعلیٰ کے سیکریٹری معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان سے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہنے لگے "چلے جائیے بڑے کمرے میں سب لوگ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں۔ رفیع صاحب بھی وہاں موجود ہیں"۔ میں نے کہا کہ بغیر اطلاع اور اجازت میں کیسے مخل ہو سکتا ہوں۔ انھوں نے جواب دیا "جائیے بھی کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ سبھی اس طرح آتے جاتے ہیں"۔

میں ہمت کر کے اندر چلا گیا۔ بڑے کمرے میں سارے کانگریسی وزراء اور بڑے لیڈر جمع تھے۔ آچاریہ نریندر دیو جو میرے فیض آباد سے تعلق رکھتے تھے مجھے پہچانتے تھے۔ آچاریہ جی مشہور سوشلسٹ لیڈر تھے۔ بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بڑے قابل، لائق اور فائق انسان تھے، انھوں نے کانگریسی حکومت میں وزیر تعلیم کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو باہر نکل آئے، اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ رفیع صاحب سے ملنے آیا ہوں۔ انھوں نے رفیع صاحب کو میرا پیغام پہنچا دیا۔ وہ بلا تکلف کمرے سے باہر نکل آئے۔ بھاری بھرکم جسم اس پر جھاڑ جھول شیروانی اور کافی بڑی مہری کا پائجامہ اور گاندھی ٹوپی زیب تن کئے رفیع صاحب کوئی لالہ گھنشام داس یا متھرا کے پانڈے معلوم ہو رہے تھے۔ جس نے دھوتی کرتے کی جگہ غلطی سے پائجامہ اور شیروانی پہن رکھی ہو۔ چہرہ مہرہ سے کسی قسم کی ذہانت عیاں نہیں تھی۔ بلکہ بھوندو قسم کے بابھن معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آتا تھا کہ یہ موٹے تازے حضرت رفیع صاحب ہی ہیں جن کی خدمت خلق، انتظامی قابلیت، اور احساس ذمہ داری کے چرچے زبان زد خاص و عام تھے۔ اور جن کا لوہا دوست دشمن سبھی مانتے تھے، جو کانگریسی صدر

پنڈت جواہر لال نہرو کے دست راست تھے۔ جنھوں نے بعد ازاں کانگریس کے مرد آہن سردار ولبھائی پٹیل کے مقابلہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کو کانگریس میں کامیاب کرایا تھا۔ اسی زمانے میں بلیا میں ہندو مسلم فساد ہوا تھا۔ فساد ہوئے مشکل سے چار گھنٹے ہوئے تھے کہ رفیع صاحب بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے۔ لکھنؤ سے بلیا تک ڈھائی سو میل کا سفر وہ کار کے ذریعے طے کر کے وہاں پہنچے تھے۔ احساسِ ذمہ داری کا اس سے بہتر مظاہرہ کیا ہو سکتا تھا۔

رفیع صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن وہ ایسے ملے جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ انتہائی بے تکلفی سے گفتگو ہوئی۔ میں مسلم لیگ کا حامی تھا اور وہ کٹر کانگریسی۔ ان کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں میں قول ہی قول ہے عمل بہت کم ہے۔ خدمتِ خلق کا جذبہ مفقود ہے۔ اور ڈرائنگ روم کی سیاست ہے۔ ان کا خیال بڑی حد تک درست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ مابعد میں قائد اعظم کے انتقال کے بعد پاکستان میں ہم حقیقی اسلامی جمہوریت قائم نہیں کر سکے۔ جس کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان بنوایا تھا۔ اور جس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ اور کروڑوں نے اپنا گھر بار چھوڑا۔ میں نے رفیع صاحب سے مسلمانوں کے خلاف کانگریسی وزارتوں کی زیادتیوں کا رونا رویا۔ جس کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے، اور بحیثیت صوبائی وزیر داخلہ وہ ان زیادتیوں کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ بلکہ بعض مقامات پر تو انھوں نے کانگریس کی پالیسی کے خلاف ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ وہ بھی مسلمانوں سے متعلق کانگریس کے رویہ سے شاکی تھے۔ لیکن تنہا کیسے مقابلہ کر سکتے تھے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان بھاری تعداد میں کانگریس میں شامل ہو کر اس کی فرقہ دارانہ پالیسی

پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ مجھ سے مصروف گفتگو رہے، اور ایک نوجوان مسلم لیگی طالب علم کی ذہنیت کو اپنے خیال میں درست کرنے کی انھوں نے کوشش کی۔ جب میں نے ان سے رخصت طلب کی تو انھوں نے بڑے اخلاق سے خدا حافظ کہا۔

راستے بھر میں سوچتا رہا کہ قدرت نے بظاہر اس بھونڈے جسم میں کتنا خلوص۔ کتنا ایثار۔ کام کرنے کا کتنا عزم اور صلاحیت بھر دی ہے۔ موٹے آدمی عموماً تن آسان اور سہل انگار ہوتے ہیں۔ وہ کام سے زیادہ آرام پسند کرتے ہیں۔ لیکن قدوائی صاحب کے معاملے میں معاملہ برعکس تھا۔ وہ مشکل سے مشکل کام میں ہاتھ ڈالتے تھے اور رات دن ایک کر کے اسے پورا کر کے دم لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریسی وزیر اعظم اور ہائی کمان قدوائی صاحب کو وہ کام سپرد کرتے تھے۔ جس میں بڑے سے بڑے جفاوری کانگریسی ناکام ہو جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھارتی حکومت میں غذا کا مسئلہ ہندوستان کے لئے بڑا درد سر بنا ہوا تھا۔ ملک میں غذا کی اتنی قلت تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تیس چالیس کروڑ آدمیوں کا پیٹ کیسے بھرا جائے۔ ساتھ ساتھ غلہ کی چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سے یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہو گیا تھا۔

مرکزی حکومت میں غذا کے تین وزرا یکے بعد دیگرے اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو نے جو قدوائی صاحب کے بڑے مداح تھے اور ان کی صلاحیتوں سے واقف تھے، یو۔ پی سے انھیں بلا کر

مرکزی حکومت میں غذا کا قلم دان سپرد کر دیا۔ قدوائی صاحب نے اپنی فطرت کے مطابق رات دن ایک کر دیا۔ اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا۔ اور غذا کی راشننگ یکلخت منسوخ کر دی۔ ایک غذائی قلت کے ملک میں قدوائی صاحب کا یہ اقدام انتہائی غیر متوقع اور انقلابی تھا۔ لوگوں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ لیکن قدوائی صاحب کی انتھک کوشش آخر کار بار آور ہوئی۔ ذخیرہ اندوزوں اور چور بازار والوں نے اپنے ذخیرے باہر نکالے اور غذائی قلت کے مقابلے میں جہاں تین مرکزی وزیر پہلے ناکام ہو چکے تھے وہاں قدوائی صاحب کامیاب ہوئے۔ سارے ہندوستان اور بیرونِ ہند میں قدوائی صاحب کی بے پناہ انتظامی صلاحیت کی دھوم مچ گئی۔ دوست دشمن سبھی نے اس کا اعتراف کیا۔ اخبارات نے انھیں بھارت کا سب سے بڑا منتظم تسلیم کرتے ہوئے شاندار خراج تحسین ادا کیا۔

قدوائی صاحب مسلمانوں کے سچے ہمدرد تھے۔ در پردہ مسلمانوں کی حتی الامکان مدد کرتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ میں بڑے زور کی ٹھنی ہوئی تھی۔ یو، پی دونوں کی زور آزمائی کا اہم ترین اکھاڑہ تھا۔ مسلمان اور ہندو دو مخالف کیمپوں میں بٹ چکے تھے۔ ہندو کانگریس اور مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ دونوں میں اکثر چپقلش اور فرقہ وارانہ فسادات کی نوبت آتی تھی۔ کانگریسی وزراء مسلمانوں سے اپنی دیرینہ مخاصمت نکالتے رہتے تھے۔ لیکن جب کبھی ایسا موقع آتا، جہاں ہندو مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کرتے اور کانگریس ان کی پشت پناہی کرتی تو قدوائی صاحب

در پردہ مسلمانوں کی حتی الامکان امداد کرتے تھے۔ اور ہندو کانگریسیوں کے اعتراضات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مظلوم مسلمانوں کی حتی الامکان امداد کرتے تھے۔ وہ اتنے دبنگ انسان تھے اور کانگریسی نیتاؤں پر ان کا اتنا رعب تھا کہ کوئی انھیں مسلمانوں کی حمایت کرنے پر ٹوکنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

قیام پاکستان سے قبل جب پاکستان کی جنگ پورے زور شور سے لڑی جا رہی تھی تو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریک پاکستان کا اہم ترین مرکز تھی۔ قائد اعظم نے اُسے ہندی مسلمانوں کے اسلحہ خانہ کا نام دے رکھا تھا۔ کانگریسی ہندوؤں کی نظریں مسلم یونیورسٹی پر لگی ہوئی تھیں وہ اسے نقصان پہنچانے کی آئے دن سازشیں کیا کرتے تھے لیکن قدوائی صاحب نے جو یوپی کے وزیر داخلہ تھے، ہمیشہ اس کے آڑے آتے تھے، اور مسلم یونیورسٹی کو جہاں کے وہ اولڈ بوائے تھے نقصان پہنچانے سے محفوظ رکھتے تھے۔

قدوائی صاحب ایک بڑے مخیر انسان تھے۔ وہ بڑے کنبہ پرور تھے۔ اور سینکڑوں غریب مسلمان طلباء اور نادار مسلمانوں کی خفیہ مالی امداد کیا کرتے تھے، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ وہ غریبوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ کا بیشتر حصہ ناداروں۔ غریبوں اور مستحق طلباء کی امداد پر صرف ہوتا تھا۔ پس انداز کرنا تو الگ رہا، انتقال کے بعد وہ کافی قرضہ چھوڑ کر مرے۔

قدوائی صاحب دل کے مریض تھے۔ ڈاکٹروں کی مخالفت کے باوجود وہ اپنی فطرت کے مطابق سخت محنت کرتے رہے۔ اور جو فرائض ان کو سونپے

گئے تھے ان کو پورا کرنے کے لیے دن اور رات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ آخر کار ان کی صحت گر گئی۔ غالباً ۱۹۵۴ء کی ایک شام کو جب وہ ایک عوامی جلسے میں شرکت کرکے گھر واپس آرہے تھے تو راستہ میں ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور زندگی کی جدو جہد میں کبھی نہ تھکنے والا یہ سپاہی آخر کار موت کے آگے سپر انداز ہو گیا اور اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔

پنڈت نہرو اس وقت چین کا دورہ کر رہے تھے، انھیں قدوائی صاحب کے انتقال کی خبر ہوئی تو وہ سکتے میں آگئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ان کا دایاں بازو ٹوٹ گیا، انھوں نے بے ساختہ کہا: "آج ہندوستان کا عظیم فرزند ہم سے رخصت ہوگیا۔ اس کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے کوئی نہیں پر کر سکے گا۔"

پنڈت نہرو کی حکومت نے بارہ بنکی میں مسولی کے گاؤں کو جہاں رفیع صاحب کا مکان تھا۔ ایک ماڈل گاؤں بنا دیا۔ جس میں زمانہ جدید کی ساری سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ ایک روایت کے مطابق جب قدوائی صاحب کا انتقال ہوا تو ان کا پانچ کمرے کا مکان زیر تعمیر تھا۔ تین کمروں پر چھت پڑ چکی تھی۔ دو کمروں پر چھت پڑنی باقی تھی۔ نہرو جب قدوائی صاحب کی بیوہ سے ملنے مسولی گئے تو انھوں نے مکان کو مکمل کرنے کی پیش کش کی جس کو ان کی بیوہ نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ مرحوم نے زندگی میں کسی کا احسان نہیں لیا تو ان کے مرنے کے بعد میں کیوں احسان لوں۔ چنانچہ آج بھی قدوائی صاحب کا مکان نامکمل ہے۔ جبکہ ان کا گاؤں امریکہ کا کوئی دیہات معلوم ہوتا ہے۔

آج کی مادہ پرست اور نفس پرور دنیا میں اخلاقی قدروں کا بھرم ایسے

ہی بے لوث اور بے نفس انسانوں کے دم سے قائم ہے۔

کاش پاکستان کو ایسے مخلص۔ دیانتدار اور باصلاحیت افراد ملے ہوتے تو آج پاکستان کو یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

ستمبر ۱۹۴۳ء کی ایک شام تھی۔ دہلی کی وسیع گاندھی گراؤنڈ میں لوگوں کا ٹھٹ لگا ہوا تھا جو شہرۂ آفاق مقرر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے آئے تھے، جن کے متعلق غالباً مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار فرمایا تھا:

"شاہ صاحب آپ کی زبان میں سحر ہے۔ اگر آپ نیکی کی تلقین کریں تو عوام کو راہِ راست پر لگا دیں گے اور اگر برائی کا پرچار کریں گے تو لوگوں کو گمراہ کر دیں گے۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی ہند میں مسلم لیگ کا ڈنکا بج رہا تھا۔ پنڈت جواہر جواہر لال نہرو کی مسلم رابطہ تحریک پورے طور سے ناکام ہو چکی تھی، اور کانگریس اسلامی ہند کی سیاست کا میدان چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ بے چارے نیشنلسٹ مسلمان اپنوں کے بجائے بیگانوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح اسلامی ہند کے واحد لیڈر اور مسلم لیگ ان کی واحد قومی جماعت تھی جس کی آواز پر سارا اسلامی ہند

لبیک کہنے کو تیار تھا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری جو جماعت احرار کے عظیم رہنما تھے۔ قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے۔ مسلم لیگ کو وہ نوابوں اور ٹوڈیوں کی جماعت سمجھتے تھے۔ جو مسلمانوں کو گڈھے کی جانب لے جا رہی تھی۔"

گاندھی گراؤنڈ میں لاکھوں اشخاص کا جو سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس میں زیادہ تر مسلمان تھے جو مسلم لیگ کے حامی، اور قائدِ اعظم کے پیرو تھے۔ یہ لوگ عطاء اللہ شاہ بخاری کی سحر بیانی کو سننے آئے تھے اور خدشہ تھا کہ کہیں شاہ صاحب کی شعلہ بیانی اور مسلم لیگ کے خلاف ہرزہ سرائی رنگ نہ لائے اور جھگڑا نہ ہو جائے۔ اسی لیے پولیس بڑی تعداد میں وہاں تعینات تھی اور گشت لگا رہی تھی۔

رات کے آٹھ بجے شاہ صاحب جلسے میں تشریف لائے۔ سارا میدان اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔ شاہ صاحب کی دیو قامت شخصیت ڈائس پر نمودار ہوئی۔ ان کے بھاری بھرکم جسم سے موسیقی کے مدھم سروں کی طرح آہستہ آہستہ آواز نکلنی شروع ہوئی۔ جو رفتہ رفتہ بلند ہوتی گئی۔ اور آخر کار ایک گرج میں تبدیل ہو گئی۔ چار گھنٹے تک وہ گرجتے برستے رہے۔ انھوں نے قائدِ اعظم اور مسلم لیگ کو خوب خوب سنایا۔ اچھی طرح ان کی خبر لی اور پوری طور سے ان کی قلعی کھولی۔ لیکن ان کی تقریر کا سحر لوگوں پر ایسا چھا گیا تھا کہ سارا مجمع دم بخود خاموشی سے ان کی سحر بیانی کو سنتا رہا، اور ایک بھی آواز مخالفت میں بلند نہیں ہوئی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ شاہ صاحب نے

بارہ بجے کے بعد جب اپنی تقریر ختم کی تو ایسا محسوس ہوا کہ ہم لوگ اس سحر سے آزاد ہو گئے جو شاہ صاحب نے سامعین پر کر رکھا تھا۔ راستے بھر ہم شاہ صاحب کی ہرزہ سرائی کا جواب اپنے دل سے دیتے رہے۔ دوسرے دن دوستوں میں زیادہ تر یہی تذکرہ رہا اور شاہ صاحب کے دلائل کی کاٹ ہوتی رہی۔

شاہ صاحب کی سحر بیانی کے تذکرے تو بہت سنے تھے لیکن انھیں بذاتِ خود سننے کا پہلا اتفاق تھا۔ جیسا سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔ واقعی شاہ عطاء اللہ بخاری اس صدی کے عظیم ترین مقرروں میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ شاہ صاحب ایک فقیر منش انسان تھے۔ املاک اور استعماریت سے انھیں ہمیشہ نفرت رہی۔ انھوں نے برطانوی استعمار، ان کے حواریوں اور ٹوڈیوں کی ہمیشہ مخالفت کی۔ ان کی زبان نے نوابوں اور خان بہادروں کی ہمیشہ کاٹ کی۔ وہ زندگی بھر غریب عوام اور اسلام کے پرجوش مبلغ رہے۔ مجلس احرار کے ایک اہم ستون ہونے کی وجہ سے انھوں نے مسلمانانِ پنجاب میں سیاسی اور مذہبی بیداری پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

شاہ صاحب ۱۸۹۱ء میں پٹنہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حافظ ضیاء الدین احمد اور دادا کا نام سید نور الدین احمد تھا۔ ان کے دادا کشمیر سے جا کر پٹنہ میں آباد ہو گئے تھے۔ شاہ صاحب تین سال کے تھے کہ ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔
شاہ صاحب جب سنِ بلوغت کو پہنچے تو نانا کے ساتھ امرتسر تشریف لائے۔ جہاں انھوں نے مولانا نور احمد پسروری، مفتی محمد حسن صاحب اور مولانا غلام مصطفیٰ صاحب قاسمی سے کسبِ علوم دینیہ کی تکمیل کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب برطانوی حکومت نے ہندوستان میں رولٹ ایکٹ نافذ کیا تو سارے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی، جو آخر کار جلیانوالہ باغ کے عظیم المیہ میں انجام پذیر ہوئی۔ اس واقعہ نے شاہ صاحب کو سیاست کے میدان میں لاکھڑا کیا۔ اور شاہ صاحب نے اپنی سحر بیانی سے ملک کے گوشے گوشے میں آگ لگادی۔

شاہ صاحب حقیقی معنوں میں ایک عوامی انسان تھے۔ انھوں نے زندگی بھر کھدر کا لباس زیب تن کیا اور موٹا جھوٹا کھایا۔ تہبند کو سرکار دوجہاں کا لباس سمجھ کر ہمیشہ پہنا کرتے تھے۔ جہاں کہیں جاتے تو مسجد میں ٹھہرتے، یا اپنے کسی غریب عقیدت مند کے یہاں قیام کرتے۔ امیروں سے وہ دور بھاگتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ شاہ صاحب کو اپنے یہاں مہمان ٹھہرانے کی استدعا کرتے، لیکن شاہ صاحب ہمیشہ ٹال جاتے تھے۔ کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ علماء کی بے حد عزت و تکریم فرماتے تھے۔ جب تک زندہ رہے اتحاد بین المسلمین کے لئے کوشاں رہے۔

شاہ صاحب کو علم وادب اور شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ انھیں عربی۔ فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ خود بھی بڑے پر مغز شاعر تھے۔ ان کی تقاریر ادبی لطائف اور موزوں اشعار سے پُر ہوتی تھی۔ ان میں آواز کے جادو کے ساتھ ساتھ زبان اور بیان کی سحر انگیزی بھی ہوتی تھی۔

برطانوی استعمار کے خلاف شاہ صاحب نے پچاس سال تک مسلسل جنگ کی۔ ان کی پرجوش خطابت نے ہندوستان سے انگریزوں کے قدم اکھاڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جس کی پاداش میں انھیں کئی بار قید وبند کی صعوبتیں برداشت

کرنی پڑیں اور زندگی کے گیارہ بیش قیمت سال جیل کی چہار دیواری کے پیچھے گزار دیئے۔
شاہ صاحب کا یہ قول مشہور ہے! میں دنیا میں صرف ایک چیز سے محبت کرتا ہوں اور
وہ ہے قرآن اور صرف ایک چیز سے نفرت کرتا ہوں وہ ہے انگریز۔

شاہ صاحب نے ۶۳ سال کی عمر میں ۲۱ر اگست ۱۹۶۱ء کو وفات پائی۔
اور اس طرح اس ہنگامہ خیز زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ جس کی تقریروں سے قصر استعمار
میں بارہا زلزلہ آجاتا تھا۔

۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے المیہ نے شاہ صاحب کو ایک مبلغ سے ایک
سیاسی رہنما بنادیا۔ اسی سال دسمبر میں امرتسر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔
جس میں علی برادران گاندھی جی۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ ابوالکلام آزاد۔ حکیم اجمل خاں
ایسے عظیم رہنما شریک ہوئے۔ برطانوی استعمار کے خلاف بڑی دھواں دھار
تقاریر ہوئیں۔ لیکن شاہ صاحب کی شعلہ بیانی کے سامنے ساری تقاریر ماند
پڑگئیں۔ اور اس نے سامعین کے زبردست اجتماع میں ایک آگ لگا دی۔
سارے ہندوستان میں شاہ صاحب کا ڈنکا بجنے لگا۔ بغاوت کے اس
سیلاب کو روکنے کے لئے ۲۷ر مارچ ۱۹۲۱ء کو تین بجے شب میں شاہ صاحب
کو گرفتار کرلیا گیا۔ تین سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ جس میں تین ماہ قید
تنہائی میں رکھنے کا حکم دیا گیا۔

شاہ صاحب قید سے جب ۲۱ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کو رہا ہوئے تو ہندوستان
میں شدھی سنگھٹن کی تحریک زوروں پر تھی برطانوی حکومت نے خلافت کانگریس
تحریکوں کے اشتراک عمل کے تحت ہندو مسلمانوں کے مثالی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لئے

پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند سے ساز باز کر کے شدھی سنگھٹن تحریک کو ہوا دی تھی جس کی بنا پر ہندوستان کے طول وعرض میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ شاہ صاحب جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی فضا بالکل بدلی ہوئی تھی۔ ہندو کانگریس اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو چکی تھی۔ مسٹر گاندھی مہا سبھائیوں اور خصوصاً پنڈت مدن موہن مالویہ کی مخالفت کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ ستمبر ۱۹۲۲ء کو ملتان میں اور ۱۰ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو کوہاٹ میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں ہندو مسلم فسادات برابر ہو رہے تھے۔ کوہاٹ کے فسادات کے خلاف بطور احتجاج گاندھی جی نے ۸ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی کی تحریک کے تحت ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۴ء کو دہلی میں ہندو مسلم اتحاد کانفرنس منعقد ہوئی۔ جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ شاہ صاحب نے ہندو مسلم فسادات کی ساری ذمہ داری انگریزوں کے سر ڈالی جو درحقیقت شدھی سنگھٹن تحریک کے محرک اور معاون تھے اور خفیہ طور پر ان کی مادی اور مالی امداد کر رہے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی دھواں دھار تقاریر میں انگریزوں کی اس سازش کو پوری طور سے بے نقاب کیا۔ جس کی بنا پر ۲۵ر جنوری ۱۹۲۵ء کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں چھ ماہ قید با مشقت اور پانچسو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ قید سے رہائی کے بعد شاہ صاحب کو جب معلوم ہوا کہ ان کی جرمانے کی رقم محلہ والوں نے ادا کر دی ہے تو انھیں سخت افسوس ہوا کہ حلال کی کمائی انگریزوں کے خزانے میں کیوں گئی اور کئی دن تک محلے والوں سے خفا رہے۔

شدھی سنگھٹن تحریک جب شدت اختیار کر گئی اور یہ محسوس ہونے لگا کہ ہندو مسلم اتحاد اب قصہ پارینہ ہو کر رہ گیا ہے اور آئندہ اس کی امید کرنا لاحاصل ہے، کانگریس کے ہندو اکابرین بھی اس معاملہ میں بے بس نظر آتے تھے اور انھوں نے ہاتھ پیر ڈال دیئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ہندو فرقہ پرستوں کے سامنے سپر ڈال دیا ہے یا وہ بھی در پردہ اس سازش میں شریک ہیں تو متعدد خلافتی رہنما بھی کانگریس سے بدظن ہو گئے اور نہرو رپورٹ شائع ہونے پر علی برادران اور مولانا حسرت موہانی ایسے قومی رہنماؤں نے جنھوں نے کانگریس کو ایک فعال جماعت بنایا تھا کانگریس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

شاہ صاحب نے بھی جب دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے تو انھوں نے بھی ہندو مہا سبھائیوں اور فرقہ پرستوں کو انھیں کی زبان میں جواب دینے کا ارادہ کیا۔ متعدد ہندو فرقہ پرستوں نے جن میں سوامی شردھانند اور راجپال خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ناموس رسولؐ پر حملے کیے تھے۔ شاہ صاحب کے لئے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ جو فخر انسانیت اور رسول اکرمؐ پر اپنی جان چھڑکتے تھے بھلا ہندو فرقہ پرستوں کی یہ دریدہ دہنی کو کیسے گوارا کر سکتے تھے، انھوں نے ان ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف دھواں دھار تقاریر کر کے سارے ملک میں آگ لگا دی۔

راجپال کی کتاب کے خلاف جس میں سرورِ کائنات فخر موجودات کی توہین کی گئی تھی ۴ر جنوری ۱۹۲۷ء کی شب میں مسلمانانِ لاہور نے ایک اجتماع دہلی دروازہ سے متصل باغ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دن لاہور کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے

شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ فیصلہ کیا گیا کہ یہ جلسہ میاں عبدالرحیم کے احاطہ میں کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مقررین میں مفتی کفایت اللہ، مولانا حبیب الرحمٰن چودھری افضل حق اور شاہ عطاء اللہ بخاری تھے۔ جلسہ شروع ہوا تھا کہ ڈپٹی کمشنر گارد لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس کے انتباہ کے باوجود شاہ صاحب نے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ انھوں نے کہا:

"آج ہم فخر رسل خاتم الانبیاء کی ناموس برقرار رکھنے کے لئے جمع ہوئے ہیں بنی نوع انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل القدر ہستی کی عزت خطرے میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر سارے موجودات کو ناز ہے۔"

سارے اجتماع پر سکوت طاری تھا۔ سامعین مکمل خاموشی سے شاہ صاحب کی مسحور کن تقریر سنتے رہے لیکن جب انھوں نے ناموس رسولؐ کے تحفظ کے لئے اپیل کی تو سارا مجمع ایک آتش فشاں بن گیا جو پھٹ پڑنے کے لئے بے قرار تھا۔

غرضکہ ہندوستان نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایسے شعلہ فشاں اور سحر بیان مقرر بہت کم پیدا کئے ہیں۔

ظفر علی خاں

بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاں ایک جامع الصفات انسان تھے۔ شاعر۔ ادیب۔ مترجم۔ سیاست داں اور سب سے بڑھ کر وہ ایک نڈر صحافی اور شعلہ بیاں مقرر تھے۔

قیامِ پاکستان سے کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں سالانہ محفلِ میلاد منعقد کی گئی تھی۔ مولانا ظفر علی خاں کو اس میں تقریر کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ میں بھی اس زمانے میں اس اسکول کا طالب علم تھا۔ مولانا کو دیکھنے اور ان کی تقریر سننے کا میرا پہلا اتفاق تھا۔ تقریر سے پہلے مولانا کی مشہور نعت:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز چمکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

ایک لڑکے نے بڑی خوش الحانی سے پڑھی جس کو سن کر ساری محفل وجد کرنے لگی۔

مولانا ظفر علی خاں جب تقریر کرنے کیلئے کھڑے ہوئے تو سامعین نے اشتیاق اور توجہ سے ان کی تقریر سنی سرکار دو عالم کی سیرت اور مولانا ظفر علی خاں ایسے شعلہ نوا مقرر کا بیان محفل پر عجب سماں طاری تھا۔ آں حضرت کا اسوہ حسنہ۔ ان کا خلق عظیم، ان کی رواداری اور ان کا خلوص وایثار یہ بذات خود ایسی حکایتیں ہیں جو پتھر سے پتھر دل کو موم کر دیتی ہیں اور اس پر مولانا کی جادو بیانی نے سامعین کے قلوب کو ہلا کر رکھ دیا، اور ان کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا۔

مولانا ظفر علی خاں کو اس کے بعد کئی بار دیکھنے اور ان کی تقاریر سننے کا اتفاق ہوا۔ میں نے ان کی متعدد سیاسی تقریریں سنیں۔ ان کی تقاریر میں تندی اور تیزی تو بہت ہوتی تھی۔ لیکن تسلسل اور ربط سے وہ خالی ہوتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ بجلی چمک رہی ہے اور بادل گرج رہے ہیں لیکن بارش کی نوبت نہیں آتی۔

ظفر علی خاں ۱۸۷۳ء میں گجرانوالہ کے دیہات کرم آباد میں پیدا ہوئے۔ اینگلو محمدن کالج علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر انھوں نے ریاست حیدرآباد کے محکمہ داخلہ میں بحیثیت اسسٹنٹ سکریٹری ملازمت کر لی۔ لیکن جلد ہی انھیں اس ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ انھوں نے حیدرآباد میں ایک اطالوی کمپنی کے حیا سوز رقص کے بائیکاٹ کی پرزور حمایت کی تھی۔ ریاست کے انگریز ریزیڈنٹ سر مائیکل وڈ واڑ نے اس بات پر حکومت ہند سے مولانا کی شکایت کر دی۔

مولانا کے والد مولوی سراج الدین نے ۱۹۰۳ء میں اپنے گاؤں کرم آباد سے

ایک ہفتہ وار اخبار "زمیندار" جاری کیا۔ والد کے انتقال کے بعد ۱۹۰۹ء میں ظفر علی خاں اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور بعد ازاں ۱۹۱۰ء میں انھوں نے اس اخبار کو لاہور منتقل کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں یہ اخبار روزنامہ ہو گیا۔ ۱۹۱۴ء میں جب مولانا انگلستان گئے تو انھوں نے وہاں ہندوستانی پریس قوانین کی سخت مخالفت کی۔

سر مائیکل وڈ وائر جو اس وقت پنجاب کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ ظفر علی خاں سے ذاتی مخاصمت رکھتے تھے۔ مولانا نے کیمبلپور میں ایک تقریر کی تھی جس کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور مولانا کو پانچ سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ بعد ازاں ان کی سزا نظر بندی میں تبدیل کر دی گئی۔

بابائے اردو صحافت مولانا ظفر علی خاں اپنے زمانہ کے چوٹی کے مسلمان صحافیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا شمار مولانا محمد علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد مولانا حسرت موہانی اور جالب دہلوی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں روزنامہ زمیندار کو فروغ دینے پر صرف کر دیں، جو جلد ہی برصغیر کے ممتاز ترین اردو اخبار میں شمار کیا جانے لگا۔ انھوں نے اس اخبار کے نام کے برخلاف اسے دنیائے اسلام اور اسلامی ہند کی فلاح و بہبود اور ترویج و ترقی کے لئے وقف کر دیا۔

اسی اخبار سے ملک کے متعدد عظیم صحافیوں اور ادیبوں کو منسلک رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان میں مولانا عبداللہ عمادی۔ مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی۔ منشی وجاہت حسین جھنجھانوی۔ علامہ نیاز فتحپوری۔ عبدالمجید سالک۔ غلام رسول مہر۔ چراغ حسن حسرت۔ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش اور حمید نظامی شامل ہیں۔ اس

طرح ظفر علی کے اخبار نے مسلم صحافیوں اور ادیبوں کے تربیتی ادارہ کا کام سرانجام دیا۔ جس طرح مولانا محمد علی جوہر جو لیڈر (قائد) گر تسلیم کیے گئے ہیں، مولانا ظفر علی خاں صحافی گر مشہور ہیں۔ دونوں نے اپنے اپنے دائرہ میں نوجوانوں کو ابھرنے اور ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کیے، اور ان کی صحیح تربیت کے انتظامات کیے۔

مولانا ظفر علی خاں کی شعلہ افشانی جوان کے اخبار زمیندار سے مترشح ہوتی تھی، برطانوی سامراج اور ان کے برسر اقتدار پٹھوؤں کے لئے دردِ سر بنی رہتی تھی۔ یہ اخبار حکمران طبقہ کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ متعدد بار اس کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۹۱۱ء میں اسے دو ہزار روپے کی ضمانت داخل کرنے کا حکم ہوا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۹ء تک ۳۸ سال کے عرصہ میں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب سال گزرا ہو گا جب اس اخبار کی ضمانت ضبط نہ ہوئی ہو۔ اس طرح یہ اخبار مسلسل طور پر حکمراں طبقہ کی مشقِ ستم کا شکار رہا۔ لاکھوں روپے جرمانہ ادا کیے۔ لیکن یہ بھی اتنا مقبول اور سخت جان تھا کہ بادِ مخالف کے تند جھونکے اس کو نہ بجھا سکے۔ اس کی چوٹی پر تحریر کردہ ظفر علی خاں کا یہ شعر اس حقیقت کی پوری طور سے ترجمانی کرتا تھا:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حکومت کی اس قسم کی سختیاں مولانا ظفر علی خاں کے آہنی عزم کو متزلزل

نہیں کرسکیں بلکہ اسے اور پختہ کرنے کا باعث ہوئیں۔ مولانا ایک آتش نوا شاعر اور منفرد اور انتہا پسند ادیب اور رہنما تھے۔ ان کے سیاسی اور ذاتی عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے لیکن ان کا خلوص ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں خلافت تحریک کے اہم رہنما تسلیم کئے جاتے تھے۔ ان کے اخبار نے خلافت تحریک کو فروغ دینے اور اسلامی ہند کی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور میں برطانوی فوج کی فائرنگ کے خلاف ان کے اخبار نے بھرپور جہاد کیا۔ بعد ازاں مولانا کانگریس میں شامل ہو گئے، ۱۹۳۰ء تک اس کے ساتھ رہے۔ اس دوران میں انھوں نے متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

کانگریس کی ہندو نواز پالیسیوں کی وجہ سے آخر کار ۱۹۳۱ء میں انھوں نے اس جماعت سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ لاہور کی مسجد شہید گنج کی تحریک میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ پنجاب میں وہ قائداعظم کے دست بازو تھے، اور ان کے زمیندار نے پنجاب میں مسلم لیگ کو روشناس کرانے اور مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر وہ ہندوستان کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے، لیکن درازی عمر کی وجہ سے وہ تحریک پاکستان میں پرجوش حصہ نہیں لے سکے۔

غالباً ۱۹۳۶ء میں ظفر علی خاں نے ایک اخباری نمائندے کو بیان دیتے ہوئے کہا:

"میں قوم پرستی میں اعتقاد رکھتا ہوں لیکن میری اور مسٹر گاندھی کی قوم پرستی

میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ میری قوم پرستی کی بنیاد عالمی برادری اور اسلام کی اخوت۔ مساوات اور بھائی چارہ کے اصول پر رکھی گئی ہے۔ مغربی سامراجیوں کی قوم پرستی سے متعلق نظریات کی وجہ سے دنیا طبقاتی مناقشات اور اختلافات کا شکار ہو گئی ہے۔ لیکن اسلامی قومیت نسلی اور جغرافیائی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان دنیا میں ہر قسم کی نسلی اور جغرافیائی گروہ بندیوں کا مخالف ہے۔" بقول اقبال ؎

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ملت

مولانا ایک قادر الکلام شاعر اور ادیب تھے۔ وہ دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں سیر ظلمات۔ خیابان فارس۔ جنگل میں منگل۔ اسرار لندن۔ شامل ہیں، جو حیدر آباد دکن میں شائع ہوئیں۔ ان کا شمار اردو زبان کے عظیم ترین مترجموں میں ہوتا ہے۔ بقول حسن نظامی: "ظفر علی خاں بہ حیثیت مترجم کے اپنا ثانی نہیں رکھتے۔" انھوں نے کپلنگ کی مشہور تصنیف جنگل بک JUNGLE BOOK کا بہترین ترجمہ "جنگل میں منگل" نامی کتاب میں کیا ہے۔ ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا میں انھوں نے جو مضامین لکھے ان کا مجموعہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔

ظفر علی خاں ایک بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر تھے۔ انھوں نے بہت مشکل بحروں میں بڑے جاندار اشعار کہے ہیں۔ ان کی نظموں کے متعدد مجموعے بہارستان۔ نگارستان اور چمنستان کے نام سے لاہور سے شائع

ہوتے ہیں۔ طنزیہ شاعری میں اکبر الہ آبادی کے بعد وہ اردو کے سب سے بڑے طنز نگار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس صنف شاعری میں ان کا اپنا علیحدہ رنگ ہے۔ ان کی طنزیہ شاعری کی خصوصیات اس کا اختصار۔ سادگی اور کاٹ ہے۔ وہ اشعار میں مزاحیہ خاکے کھینچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ماحول کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ انگریزی شاعر ٹینی سن کی طرح وہ اپنے دور کی حقیقی پیداوار تھے۔

مولانا کا نعتیہ کلام بہت مقبول اور بلند پایہ ہے۔ وہ سچے عاشقِ رسولؐ تھے اور اسی لئے ان کے نعتیہ اشعار جو ان کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ سامعین کے قلوب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ ان کی مشہور نظم ایک رشی کی کہانی راجہ دشرتھ کی زبانی" اردو زبان کی چند مقبول ترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ جس کو پڑھ کر بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

غرضکہ مولانا ظفر علی خاں اسلامی ہند میں اپنے عہد کی عظیم ترین اور جامع الکمالات شخصیتوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ اور صرف پیغمبر اسلام کی محبت اور انگریزوں کی مخالفت میں وہ انتہائی ثابت قدم رہے۔

خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

مولانا آزاد سبحانی

بہت عرصہ ہوا۔ پاکستان نہیں بنا تھا۔ میں فیض آباد (یو۔پی) میں منشی فیاض علی صاحب ایڈووکیٹ کی عالی شان کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ فیاض علی صاحب بھی اپنے چند احباب کے ساتھ وہاں رونق افروز تھے۔ ملکی سیاست پر اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں اس وقت کوچہ سیاست کا طفلِ مکتب تھا۔ میں نے دیکھا کہ سڑک پر سے کوٹھی میں ایک درویش صفت بزرگ داخل ہو رہے ہیں۔ پستہ قد۔ خشخشی ڈاڑھی، ننگے سر۔ تہبند اور شلوکہ زیب تن کئے اور پیر میں جوتی پہنے چٹ چٹاتے چلے آ رہے ہیں۔ قریب پہنچ کر انھوں نے ایک عدد السلام علیکم داغ دیا۔ فیاض صاحب اور ان کے احباب سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ فیاض صاحب نے سوال کیا:

"مولانا کب تشریف لائے؟"

"ابھی چلا آ رہا ہوں۔" مولانا نے بڑی لاپروائی سے جواب دیا۔ اور

ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

یہ مولانا آزاد سبحانی سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مولانا کی آمد سے سیاست کے بے جان موضوع میں جان پڑ گئی اور مولانا کے تبحر علمی اور انداز گفتگو کا گہرا نقش لے کر میں وہاں سے رخصت ہوا۔

دوسرے دن نماز عشاء کے بعد مولانا آزاد سبحانی نے ایک جلسے سے خطاب کیا۔ تقریر نیم سیاسی اور مذہبی تھی۔ تقریر کیا تھی معلومات اور خطابت کا ایک دریا ابل رہا تھا جو قلوب کو اپنی جانب بہائے لئے جا رہا تھا۔ خطابت معلومات اور دلائل کا ایسا حسین امتزاج جیسا مولانا آزاد سبحانی کی تقریروں میں پایا جاتا تھا۔ میں نے کسی دوسرے شخص کی تقریر میں نہیں پایا۔

مجھے تقادیر سننے کا شوق ہی نہیں خبط ہے۔ تعلیمی زندگی کا زیادہ حصہ الہ آباد میں گزرا ہے جو ہندوستان کا سب سے اہم سیاسی مرکز تھا۔ کانگریس کا مستقر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اسلامی ہند کی سیاست کا بھی اہم ترین مرکز تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے جب سے اپنی شاندار کوٹھی سوراج بھون کانگریس کو نذر کردی تھی اس وقت سے اس کوٹھی میں آل انڈیا کانگریس کا صدر دفتر تھا۔ اسلامی ہند کی سیاست میں بھی الہ آباد کو اہم مقام حاصل ہے۔ مسلم لیگ کے ۱۹۳۰ء کے سالانہ اجلاس میں جو اسی شہر میں منعقد ہوا تھا شاعر اسلام علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا اور ۱۹۴۲ء میں اسی شہر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں قائد اعظم۔ نواب بہادر یار جنگ اور رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی نے اپنی دلولہ انگیز تقریروں سے تصور پاکستان کو جلا بخشی تھی۔

میں نے اس شہر الہ آباد میں گاندھی جی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت جواہر لال
نہرو۔ سر سری نواس شاستری۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ سوبھاش چندر بوس۔
راجگوپال آچاریہ۔ ستیہ مورتی۔ بھولا بھائی ڈیسائی۔ سر تیج بہادر سپرو۔ قائداعظم
جناح۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا عبد الماجد بدایونی۔ نواب
بہادر یار جنگ۔ مولانا ابو الکلام آزاد۔ ظفر علی خاں اور مولانا آزاد سبحانی ایسے
عظیم مقرروں کی تقریریں سنیں۔ لیکن جو جذبہ اور والہانہ پن مجھے آزاد سبحانی
کی تقاریر میں ملا کسی دوسرے مقرر کے یہاں دستیاب نہ ہو سکا۔ ان کی تقریروں
کا دھیما لیکن استدلالی انداز ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے
الفاظ سامعین کے قلوب میں اترتے چلے جارہے ہیں۔

مولانا آزاد سبحانی کو اس کے بعد متعدد بار مجھے دیکھنے۔ ملنے اور سننے
کا اتفاق ہوا۔ فیض آباد میں درجنوں بار ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ بہت سادہ
اور بے تکلف قسم کے بزرگ واقع ہوئے تھے۔ اور اپنے اعزاز میں کسی قسم کے
تکلف کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کے اسلامی
ہند میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی قلندرانہ شان مولانا آزاد سبحانی اور مولانا
حسرت موہانی ایسے بزرگوں کی ذات سے قائم تھی۔ یہ دونوں بزرگ درحقیقت
اقبال کے مرد قلندر کی زندہ تفسیر اور چلتی پھرتی تصویر تھے۔

مولانا آزاد سبحانی ضلع بلیا (یو پی) کے گاؤں سکندر پور میں پیدا
ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ زندگی کا زیادہ حصہ گورکھپور میں گزرا۔
اسی لئے عام طور سے وہ گورکھپوری خیال کئے جاتے تھے۔ مولانا مدرسہ الٰہیات کانپور

میں فلسفہ اور عربی کے استاد تھے۔ اگست ۱۹۱۳ء میں جب مچھلی بازار کانپور کا المناک سانحہ ہوا تو مولانا اس مدرسہ سے متعلق تھے۔ مسٹن روڈ کانپور پر واقع اس مسجد کے ایک حصہ کو ڈھا کر حکومت سڑک کو کشادہ کرنا چاہتی تھی۔ اس سے متصل جو مندر سڑک کے بیچو بیچ واقع تھا حکومت نے اس سے کوئی تعارض نہیں کیا۔ مسلمانانِ کانپور کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ مسجد کے سانحہ سے ایک روز قبل مولانا آزاد سبحانی کی ولولہ انگیز تقریر نے مسلمانوں میں آگ لگادی اور مسجد کے لئے جان دینے پر آمادہ ہو گئے۔ مسلمان مرد۔ عورتیں بچے مسجد میں جمع ہو گئے۔ وہ مسجد چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھے۔ جس پر ٹائگر TIGER نامی مجسٹریٹ نے گولی چلانے کا حکم دیا۔ سینکڑوں مسلمان، مرد۔ عورتیں بچے شہید ہوئے۔ اس کے بعد گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ مولانا آزاد سبحانی بھی گرفتار ہوئے۔ اس سانحہ نے سارے ملک میں ہیجان برپا کر دیا۔ سر جیمس مسٹن اس وقت یوپی کے لفٹننٹ گورنر تھے۔ مسلمانوں نے ایک ڈفنس کمیٹی قائم کی جس میں ملک کے نامور مسلمان قانون داں شامل تھے۔ ان میں سر شاہ محمد سلیمان، مظہر الحق۔ ناظر حسن بیرسٹر لکھنو۔ اور سر راس مسعود خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا محمد علی ایک مشن کے سربراہ کی حیثیت سے لندن گئے اور انھوں نے انگریز عوام کو اس سانحہ سے متعلق ظلم و تشدد سے آگاہ کیا۔ جس سے حکومت برطانیہ سخت پریشان ہوئی۔ گرفتار ہونے والوں کو فوری طور پر رہا کر دیا گیا۔ مرنے والوں کو خاطر خواہ معاوضہ دیا گیا۔ اور مسجد ڈھانے کے بجائے سڑک کا فٹ پاتھ مسجد کے نیچے تعمیر کیا گیا۔ اوپر مسجد کا وضو خانہ تھا، اور

نیچے فٹ پاتھ۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس سانحہ پر ایک معرکۃ الآرا نظم لکھی۔ جس کا ایک مصرعہ ہے: "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں"

مولانا آزاد سبحانی بعد ازاں مسجد الٰہیہ کانپور سے الگ ہو گئے۔ وہ خلافت تحریک میں شامل ہو گئے، اور اس میں پیش پیش رہے۔ مولانا کی سادہ زندگی اور زور خطابت نے مسلمانان ہند کو خلافت سے وابستہ کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ درحقیقت مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا آزاد سبحانی اور مولانا حسرت موہانی ایسے صاحب علم، صاحب نظر اور صاحب کردار زعماء نے اس تحریک کو اسلامی ہند میں انتہائی مقبول بنایا اور مسلمانوں میں وہ بیداری پیدا کی جو آخر کار حصول پاکستان میں ممد و معاون ہوئی۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح مثالی کردار رکھنے والے ان قائدین کی زندگی مسلم عوام کے لئے انتہائی کشش اور جاذبیت کا باعث تھی۔ آج کل کے مسلم لیڈروں کے برعکس ان کے اقوال اور اعمال میں کوئی تضاد پایا نہیں جاتا تھا۔ خدائے قدوس کے سوا ان کا سر کسی کے سامنے نہیں جھکا، اور حق بات کہنے سے انہیں کسی قسم کی ترغیب یا خوف باز نہیں رکھ سکتا تھا۔

غالباً ۱۹۲۱ء کی بات ہے۔ خلافت اور کانگریس کی قرار دادوں کے تحت حکومت برطانیہ سے عدم اشتراک کی تحریک ہندوستان میں شباب پر تھی۔ سرکاری ملازمین دھڑا دھڑ اپنی ملازمتوں سے استعفیٰ دے رہے تھے۔ زندگی کی آسائشوں اور مستقبل کی تابناکیوں کی پرواہ کئے بغیر وہ قوم اور ملک کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ ہندو مسلمانوں میں ایسا جذبہ شاذ و نادر

ہی کبھی دیکھنے میں آیا تھا۔ اس تحریک میں انگریزی اسکولوں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ چنانچہ علی برادران۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا آزاد سبحانی اپنی مادر درسگاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بند کرانے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔ وہاں تین دن تک اس کے متعلق بحث و مباحثہ اور تقریریں ہوتی رہیں۔ یونیورسٹی کے خیر خواہ اساتذہ اور طلباء، دو جماعتوں میں بٹ گئے تھے۔ زیادہ تعداد ان لوگوں کی تھی جو یونیورسٹی کو بند کردینے کے مخالف تھے۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری اور مولانا حسرت موہانی نے بڑی دھواں دھار اور جوشیلی تقریریں کیں اور یونیورسٹی میں مروج انگریزی طرز تعلیم کو ہندوستانی نوجوانوں کے لئے ضرر رساں اور مہلک قرار دیا۔ لیکن طلباء اور اساتذہ پر اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا، اور وہ یونیورسٹی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ تیسرے دن مولانا آزاد سبحانی اسٹیج پر نمودار ہوئے انھوں نے اتنی درد انگیز اور مدلل تقریر کی جس کو سن کر سامعین کے آنسو جاری ہو گئے۔ بہت سے طلباء اور اساتذہ جن میں ڈاکٹر حسین خاں (جو بعد میں ڈاکٹر ہوئے) بھی شامل تھے۔ یونیورسٹی سے باہر نکل آئے، اور اس طرح علی گڑھ میں قومی درسگاہ جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑی۔

روشن باغ الہ آباد میں شہر کے مشہور وکیل مولوی غلام مجتبیٰ جعفری صاحب مچھلی شہری کی عالی شان کوٹھی کا باہری کمرہ طلباء کے لئے وقف تھا۔ مولوی صاحب بڑے کنبہ پرور انسان تھے، جونپور اور اعظم گڑھ کے طلباء جو حصول علم کے لئے الہ آباد آتے تھے اکثر اسی کمرہ میں قیام کرتے تھے۔ اس میں قیام

کرنے والوں میں ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان۔ کرنل عون جعفری وغیرہ بھی تھے۔ غالباً ۱۹۲۸ء کی بات ہے، مولوی غلام مجتبیٰ صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ ان کے صاحبزادے مولوی ابوالحسن جعفری ایڈوکیٹ ان کے تنہا وارث تھے۔ اگست کا مہینہ اتوار کا دن تھا۔ اس کمرے میں ہادی مچھلی شہری۔ اصغر گونڈوی۔ مولانا آزاد سبحانی۔ ریاض الحسن صاحب (جو بعد میں ڈاکٹر ہو گئے) اور ابوالحسن جعفری صاحب مصروفِ گفتگو تھے۔ جہاں چند شعرا جمع ہوجائیں وہاں شعروشاعری کی محفل گرم ہونا یقینی ہوتی ہے۔ ہادی مچھلی شہری نے سب سے پہلے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد اصغر صاحب کی باری آئی۔ بعدازاں حاضرین نے مولانا آزاد سبحانی سے درخواست کی کہ وہ بھی اپنے کلام سے محفل کو محظوظ کریں۔ پہلے تو مولانا انکار کرتے رہے، کہنے لگے۔ سیاست نے مجھے شعروشاعری سے بے بہرہ کردیا ہے۔ لیکن جب اصرار بڑھا تو راضی ہو گئے، اور انھوں نے ایک بڑی جاندار غزل سنائی۔ ان کا عارفانہ کلام سن کر اصغر صاحب بھی پھڑک اٹھے۔ اس کے دو اشعار ہیں:

خاک پا بن کے درِ یار پہ جانا ہے مجھے
اپنی مٹی کو ٹھکانے سے لگانا ہے مجھے

پا برہنہ ہوں، سفر وادیٔ ایمن درپیش
اک چراغ اور سرِ طور جلانا ہے مجھے

دشت میں آیا ہوں صحرا کے بگولے دوڑو

دوسرا مصرعہ یاد نہیں آتا۔

مولانا کا کلام بہت شستہ ہوتا تھا۔ عارفانہ رنگ غالب تھا۔

مولانا آزاد سبحانی نے ۳۱-۱۹۳۰ء میں گورکھپور میں تحریک ربانی شروع کی جس کا مقصد مختلف پیشہ ور مسلمانوں کو ان کے پیشہ کے مطابق متحد کرنا اور ان میں اسلامی روح کو بیدار کرنا تھا۔ وہ مسلمانوں کو مذہبی اور معاشی اصلاحات کے ذریعے باعمل بنانے اور ان کی مذہبی اور اخلاقی زندگی کو استوار کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو سادہ زندگی بسر کرنے اور کھدر پہننے کی تلقین کی۔ انھوں نے مسلمان کاریگروں کو ان کے پیشہ کے مطابق منظم کیا اور ان کی گلڈ (جماعت) بنائی سب سے پہلے انھوں نے کپڑے کے کاریگروں کی گلڈ بنائی۔ بعد ازاں صرف کاریگروں کی باری آئی۔ مولانا کی یہ تحریک یوپی کے مشرقی اضلاع اور خصوصاً گورکھپور میں بہت مقبول ہوئی۔

تحریک ربانی کی تحریک کے تحت مولانا اسلام کے اصولوں کو مسلمانوں کی ذاتی زندگی میں برتنا چاہتے تھے۔ تاکہ صحیح اسلامی معاشرہ ظہور پذیر ہو۔ اس تحریک کے تحت دس بارہ اصول پیش کئے گئے۔ گھر گھر جاکر دیکھنا کہ کوئی بھوکا نہ رہے۔ اسراف بیجا اور خصوصاً سگریٹ نوشی سے پرہیز کرنا۔ محلوں میں ہفتہ وار اجتماع کرنا اور اس میں معاشرتی معاملات پر تبادلۂ خیال کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولانا نے غالباً ۳۴-۱۹۳۳ء میں لندن کا سفر کیا تھا، اور تقریباً چھ ماہ تک وہاں مقیم رہے۔ اور اسی سادگی اور غربت سے وہاں بھی زندگی گزارتے رہے۔ وہ بہت سادگی پسند انسان تھے۔ چشمہ لگاتے تھے۔ تہبند باندھتے اور چادر اکثر اوڑھے رہتے تھے۔ بازو سے کھدر کا تھیلا لٹکا ہوتا تھا، جس میں ان ضروریات کی اشیاء کے علاوہ کتابیں بھی ہوتی تھیں۔ الہلال قاہرہ کا پرچہ

ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ بڑے جفاکش انسان تھے، اور اکثر کئی کئی میل پیدل چلتے تھے۔ معمولی غذا کھاتے اور سواری سے حتی الامکان پرہیز کرتے تھے۔ سردی گرمی کا اثر وہ قبول نہیں کرتے تھے۔

قیام پاکستان سے قبل ایک بار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے یونین ہال میں مولانا آزاد سبحانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا تقریری مقابلہ ہوا۔ دونوں ہندوستان کے چوٹی کے مقرر تھے۔ آزاد کی فصاحت و بلاغت اور پرجوش تقریر کے مقابلہ میں آزاد سبحانی کی باوقار موثر اور مدلل تقریر۔ برابر کی جوڑ تھی۔ سامعین مسحور ہو کر رہ گئے اور انھیں فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ کس کی تقریر بہتر تھی، اور کون بازی لے گیا۔

کلکتہ میں عید کی نماز کی امامت مولانا ابوالکلام آزاد کیا کرتے تھے۔ لاکھوں مسلمانوں کا اجتماع مولانا آزاد کے پیچھے نماز ادا کرتا تھا۔ لیکن جب پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا تو کلکتہ کے بیشتر مسلمانوں نے مولانا آزاد کی امامت میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ وہ ہندو کانگریس کے صدر اور پاکستان کے مخالفین میں سے تھے۔ چنانچہ کلکتہ میں عید کے بڑے اجتماع کی امامت ایک سال مولانا آزاد سبحانی نے کی اور کانگریسی مسلمانوں کے چھوٹے اجتماع کی امامت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔

مولانا آزاد سبحانی بڑے خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کا انتقال غالباً ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ ایسے مسلمان اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی)

ہر قوم اور ہر مملکت کا ایک سنہرا دور ہوتا ہے۔ جو اسے دوسرے ادوار سے ممتاز اور ممیز کرتا ہے۔ یونانیوں میں سکندر سے قبل سے پرکلیز (PREC LES) تک کا دور یونان کا سنہرا دور کہلاتا ہے۔ جس میں سقراط۔ افلاطون۔ ارسطو بطلیموس، سکندر اعظم اور ہومر ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئیں۔ روما میں آگسٹس کا عہد اس کا سنہرا دور ہے۔ خلافت عباسیہ میں خلیفہ ہارون رشید۔ خلیفہ مامون رشید خلیفہ معتصم باللہ اور اسلامی اسپین میں عبدالرحمٰن الداخل اور عبدالرحمٰن الناصر کے عہد حکومت ان مملکتوں کے سنہرے دور کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے ہیں برطانیہ میں ملکہ وکٹوریہ کا عہد اس کا سنہرا دور مشہور ہے۔ اسی طرح مسلم ہندوستان میں سید احمد خاں سے لے کر قائداعظم محمد علی جناح کا زمانہ اس کی نشاۃ ثانیہ اور سنہرا دور کہلانے کا مستحق ہے۔ جو آخر کار قیام پاکستان میں ظہور پذیر ہوا۔ اس زمانہ میں سید احمد خاں۔ نواب محسن الملک۔ علامہ مشرقی ایسے مصلح۔ مولانا

محمد علی، مولانا شوکت علی۔ مولانا حسرت موہانی اور قائداعظم محمد علی جناح ایسے عظیم رہنما۔ شبلی نعمانی۔ نیاز فتحپوری۔ حسن نظامی۔ عبدالماجد دریابادی۔ سلیمان ندوی۔ مولوی عبدالحق۔ ڈاکٹر نذیر احمد ایسے شہرہ آفاق ادیب۔ اقبالؔ۔ حالیؔ۔ اکبرؔ۔ حسرتؔ۔ فانیؔ۔ اصغرؔ۔ جگرؔ۔ اور جوشؔ ایسے نامور شعراء۔ ابوالکلام آزاد۔ عبدالماجد بدایونی۔ نواب بہادر یار جنگ۔ عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا آزاد سبحانی ایسے شعلہ بیان اور سحر بیان مقرر پیدا ہوئے۔ عبدالرحمٰن صدیقی بھی اس دور کی ایک نادر اور نامور پیداوار تھے۔

لانبا قد۔ سرخ سپید رنگ۔ انتہائی وجیہہ شخصیت۔ شیروانی اور ترکی ٹوپی زیب تن کر کے جب نکلتے تو ترک معلوم ہوتے تھے۔ جس نے سوٹ کی جگہ شیروانی پہن رکھی ہو۔ سورت میں پیدا ہوئے، لیکن تعلیم کے سلسلے میں چونکہ اپنے ماموں علی محمد خاں دہلوی کے ساتھ رہتے تھے، جو حیدرآباد (سندھ) میں وکالت کرتے تھے، اس لئے سندھی کہلائے۔ علی گڑھ ایم اے او کالج سے فارغ التحصیل ہوئے۔ وہ بچپن ہی سے ذکی اور طباع طلباء میں شمار کئے جاتے تھے۔ تقریر اور تحریر کے بادشاہ تھے۔ علی گڑھ کالج یونین کے نائب صدر بھی رہ چکے تھے۔ علی گڑھ ایم اے او کالج میں ۱۹۰۷ء میں جو اسٹرائک ہوئی تھی اس میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔

صدیقی صاحب مولانا محمد علی جوہر کے ساتھی ہی نہیں بلکہ ان کے

عاشق تھے۔ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے کامریڈ جاری کرنے میں انھوں نے مولانا محمد علی کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اور زندگی بھر وہ مولانا کے مداح رہے۔ مولانا کی قربت نے جو متعدد شہرہ آفاق صحافی اور سیاسی شخصیتیں پیدا کیں، ان میں صحافیوں میں راجہ غلام حسین اور ولایت علی بمبوق اور سیاسی شخصیتوں میں عبدالرحمٰن صدیقی۔ شعیب قریشی۔ سردار عبدالرب نشتر اور ڈاکٹر ذاکر حسین قابلِ ذکر ہیں۔

جنگ بلقان کے سلسلے میں جب ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی نے ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں۔ طبی مشن ترکوں کی امداد کے لئے بھیجا۔ تو عبدالرحمٰن صدیقی اس مشن کے سکریٹری تھے۔ صدیقی صاحب کے اخلاق اور ہیبا کی نے انھیں ترکی کے قائدین میں بہت ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ اور غازی انور پاشا سے تو ان کے بہت دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔ مغربی اقوام نے اس زمانہ میں خلافت عثمانیہ کے خلیفہ کو مرد بیمار کا خطاب دے رکھا تھا۔ اور اس کو ہڑپ کر جانے کی وہ سازشیں کر رہی تھیں۔ جنگِ طرابلس اور جنگ بلقان اسی سازش کا نتیجہ تھیں۔ لیکن اس مرد بیمار میں ابھی شجاعت کی چنگاری باقی تھی۔ غازی انور بے نے جب اپنی غیر منظم فوج کے ذریعہ دوبارہ ایڈریا نوبل پر قبضہ کر لیا تو ساری اسلامی دنیا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ مغربی اقوام اور خصوصاً انگریز جو ترکی کو ختم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے، آخر کار انھیں تقدیر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، اور ترکوں کے قبضہ کو تسلیم کر کے اور نہ خالی کرنا پڑا۔ صدیقی صاحب شعیب قریشی کے ساتھ ملٹری ٹرین میں بیٹھ کر ایڈریا نوبل پہنچے، اور وہاں سے انھوں نے مسلمان ترکوں پر بلغاریہ

کے عیسائیوں کے مظالم اور انور پے کی عظیم الشان فتح کی مفصل رپورٹ روانہ کی۔

عبدالرحمٰن صدیقی، تقریر اور تحریر کے ماہر تھے۔ وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اس میں کاٹ چھانٹ نہیں کرتے تھے۔ ان کی تحریر بہت شگفتہ۔ فصاحت اور بلاغت کا آئینہ ہوا کرتی تھی۔ قلم برداشتہ لکھنے میں شاید ہی کوئی شخص ان کا مقابلہ کرسکتا تھا۔

صدیقی صاحب نے مسلمانوں کی سیاسی اور تجارتی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے کلکتہ سے انگریزی کا روزنامہ مارننگ نیوز جاری کیا۔ جس کے وہ ایڈیٹر تھے۔ ان کے اداریے اور جمال الدین پر ان کا معلومات افزا اور روح پرور مضمون ہمیشہ لوگوں کے قلوب کو گرماتے رہیں گے۔ وہ کلکتہ کے مسلم چیمبر آف کامرس کے چیئرمین اور کلکتہ کے پہلے مسلمان میئر (MAYOR) مقرر ہوئے۔ صدیقی صاحب صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں میں بیمہ کو مقبول ترین بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور کلکتہ میں ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کی بنیاد ڈالی۔

عبدالرحمٰن صدیقی کے قول و فعل میں انتہائی مطابقت پائی جاتی تھی۔ وہ بڑی سے بڑی شخصیت کے سامنے اعلائے حق کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق: "وہ راست گوئی، اخلاقی جرأت بے باکی و آزادی میں نیک نام نہیں بدنام تھا۔" وہ اگر ذرا بھی زمانہ سازی اور مصلحت کوشی سے کام لیتے تو اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کی بدولت

وہ بڑی سے بڑی جگہ حاصل کر سکتے تھے۔ لیکن مصلحت کوشی اور منافقت ان کے مذہب میں سب سے بڑے گناہ تھے۔ ایسے سچے مخلص اور ہمدرد مشکل سے ملتے ہیں وہ صادق القول اور واثق المحبت تھے۔ وہ دوستی اور دشمن دونوں میں انتہا پسند تھے۔ لیکن ان کی دشمنی ذاتی نہیں بلکہ اصولی ہوا کرتی تھی اور دوستی میں تو وہ سب کچھ نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ غیبت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اور کسی دوست کے خلاف تو ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔

صدیقی صاحب کی زندہ دلی اور خوش طبعی ہمیشہ یاد رہے گی، وہ جس محفل میں پہنچتے اس میں بہار آجاتی۔ گالیوں میں ان کی جدت طرازیوں کے بڑے واقعات سننے میں آتے ہیں۔ ان کی عام گالی "حرام خور" تھی جو وہ اکثر استعمال کرتے تھے۔

انھوں نے عمر بھر شادی نہیں کی۔ کہتے تھے کہ میں نے قوم اور ملت سے شادی کر رکھی ہے۔ اور اسی کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ اس کے باوجود انھوں نے بہت پاکیزہ زندگی بسر کی۔ وہ سچے مسلمان تھے وہ غریبوں کے بڑے ہمدرد تھے۔ اور اپنے ملازموں سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے، بلکہ خود ان کی خدمت کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے ملازم ان پر جان چھڑکتے تھے۔

پاکستان نے صدیقی صاحب کی خداداد صلاحیتوں سے کوئی استفادہ حاصل نہیں کیا۔ یہاں کے خوشامد پسند سربراہانِ مملکت بھلا ایسے صاف گو اور بے باک شخص کو کہاں پسند کر سکتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں

غلام محمد صاحب نے البتہ انھیں مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ لیکن زیادہ عرصہ وہ اس عہدہ پر فائز نہ رہ سکے۔ بیمار پڑے اور آخر کار جناح اسپتال کراچی میں انتقال فرمایا۔

صدیقی صاحب سے میری ملاقات کراچی میں دو تین بار ہوئی۔ وہ عملاً گوشہ نشین ہو چکے تھے۔ ان کی تندرستی بھی گرتی جا رہی تھی۔ لیکن ان کی طباعی اور ذہانت۔ ان کی بے باکی اور جرأت ایمانی کے جلوے اب بھی نظر آتے تھے۔ ایسے انسان اب کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ بقول کسے:

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے

سیّد حسین امام

سید حسین امام کو دیکھ کر جو شے سب سے زیادہ ذہن پر نقش ہوتی ہے وہ ان کی مونچھیں ہیں۔ اسی لئے میرے ایک عزیز دوست ڈاکٹر خالد حسن قادری انھیں مونچھ امام کے نام سے پکارا کرتے تھے۔

چھابڑ جھول پائجامہ اور شیروانی میں ملبوس۔ آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ۔ خشخشی داڑھی اور لمبی لمبی مونچھیں رکھنے والے سید حسین امام بہار کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور غیر منقسم اسلامی ہند کے ایک سربرآوردہ رہنما۔ آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے رکن اور غیر منقسم ہند کے ایوانِ بالا (کونسل آف اسٹیٹ) کے صدر رہ چکے ہیں۔ ان کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز ان کی مونچھیں ہیں جو نواب شجاع الدولہ کی مونچھوں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔ جوانی میں یہ مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح کھڑی رہتی تھیں۔ لیکن بڑھاپے نے انھیں دراز کر کے جھکا دیا ہے۔

یوں تو حسین امام صاحب کو کراچی کے متعدد جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے میں نے سنا تھا۔ اور قیام پاکستان سے قبل ان کے نام اور مسلم لیگ میں ان کے کارناموں سے واقف تھا۔ لیکن ان سے شناسائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان نے ۱۹۶۱ء میں جب مارشل لاء ریگولیشن ۸۹ اور ۹۱ نافذ کر کے مہاجرین دعویداروں کے قانونی طور پر منظور کردہ دعاوی کے تحت الاٹ شدہ زمینوں پر ناانصافی اور دھاندلی کا کلہاڑا چلایا۔ ان کی زمینوں کا اسی فیصدی حصہ کسی قانونی جواز کے بغیر منسوخ کر دیا اور مہاجر دعوے داروں کو قانونی چارہ جوئی کے حق سے بھی محروم کر دیا گیا تو مہاجر دعویداروں نے برسر اقتدار حکومت کے اقدام کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کرنے اور حکومت کو بھی اس زیادتی کی جانب متوجہ کرنے کے لئے جس کی مثال برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے ایک بورڈ بنایا جس میں چار یار حسین امام صاحب۔ رضوان اللہ صاحب۔ ڈاکٹر الٰہی علوی اور رحمت اللہ صاحب شامل تھے۔

میں اس زمانے میں حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ انفارمیشن افسر تھا۔ ریڈیو اور اخباروں سے میرے ذاتی تعلقات تھے کیونکہ اس زمانے میں قلیل تنخواہ کی کمی کو پورا کرنے کے لئے انگریزی اخباروں میں برابر مضامین لکھا کرتا تھا اور ریڈیو کے بیشتر پروگراموں میں حصہ لیتا تھا۔ ہمارے دعاوی کے تحت مجھے اور میری اہلیہ کو بھی سندھ میں تھوڑی سی زمین ملی تھی اور وہ بھی فیلڈ مارشل ایوب خاں۔ ان کے وزیر مہاجرین جنرل کے ایم شیخ۔ چیف سٹلمنٹ کمشنر پیر احسن الدین کی سازشوں اور دھاندلیوں کے تحت کٹوتی کا

شکار ہو کر صرف بیس فیصدی رہ گئی تھی۔ حالانکہ ہم لوگوں نے انتہائی ایمان داری سے کام لیا تھا۔ میرے والد اپنے ضلع کے بڑے زمیندار تھے۔ کافی زرعی زمین چھوڑ کر آئے تھے۔ لیکن چونکہ وہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان منتقل ہوئے تھے۔ اس لئے ان کی زمین کے دعوے ہم نے داخل نہیں کئے۔ مہاجرین کے خلاف حکومت پاکستان کی اس سراسر ناانصافی کے ہم بھی شاکی تھے۔ ہم بھی چاہتے تھے حکومت کی اس دھاندلی کے خلاف رائے عامہ کو بیدار کیا جائے اور ایسے سوا کیا جائے۔ اخبار اس کا موثر ذریعہ ہے

رحمت اللہ صاحب مہاجرین دعویداروں کے چار یاروں میں سب سے زیادہ فعال شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اخباروں میں اپنے بیانات شائع کرنے کے لئے مرکزی حکومت کے محکمہ اطلاعات میں اخبار کے ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ان کی شناسائی دو ایک نامہ نگاروں سے تھی۔ انھیں اخباری بیانات بھی لکھنا نہیں آتے تھے انھیں جب معلوم ہوا۔ محکمہ اطلاعات میں ایوب خاں کے اس ستم کا مارا ہوا ایک چھوٹا موٹا افسر بھی ہے تو میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے ان کی بھرپور امداد کی۔ اس سلسلہ میں میں نے انھیں سارا مواد مہیا کیا۔ ان کے بیانات لکھے۔ شائع کرائے اور اس پر اداریئے لکھوائے۔ بلا تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایوب خاں کے جابرانہ دور حکومت میں کسی مسئلہ پر پریس نے اتنا ہنگامہ نہیں مچایا جتنا مارشل لا ریگولیشن ۸۹ اور ۹۱ کے خلاف مچایا تھا۔ پاکستان کے بڑے اور موقر روزناموں ڈان، جنگ، مارننگ نیوز، پاکستان ٹائمز، حریت وغیرہ میں درجنوں اداریئے مہاجرین دعویداروں سے متعلق اسس

کھلی ہوئی دھاندلی کے بارے میں لکھے گئے۔ ڈان کے ایک سابق ایڈیٹر کے بقول ان کے اخبار نے آج تک کسی مسئلہ سے متعلق دو تین اداریوں سے زیادہ نہیں لکھے۔ مارشل لا ریگولیشن ۸۹ اور ۹۱ کے خلاف تو ایک درجن اداریئے لکھے۔ کوئی دوسری حکومت ہوتی تو پریس اور رائے عامہ کے اس شدید ردعمل پر مستعفی ہو جاتی۔ لیکن ایوب خاں۔ یحییٰ خاں کی حکومتوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بقول غالب:

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

"ہندی کی مثل ہے اندھے کے آگے روؤ اپنا دیدہ کھوؤ" وہی حشر مہاجر دعویداروں کے شکوے شکایتوں اور اپیلوں کا ہوا۔ حکومت ٹس سے مس تک نہیں ہوئی۔

ان چار یاروں میں سے دو عدد رحمت اللہ صاحب اور رضوان اللہ صاحب تو حکومت پاکستان سے انصاف کی حسرت دل میں لئے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ڈاکٹر الٰہی علوی بھی تھک ہار کر بیٹھ رہے ہے۔ حسین امام صاحب میں لیکن ابھی دم خم باقی ہے۔ مارشل لا، ریگولیشن ۸۹ اور ۹۱ سے متعلق گفت و شنید اور تبادلۂ خیالات کے سلسلے میں جمعیتہ الفلاح میں پہلی بار میری ملاقات حسین امام صاحب سے ہوئی۔ وہ اس اجتماع کی صدارت کر رہے تھے۔

مہاجرین کے ان اجتماعات میں مارشل لاء ریگولیشن ۸۹ اور ۹۱ کے خلاف اخبارات میں بیانات جاری کئے جاتے تھے۔ گورنر مغربی پاکستان اور صدر پاکستان سے انصاف کی اپیلیں کی جاتی تھیں۔ تار دیئے جاتے تھے اور

ان سے ملنے اور اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی درخواست کی جاتی تھی۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں تو کان کے کچے تھے، جنرل شیخ اور پیر احسن الدین نے ان کے کان کافی بھر دیئے تھے اور مہاجر دعویداروں کو ننگا اور لُچا ثابت کرنے کے لئے ہندوستان سے متروکہ املاک کے فرضی ریکارڈ کا ڈھونڈھورا بار بار پیٹا تھا اور اس قسم کے بیانات اخباروں میں چھپوایا تھا۔ حالانکہ اسی زمانے میں ہندوستان کے موقر روزنامے اسٹیٹسمین (STATESMAN) میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق صرف یو پی میں ۸۹ کروڑ روپے کی مالیت کے متروکہ زمینداری کے بانڈ حکومتِ ہند نے اپنی تحویل میں لے لئے تھے۔ پیر صاحب احسن الدین کے مفروضہ ریکارڈ کو جو ہندوستان سے خاص کر ان کی خدمت میں آیا تھا کسی دعویدار کو دیکھنے کی اجازت نہیں تھی، اور اس مفروضہ ریکارڈ کے فراڈ کی حقیقت یحیٰی خاں کے دورِ حکومت میں کھلی جس کے بوگس ہونے کی تصدیق سپریم کورٹ کے ایک سابق جج جسٹس فضل اکبر اور لاہور ہائی کورٹ کے سابق جج جسٹس خورشید زماں نے کی۔ مہاجر دعویداروں کے خلاف ایوب خاں کی حکومت میں جو فراڈ کیا گیا تھا۔ یحیٰی خاں اس سے پوری طرح واقف ہو گئے تھے اور اس سے ہمدردی بھی کرتے تھے لیکن ان کے بعض مشیروں نے جو خود بھی اس فراڈ میں ملوث تھے اور جن کا بھانڈا پھوٹنے کا خدشہ تھا یحیٰی خاں کو مہاجر دعویداروں کے ساتھ انصاف کرنے سے باز رکھا۔

اس کے قبل فیلڈ مارشل ایوب خاں کے کان تو مہاجر دعویداروں کے خلاف افواہوں سے اس قدر بھر دیئے گئے تھے کہ وہ ان کی کوئی معقول بات سننے کو

نیاز ہی نہیں تھے۔ البتہ گورنر مغربی پاکستان نواب کالاباغ کا رویہ اس معاملہ میں ایوب خاں سے بالکل مختلف تھا۔ وہ ایک ایماندار۔ با اصول اور باصلاحیت انسان تھے۔ مہاجرین نے جو پاکستان کی خاطر جان ومال کی قربانیاں دی تھیں۔ اس کا انھیں پوری طرح احساس تھا وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یو، پی۔ بہار۔ سی، پی، کے مہاجر دعویداروں نے بڑی بڑی زرعی اور شہری املاک ہندوستان میں چھوڑی ہیں اور ۸۹ اور ۹۱ کے تحت ان کے خلاف زیادتی اور فراڈ کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ مہاجر دعویداروں سے ہمدردی کرتے تھے اور انھوں نے حتی الامکان سہولتیں دلانے کی کوشش کی۔

سید حسین امام ایک نیک سیرت اور پرخلوص مسلم رہنما ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان میں وہ مسلم لیگ کے صفِ اول کے رہنما اور قائدِ اعظم کے معتمدین میں تھے۔ قائد اعظم نے انھیں کل ہند مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن مقرر کیا تھا۔ وہ ہندوستان کے ایوان بالا کونسل آف اسٹیٹ کے صدر منتخب ہوئے اور اپنا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔

سید صاحب ایک اعتدال پسند رہنما ہیں۔ مہاجرین میں وہ بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کے مشوروں کو کسی حیل وحجت کے بغیر تسلیم کیا جاتا ہے۔ مہاجر دعویداروں کو حسین امام صاحب کی شخصیت سے بڑی تقویت رہی ہے۔ لیکن جہاں انصاف کا فقدان ہو وہاں انصاف کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے عظیم رہنماؤں سید حسین امام، رضوان اللہ اور ظہیر الحسن لاری کی پرخلوص کوششوں کے باوجود حکومتِ پاکستان

مارشل لاء ریگولیشن ۸۹ اور ۹۱ کے تحت کی جانے والی ناانصافیوں اور فراڈ کو ختم کرنے پر تیار نہیں ہوئی۔

اس پیرانہ سالی کے باوجود سید صاحب مہاجروں اور دیگر مسلمانوں کے سارے اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں کوئی شام ان کی خالی نہیں جاتی۔ ان اجتماعات میں وہ اپنے مفید خیالات سے حاضرین کو مستفید کرتے ہیں سامعین ان کے خیالات کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے متعدد عظیم رہنما بشمول مولانا حسرت موہانی اور نواب اسمٰعیل خاں بھارت میں رہ گئے۔ بھارتی مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے جینے اور مرنے کو ترجیح دی۔ لیکن متعدد دیگر رہنماؤں کو بھارت چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنی پڑی۔ ان میں امیر احمد خاں۔ راجہ صاحب محمود آباد سید حسین امام۔ چودھری خلیق الزماں۔ ظہیر الحسن لاری۔ نواب صدیق علی خاں مرزا ابو الحسن اصفہانی اور رضوان اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلم لیگ کے ان سربرآوردہ رہنماؤں کی پاکستان میں وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ قائد اعظم پاکستان میں مشکل سے ایک سال زندہ رہے۔ اس دوران وہ برابر علیل رہے۔ ان کے انتقال کے بعد پاکستان میں اکھاڑ پچھاڑ اور بندر بانٹ شروع ہو گئی۔ قوم پرستی کے بجائے صوبہ اور علاقہ پرستی کا دور دورہ ہوا۔ کوٹہ سسٹم اور مفاد پرستی کے تحت غیر مستحق افراد کو مستحق پر، خوشامدیوں کو مسلم لیگ کے آزمودہ کار افراد پر ترجیح دی گئی۔ اس طرح ملک میں وہ ہڑبونگ مچی جس کی بنا پر دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا بڑا حصہ اس سے

علیحدہ ہو گیا۔ تاریخ عالم میں کسی مملکت کی اس سرعت کے ساتھ زوال پذیری کی مثال نہیں ملتی ہے۔ اس کی وجہ محض بے اصولی اور ناانصافی ہے جو قائد اعظم کے انتقال کے بعد اس مملکت خداداد کا وطیرہ بن گئی۔ اس ملک میں پاکستان کے حقیقی معماروں کی جیسی مٹی پلید ہوئی جن میں سید حسین امام بھی شامل ہیں۔ اس پر یہ شعر صادق آتا ہے:

نیرنگیٔ سیاست دوراں تو دیکھنا،
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

حافظ سیّد مبارک علی شاہ

قدرت کا کارخانہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے۔ خالق کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنے سے انسانی عقل قاصر ہے۔ اس نے معذور اشخاص کو غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ اور ان سے ایسی خدمات لی ہیں جن کا تصور کر کے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ ایسے ہی معذور اشخاص میں بینائی سے محروم متعدد شخصیات گزری ہیں۔ جنھوں نے انسانی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ انھیں میں مشہور رزمیہ نظموں ایلڈ اور اوڈیسی کا مصنف یونان کا عظیم ترین شاعر ہومر بھی تھا۔ جو بینائی کی نعمت سے محروم تھا۔ بیسویں صدی عیسوی میں مصر کے نامور ادیب اور سیاست داں طٰہٰ حسین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی شہرہ آفاق ماہر تعلیم اور معاشرتی کارکن ہیلن کیلر بھی بینائی سے محروم تھیں۔ ان دونوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔

برصغیر پاک و ہند میں ایسی ہی ایک منفرد شخصیت حافظ سید مبارک علی شاہ

کی تھی۔ ۶ کو ۱۹۷۲ء میں حیدرآباد (سندھ) میں انتقال ہوگیا۔ قدرت نے انھیں بینائی کی نعمت سے محروم کر دیا تھا۔ لیکن اس معذور انسان کو خداوند تعالیٰ نے کتنا عزم۔ کتنا حوصلہ اور کتنا خلوص عطا کیا تھا اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے تھے جنھیں ان سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔

سید صاحب غیر منقسم ہندوستان میں ریاست جے پور کے رہنے والے تھے۔ ایام طفلی ہی میں ان کی بینائی جاتی رہی، لیکن اس سے ان کے عزم میں کوئی فرق نہیں آیا، انھوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اردو۔ فارسی اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ یونیورسٹی تک پہنچ گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ ہندوستانی ریاستوں کی سیاست کراچی کے موسم کی طرح غیر یقینی ہوا کرتی تھی اور ریاستی حکمرانوں کے مزاج اور موڈ کے مطابق اس میں اتار چڑھاؤ ہوا کرتا تھا اور بدلتی رہتی تھی۔ ریاست جے پور کی حالت دیگر دیسی ریاستوں سے بہتر تھی۔ مرزا اسمٰعیل کے وزارت عظمیٰ کے دور میں اس میں بڑی ترقی ہوئی تھی۔ اور اس کے صنعتی۔ تعمیری اور انتظامی شعبوں میں بہت نمایاں فرق ہوا تھا۔ حافظ صاحب نے بھی جلد ریاستی سیاست میں اہم مقام پیدا کرلیا اپنے حوصلہ اور خلوص کی بدولت انھوں نے غیر منقسم ہندوستان کی سیاست میں اپنے لئے ایک پر وقار راستہ بنا لیا تھا۔ اگر وہ وہاں مقیم رہتے تو آزاد ہندوستان کی سیاست میں بلند مقام پاتے اور ساتھ ساتھ اپنی معذوری کی وجہ سے عجوبۂ روزگار تصور کئے جاتے۔ کیونکہ صرف ظاہری بینائی سے محروم لیکن باطنی بینائی سے مالا مال تھے۔ حقیقی بینائی دل کی ہوتی ہے جو آدمی کو انسان بناتی ہے۔

اگر کوئی شخص دل کا اندھا ہو جائے تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے۔

ہے دیکھنا تو دیدہ دل وا کرے کوئی

حافظ صاحب پر لیکن پاکستان کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ جس کی بناء پر انھوں نے اپنی خوابوں کی جنت پاکستان کی جانب مراجعت کی، لیکن ان کی یہ خیالی بہشت محض سراب ثابت ہوئی۔ پیر علی محمد راشدی کی زبانی ان کے متعلق سنئے:

"حافظ صاحب مرحوم جو امیدیں لے کر پاکستان آئے تھے، وہ پوری نہ ہو سکیں۔ ان کا اپنا قصور نہیں تھا۔ یہ سارے ملک کی تقدیر کا قصور تھا۔ وہ اگر دل کے اندھے ہوتے تو یقیناً یہاں کامیاب ہو جاتے، اور ہماری سیاست میں بالکل فٹ ہو جاتے۔ مگر وہ اس کوالیفیکیشن (QUALIFICATION) سے محروم تھے۔ لہٰذا وہ یہاں وہ مقام نہیں پا سکے جس کے وہ مستحق تھے۔

سب سے بڑی تکلیف جو ان کو پیش آئی وہ یہ تھی کہ ان کو وہ پاکستان کہیں نظر نہیں آیا جس کو انھوں نے اپنے تصور کی دور بین سے دیکھا تھا۔ پاک سر زمین ہر قسم کے گناہوں اور گندگیوں سے مبرا۔ نیکوکاروں اور پاکبازوں کا مسکن۔ تہذیب اور انسانی اقدار کا قلعہ۔ آمریت اور استبداد سے آزاد، سچی جمہوریت

کا گہوارہ۔ ہر محزون اور آزردہ حال مسلمان کے لئے آخری جائے پناہ اور وجہ تسکین۔ عالم اسلام کی وحدت کا علمبردار۔ علاقائی صوبائی اور لسانی چھوت چھات سے قطعاً ناآشنا۔ غرضکہ ایک ایسا قطعہ ارض جہاں کے رہنے والے جملہ انسانی خوبیوں اور اسلام کی جملہ برکتوں کا نمونہ بن کر اس سج دھج سے افق عالم پر ابھریں گے کہ ساری دنیا اسلام کی برتری اور اسلامی طرز زندگی کی افضلیت کی قائل ہو جائے گی اور جو سرمایہ اس عظیم ملت نے حوادث دوراں یا اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے پلاسی کے میدان اور اسپین کی وادیوں میں کھویا تھا وہ اس کو دوبارہ حاصل ہو جائے گا

"مگر یہاں پہنچنے کے بعد جو کچھ حافظ صاحب نے دیکھا ہوگا یا پچیس سال دیکھتے رہے ہوں گے وہ یقیناً اس بات کا متقاضی تھا کہ از دیار فکر سے ان کے پیٹ میں السر ابھر آئیں، دماغ کی رگیں پھٹ جائیں اور دل ٹوٹ کر ساتھ چھوڑ دے۔"

حافظ صاحب سے میری ملاقات دو تین بار حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کا باوقار چہرہ جس پر ہمیشہ سیاہ چشمہ لگا رہتا تھا۔ آج بھی میری نظروں میں گھوم رہا ہے ان کی پرخلوص اور پرتاثیر گفتگو آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے۔

حافظ صاحب کا حافظہ بہت تیز تھا۔ جس کی آواز وہ ایک بار سن لیتے تھے پھر اسے بھولتے نہیں تھے۔ ایک بار ایک صاحب ان سے حیدرآباد ملنے آئے، جن کا تعارف ان سے دس سال پہلے ہوا تھا۔ حافظ صاحب کو انھوں نے

سلام کیا تو حافظ صاحب نے ان کا نام لے کر جواب دیا۔ ان صاحب کو بڑا تعجب ہوا
ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بیدار دل سے نکلی ہوئی باتیں سامعین کے قلوب میں
اترتی چلی جارہی ہیں۔ وہ جب قیام پاکستان سے قبل قائداعظم کی قیادت میں مسلم قوم
کی عظیم جدوجہد کی باتیں کرتے اور اس کا پاکستان کے موجودہ حالات سے تقابل
کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کسی اور دنیا کی باتیں کررہے ہیں، جو ماضی کے
ساتھ رخصت ہوگئی اور شاید مستقبل میں اس کی کوئی جھلک نظر نہ آئے، وہ
خواب کی باتیں معلوم ہوتیں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں بسنے والی قوم ہمیشہ سے مارتوخاں کے آگے آگے
بھاگتی اور دولت خاں کے پیچھے پیچھے دوڑتی رہی ہے۔ اس نے حق و باطل میں
کبھی تمیز نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین نے زیادہ تر ٹوڈی۔ خوشامدی اور
اقتدار کے پجاری پیدا کئے۔ جو بھی کرسئ اقتدار پر بیٹھ گیا، اس کے سامنے قوم
جھک گئی۔ صحیح معنوں میں عظیم قوم پرست اشخاص اس نے شاذونادر ہی
پیدا کئے۔ ایسے افراد جو قوم اور ملک، حق اور سچائی کے لئے اپنا سب کچھ
نثار کردیتے ہیں۔

حافظ صاحب ایک باضمیر انسان تھے۔ انھوں نے جس پاکستان کا خواب
دیکھا تھا وہ اس سے بالکل مختلف تھا جو حقیقت بن کر ان کے سامنے آیا۔ جس
میں نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی سمجھا جاتا ہے، جس میں سارے اخلاقی اقدار
کے معنی الٹے ہوگئے ہیں۔ جس میں بڑائی کا معیار تقویٰ اور علم کے بجائے دولت
پر ہے۔ جو اسلام کو فروغ دینے کے لئے عالم وجود میں آیا تھا۔ لیکن جہاں اسلام

کی جیسی مٹی پلید ہوئی اُس کی نظیر کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی ہے، جس میں ان نظریات کے ساتھ فریب کیا گیا، جن کو پروان چڑھانے کے لئے لاکھوں مسلمان کی قربانیاں سے پاکستان قائم کیا گیا تھا۔ جہاں شراب نوشی۔ قمار بازی۔ چوربازاری عیاشی۔ فحاشی۔ رشوت خوری۔ اور فریب کاری ایسے مخرب الاخلاق، اور غیر اسلامی شعائر کو فروغ دیا گیا، جن کی اسلام نے سختی سے مخالفت کی ہے۔ جہاں ترقی معکوس اور اخلاقی گراوٹ کو حقیقی ترقی کا مترادف سمجھا گیا۔ جہاں قومی نظریہ اور قومی یکجہتی کے بجائے علاقائیت اور صوبائیت کو فروغ دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم کا پاکستان تو قائداعظم کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ بعد کا پاکستان درحقیقت پاکستان کا ایک مذاق ثابت ہوا۔ جس کی وجہ سے پچیس سال کے قلیل عرصہ میں اس کا بڑا نصف حصہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ کسی قوم کی ایسی تیز رفتار زوال پذیری کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی ہے۔

پاکستان کی سیاست کردار کے بجائے دولت کے بل بوتے پر چلتی ہے۔ جس کے پاس دولت ہوتی ہے اور جو جھوٹے دعوے کر کے عوام کو بیوقوف بنا سکتا ہے، وہی یہاں کے اِنتخابات میں کامیاب ہوتا ہے۔ حافظ صاحب جو تھوڑا بہت سرمایہ اپنے ساتھ لائے تھے، جب تک وہ رہا ان کی مان دان رہی وہ صوبائی مجلس قانون ساز کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ اس وقت پاکستان کی جدوجہد کا جوش وخروش ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ سردار عبدالرب نشتر۔ خواجہ ناظم الدین۔ اور حسین شہید سہروردی ایسے قائدزندہ تھے جنھوں نے قائداعظم کے ساتھ کام کیا تھا۔ لیکن جب

حافظ صاحب کا پیسہ ختم ہوا اور پاکستان کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا تو حافظ صاحب بھی گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔ ایسی حالت میں انھیں کون پوچھتا کیونکہ ان میں وہ صفات دور دور بھی نہ تھیں۔ جو پاکستانی سیاست میں کامیابی کی ضمانت دیتیں۔ وہ ان ہتھکنڈوں سے ناواقف تھے جو پاکستانی لیڈر استعمال کیا کرتے ہیں۔

حافظ صاحب اگر چاہتے تو صوبائی مجلس قانون ساز کی رکنیت کے زمانے میں جب وہ محکمۂ الاٹمنٹ کے خصوصی مشیر تھے، تو بقول شخصے: "اپنے لئے آدھا سندھ الاٹ کر ڈالتے" لیکن یہ بات ان سے بعید تھی اور ان کا ضمیر اسے کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے عسرت کی زندگی کو ترجیح دی لیکن عشرت کی بہتی ہوئی گنگا میں جو پاکستان میں رواں دواں تھی، ہاتھ دھونا گوارا نہیں کیا۔ وہ برصغیر کی سیاست کے ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے تھے، جس نے مولانا محمد علی۔ مولانا حسرت موہانی۔ علامہ اقبال۔ اور قائد اعظم محمد علی جناح ایسے پر خلوص اور بے نفس انسانوں کو جنم دیا تھا۔ جہاں اپنی ذات کو سیاست سے الگ رکھا جاتا تھا۔

حافظ صاحب کے دل میں قوم کا درد تھا۔ وہ ہر قسم کے علاقائی، اور صوبائی تعصبات سے پاک تھے۔ انھوں نے پاکستان میں ایک مثالی مملکت کا خواب دیکھا تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ ایسے اشخاص کی تائید کرتے تھے جن میں صلاحیت اور کردار ہو، ایسا شخص خواہ سندھی ہو یا مہاجر۔ پنجابی ہو یا پٹھان اس سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ انھوں نے

اس انداز سے کبھی سوچا بھی نہ تھا جس انداز سے آج پاکستان میں سوچا جاتا ہے۔ اور جس کی بنا پر آج پاکستان علاقائی اور صوبائی انتشار کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسے لوگ بھلا پاکستان میں کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

کرنل معمر قذافی

کرنل معمر قذافی کا نام بہت سنا ہے لیکن انھیں دیکھنے یا ان سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ ان کی صفاتِ حمیدہ اور ان کی باعمل اسلامی زندگی نے بہت گہرے نقوش میرے لوح دل اور دماغ پر چھوڑے ہیں۔

انسان کے دل و دماغ کو جو باتیں متاثر کرتی ہیں اور جو اس کے کردار کو بنانے میں ممد و معاون ہوتی ہیں ان میں دیدہ سے زیادہ شنیدہ باتیں ہوتی ہیں۔ آخر یہ تاریخ بزرگان دین کی سوانح عمریاں۔ ان کے اقوال کیا ہیں۔ سب شنیدہ باتیں ہیں جو ہمارے عقائد اور خیالات کو مستحکم کرتی ہیں۔ کرنل قذافی کو اگر میں نے دیکھا نہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی مجاہدانہ زندگی اور ان کے اعلیٰ کردار کی بابت جو میں نے سنا ہے اس کے مطابق میرے لوح دماغ پر ان کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو بہت عظیم ہے جس نے میرے دل کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

اسلام ہی پر کیا موقوف ہے سارے انبیاء مصلحین عظیم مفکروں نے مثالی زندگی بسر کی ہے۔ اپنے اعمال کو اپنے اقوال کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اور اپنے اقوال اور اعمال میں انتہائی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نہیں کہ زبان سے رام رام اور دل میں شیطان کی پیروی انھوں نے کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مشن کی کامیابی میں ان کے اقوال سے زیادہ ان کے اعمال کا حصہ رہا ہے۔ اور ان کی کامیابی ان کے اعمال کا نتیجہ رہی ہے اسلام تو ایک عملی مذہب ہے۔ اسلام کے برگزیدہ پیغمبران کے اصحاب اور بعد ازاں علماء اور صلحا کی مثالی اور عملی زندگی نے اس مذہب کو چہار دانگ عالم میں جس سرعت سے پھیلایا وہ تاریخ عالم کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔ پیغمبر اسلام اور ان کے پاک باز صحابہ کی مثالی زندگی اور اقوال و اعمال کی مطابقت نے دنیا کے عظیم ترین انقلاب کو جنم دیا جس کی بنیاد اخوت۔ مساوات اور انصاف پر رکھی گئی تھی، اور جو تاریخ عالم کا سب سے حیرت انگیز اور تیز رفتار انقلاب ثابت ہوا۔ جو دیکھتے دیکھتے چہار دانگ عالم یعنی تینوں براعظموں ایشیا۔ یورپ اور افریقہ کے بیشتر حصہ پر چھا گیا۔ خلفائے راشدین جو اپنے زمانے کے طاقتور ترین حکمراں تھے۔ ایک عام غریب آدمی کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ روم اور ایران کے عظیم الشان محلوں کے دروازے ان پر کھلے ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔

اس صدی کے بڑے بڑے مصلحین اور انقلابیوں کو لے لیجئے لینن ٹالسٹائی۔ ماؤ۔ ہوچی منہ۔ ناصر۔ گاندھی۔ محمد علی اور حسرت موہانی۔ سب

لوگوں نے مثالی زندگی بسر کی اور اپنے اعمال کو اپنے اقوال کے مطابق ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کے مشن کی کامیابی میں ان کے اقوال سے زیادہ ان کے اعمال کو دخل رہا ہے۔ سادگی اور بلند خیالی ان کا مسلک رہی ہے۔ ورنہ دنیا میں زبانی جمع خرچ کرنے والے خود ساختہ انقلابی اور مصلح تو بہت پیدا ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے وعدے کرکے اور ڈینگیں مار کر عوام کو بیوقوف بنانے والے بہتیرے گزرے ہیں لیکن ان کا انجام بہت برا ہوا ہے ان کے اعمال نے آخر کار ان کے اقوال کی قلعی کھول دی اور ان مسیلمہ کذابوں اور عمر عیاروں کو عوام کے ہاتھوں بڑی ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔

کرنل معمر قذافی سے مجھے جو دلی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی بڑی یہی وجہ ہے کہ ان کے اقوال اور اعمال میں بڑی مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان کے اعمال ان کے اقوال کی تکذیب نہیں کرتے۔ ایک سچے مسلمان کی طرح انھوں نے اسلام کو اپنے قالب میں ڈھالنے اور بزرگانِ دین کے نقش قدم پہ چلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اسلامی نظریات کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ ان کے اعمال صالحہ نے انھیں نہ صرف اپنے ہم وطنوں، عربوں، بلکہ ساری اسلامی دنیا میں ہر دلعزیز بنا دیا ہے۔ وہ اپنوں کے لئے اگر رحمت تو دشمنان اسلام کے لئے زحمت ہیں۔ ایک سچے مسلمان ہونے کی وجہ سے ریاکاری اور منافقت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

یکم ستمبر ۱۹۶۹ء کی لیبیا کے نوجوان فوجی افسروں نے ضعیف العمر بادشاہ ادریس السنوسی کا تختہ الٹ دیا اور اس انقلاب کے تحت ۲۷ سالہ کرنل معمر قذافی

برسرِ اقتدار آئے۔ اس پسماندہ ملک کو بہت جلد شاہ راہ ترقی پر گامزن کر دیا، اور غیر ملکی اقتصادی استحصال سے آزاد کر کے اسے مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک میں ایک اہم مقام عطا کیا۔ لیبیا کی اس حیرت انگیز کامیابی میں کرنل قذافی کی فعال اور مجاہدانہ قیادت کا بڑا دخل رہا ہے۔

کرنل قذافی کی مقبولیت کی بڑی وجہ ان کا مثالی کردار اور بے داغ زندگی ہے۔ انھوں نے اپنے چار سالہ دورِ اقتدار میں اپنے اور اپنے خاندان کے سیاسی یا مالی فائدے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ صدر قذافی کسی عظیم قصرِ صدارت میں سکونت پذیر ہونے کے بجائے دو کمرے کے معمولی سرکاری کوارٹر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ صدر ہونے کے بعد ان کا یا ان کے خاندان کا معیارِ زندگی بلند نہیں ہوا۔ ایک غریب متوسط خاندان کی طرح وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے والد پہلے کی طرح اب بھی طرابلس کے ایک تنگ و تاریک محلے میں ایک مختصر سے مکان میں رہتے ہیں۔ کرنل قذافی نے ایک بار کہا تھا کہ جب اپنے ملک کے سارے شہریوں کو مکان مل جائے گا اس وقت وہ بھی اپنا مکان تعمیر کرنے کا بندوبست کریں گے۔ انھوں نے اپنے وزراء کو بھی عیش و عشرت کی زندگی سے باز رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ کرنل ناصر کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک عام شہری کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ مصر کے صدر ہونے کے بعد بھی وہ چار پانچ کمروں کے اسی مکان میں اقامت پذیر تھے، جس میں کرنل ہوتے ہوئے رہتے تھے۔ حالانکہ قاہرہ میں درجنوں عالی شان محل خالی پڑے تھے۔ ان کے بچے کرایہ کی بسوں کے ذریعہ اسکول جایا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل سے شکست فاش کھانے کے بعد جب صدر ناصر نے استعفیٰ دینا چاہا تو پوری قوم نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جتنا سوگ ان کی موت پر منایا گیا۔ اس صدی میں کسی شخص کی موت پر نہیں منایا گیا۔ ان کے جنازے میں پچاس لاکھ سے زائد سوگوار شریک تھے۔ سینکڑوں مرد اور عورتیں آہ وزاری کرتے کرتے بیہوش ہو گئیں۔ ہوچی منہ۔ ماؤ۔ گاندھی۔ محمد علی۔ حسرت موہانی کی مقبولیت کا راز بھی ان کی سادہ اور بے داغ زندگی اور کردار کی بلندی میں تھا۔

کرنل قذافی شراب تو کیا، سگریٹ بھی نہیں پیتے ہیں۔ اسلامی نظریات کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے اپنے ملک میں قحبہ خانوں، نائٹ کلبوں۔ شراب خانوں پر مکمل پابندی عاید کر رکھی ہے۔ غیر ملکیوں کو بھی وہاں شراب پینے کی اجازت نہیں ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک رکن نے شکایتی انداز میں کہا کہ کرنل قذافی نے ہمارے عملے کو طرابلس میں ایک قطرہ شراب سے محروم کر دیا ہے۔ اسلام کے قوانین کو سختی کے ساتھ نافذ کر کے انھوں نے اپنے ملک سے جرائم کا قلع قمع کر دیا ہے۔

دوسرے ممالک کے مقابلہ میں لیبیا میں جرائم کا تناسب بہت کم ہو گیا ہے۔ ایک بار ایک ڈاکٹر کی لاپرائی کی وجہ سے ایک مریض کی جان جاتی رہی صدر قذافی کے حکم کے تحت اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ لیبیا میں سرکاری ملازمین اپنے فرائض جس تندہی اور لگن سے سرانجام دیتے ہیں اس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔

صدر قذافی نے اپنے چار سالہ دور حکومت میں داخلی اور خارجی معاملات میں جو واضح اور مثبت حکمت عملیاں اختیار کی ہیں انھوں نے ساری اقوام عالم کی نگاہیں اس ابھرتے ہوئے ملک اور اس کے عظیم قائد کی جانب مرکوز کردی ہیں۔ لیبیا کے اس مرد آہن نے جس کی عملی زندگی میں قول و فعل کا انتہائی حسین امتزاج اور مطابقت پائی جاتی ہے غیر ملکی استبداد کو جس طرح للکارا ہے اور امریکی تیل کمپنیوں کو جس طرح اپنا بوریہ بستر لپیٹ کر لیبیا سے رخصت ہونے پر مجبور کیا ہے اس نے اس نوزائیدہ مملکت کو سامراجی استحصال سے آزاد کر کے اپنے وسائل کا مالک بنا دیا ہے پاکستان جیسے داخلی اور خارجی مسائل میں گھرے ہوئے ملک کے لئے اس میں درس عبرت اور اس کے عظیم قائد قذافی کی زندگی میں رہنمائی کے وافر اسباب موجود ہیں۔

کرنل قذافی نے روس سے متعلق عربوں کی حکمت عملی کو ایک نئی راہ دکھائی ہے۔ وہ روسیوں پر اندھا اعتماد کرنے کے بجائے ان کی دوستی کو اسرائیل کے خلاف کئے جانے والے اقدامات کے ترازو پر تولتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس کرنل قذافی سے خائف رہتا ہے اور ان کی انقلابی حکمت عملیوں نے اینگلو امریکی سامراجیوں کی نیند حرام کردی ہے۔ صیہونیت نواز مغرب میں ان کی آہنی شخصیت کو اسرائیل کے خلاف ایک سیل بلا تصور کیا جاتا ہے۔ ان کا اقتدار مغربی قوموں کی نگاہ میں کلنٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ اس کے برخلاف ان کی شخصیت پوری عرب دنیا میں چھاتی جارہی ہے۔ اور وہ عرب ممالک دنیائے اسلام اور افریقہ کے نو آزاد ممالک کے

ہیرو کی حیثیت سے عالمی افق پر ابھر رہے ہیں۔ فلسطین کے مظلوم اور ستم رسیدہ لاکھوں مہاجرین کے تو وہ آنکھ کے تارا ہیں۔

کرنل قذافی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد سب سے پہلے طرابلس سے امریکی اڈہ کو اپنا بوریہ بستر سمیٹنے کا حکم دیا۔ بعد ازاں انھوں نے امریکی تیل کمپنیوں کو جو لیبیا میں تیل کی آمدنی کا زیادہ تر حصہ ہضم کر جایا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ قومیا لیا۔ دنیا میں تیل پیدا کرنے والے ممالک میں لیبیا کا ساتواں نمبر ہے۔ اور اس زرِ سیال کی ساری آمدنی لیبیا کی صنعتی اور زرعی ترقی پر صرف ہوتی ہے جس کی وجہ سے گزشتہ چار سال میں لیبیا کے عوام کی خوشحالی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ درحقیقت اسرائیل کے خطرے کے باعث لیبیا کو اگر اپنی آمدنی کا معتد بہ حصہ دفاعی تیاریوں اور سامانِ حرب کی خریداری پر صرف نہ کرنا پڑتا تو آج یہ ملک اپنے عظیم انقلابی سربراہ کی قیادت میں جاپان کے بعد دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ہوتا۔ اس طرح صدر قذافی نے اپنے قومی وسائل کو غیر ملکی اجارہ داری سے آزاد کرا لیا ہے۔

کرنل قذافی نے لیبیا میں حقیقی اصلاحات نافذ کیں۔ چار سال کے قلیل عرصہ میں صنعتوں۔ اسکولوں۔ کالجوں۔ اسپتالوں اور سڑکوں کی وسیع پیمانے پر تعمیر نے مغربی سیاحوں اور نامہ نگاروں کو بھی لیبیا کی حیرت انگیز ترقی کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ جس کے تحت وسیع صحراؤں اور ریگزاروں کو لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور سرسبز باغوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

کرنل قذافی صحیح معنوں میں ایک سچے مسلمان ہیں۔ انھوں نے اسلامی قوانین کو اپنے ملک میں نافذ کیا ہے، اور غیر اسلامی روایات اور حرکات پر اپنے

ملک میں پابندی عائد کردی ہے۔ وہ اپنے مسلم اور غیر مسلم مہمان رہنماؤں کو قرآن کریم کا نسخہ بطور تحفہ پیش کیا کرتے ہیں۔ دنیائے اسلام کے مصائب ان کے دل کو سب سے زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ہندوستانی اور روسی جارحیت اور فلپائن میں مسلمانوں کے حالیہ قتل عام کے خلاف انھوں نے سب سے زیادہ موثر آواز بلند کی۔ بلاشبہ وہ بیسویں صدی کی دنیائے اسلام کے مجاہد اعظم ہیں۔

راجہ صاحب محمود آباد امیر احمد خاں

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

راجہ صاحب محمود آباد بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ پاکستان کے معماروں میں سے ایک اور چل بسا۔ پاکستان کا ایک اور ستارہ غروب ہو گیا۔ راجہ صاحب جو امیری میں فقیری کرتے تھے۔ وہ درویش صفت انسان جو ہندوستان کے ایک بہت بڑے مہاراجہ ہونے کے باوجود عام آدمیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ جو عام اصطلاح میں عالم نہ تھے لیکن متعدد علوم و فنون میں دستگاہ کامل رکھنے کے ساتھ ساتھ انتہائی باعمل انسان تھے۔ وہ اسلام کے نظریاتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے عملی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس عظیم مذہب کے پیرو اسلام کی روح سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ اقبال نے اس خیال کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

شاعر اور ادیب۔ مقرر اور مفکر۔ صاحب دل اور کردار۔ مصلح اور سیاستداں
اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم با اصول انسان راجہ امیر احمد خاں ۱۹۱۴ء میں لکھنؤ کے
ایک امیر کبیر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شاہانہ ماحول میں پرورش پائی۔ ایک بہت
بڑی ریاست کے چشم و چراغ تھے جس کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپے سالانہ
سے زائد تھی۔ محلوں میں پلنے والا یہ بچہ فقیرانہ مزاج لے کر دنیا میں آیا تھا۔

گھر پر یگانہ روزگار استادوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی
سے فارغ التحصیل ہوئے۔ انگریزی اور اردو۔ فارسی اور عربی کے بہترین مقرر بن کر
ابھرے۔ ان کی تقریروں میں جو مزاح کی چاشنی اور ندرت خیال ہوتا تھا، وہ بہت
کم مقرروں میں دستیاب ہوتا ہے۔ فارسی۔ عربی، اور اردو کے لاتعداد اشعار، اور
اقوال انھیں یاد تھے، جنھیں وہ اپنی تقریروں میں بڑی خوبی سے سموتے تھے۔ ان
کی تقریروں میں طوفانی جوش و خروش تو نہیں ہوتا تھا لیکن وہ بڑی فکر انگیز
ہوتی تھیں اور قلوب میں اتر جاتی تھیں، اور بہت عرصہ تک یاد رہتی تھیں۔

راجہ صاحب کا گھرانہ ابتدا ہی سے انقلابی واقع ہوا تھا۔ ان کے ایک
جد امجد نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی تھی، جس کی بنا پر ان کی جاگیر ضبط ہو گئی
تھی لیکن بعد ازاں بحال کر دی گئی۔ ان کے والد ماجد مہاراجہ محمد علی خاں نے قومی
سیاست میں ایک اہم مقام حاصل کیا۔ صوبہ یو۔پی کے سب سے بڑے تعلقدار
ہونے کے باوجود وہ بڑے آزاد خیال تھے۔ کانگریس اور مسلم لیگ سے وہ دامے
درمے۔ سخنے ہر طور سے وابستہ رہے۔ ان کا مشہور محل قیصر باغ پیلس سارے

کانگریسی اور مسلم لیگی زعما کے لئے کھلا رہتا تھا۔ اور ان کے یہاں مہمان ہونے والوں میں مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ سروجنی نائیڈو۔ پنڈت جواہر لال نہرو علی برادران۔ مولانا حسرت موہانی۔ محمد علی جناح ایسے نامور لیڈر تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے جب تحریک خلافت میں چندہ جمع کرنے کا اعلان کیا تو مہاراجہ محمود آباد نے انھیں سادہ چیک دستخط کر کے دے دیا کہ جتنی رقم چاہیں وہ اس پر لکھ کر بینک سے نکال لیں۔

راجہ امیر احمد خاں ابتدا ہی سے فقیر منش اور درویش صفت واقع ہوئے تھے۔ بٹلر پیلس لکھنؤ میں پل کر بڑے ہونے والے اس لڑکے کو ابتدا ہی سے شان و شوکت سے کوئی رغبت نہ تھی۔ دہلی کے میڈن ہوٹل میں راجہ صاحب کا تعارف محمد علی جناح سے ہوا۔ اس وقت راجہ صاحب کی عمر چھ سال تھی۔ اس وقت سے وہ مسٹر جناح کو چچا کہا کرتے تھے۔ کیمبرج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد راجہ صاحب شانتی نکیتن جانا چاہتے تھے۔ اور سر رابندر ناتھ ٹیگور انھیں لینے کو تیار ہو گئے تھے۔ لیکن اسی دوران میں قائداعظم جب لندن سے واپس آئے تو انھوں نے راجہ صاحب سے کہا "نہیں تم میرے ساتھ کام کرو گے۔ میں تمھاری یونیورسٹی ہوں"۔

ان کے والد مہاراجہ محمود آباد کا ۱۹۳۱ء میں انتقال ہو گیا۔ اور مسٹر جناح اس ریاست کے ایک ٹرسٹی مقرر ہوئے۔ اس وقت سے راجہ امیر احمد خاں کا قائداعظم سے وہ تعلق شروع ہوا۔ جو قائداعظم کی زندگی تک رہا۔ بلاشبہ انھیں قائداعظم سے سب سے زیادہ قربت حاصل تھی۔ وہ ۱۹۳۷ء مسلم لیگ کے

لکھنؤ سیشن میں صدر مجلس استقبالیہ تھے۔ قائد اعظم نے انھیں کل ہند مسلم لیگ کا خزانچی اور ورکنگ کمیٹی کا رکن مقرر کیا۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے ارکان میں وہ سب سے کم عمر لیکن سب سے زیادہ فعال تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب کل ہند مسلم طلبا کی انجمن کو قائم کیا گیا تو راجہ صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے اور ان کی فعال قیادت نے اس انجمن کو ایک بہت موثر ادارہ بنا دیا جس نے قیام پاکستان میں بہت اہم کردار ادا کیا اور سارے برصغیر کے دورے کر کے مسلم عوام کو پاکستان سے روشناس کرایا اور ان میں بیداری پیدا کی۔

راجہ صاحب نے اپنی زندگی کو حصول پاکستان کے لئے وقف کر دیا۔ دامے درمے۔ سخنے انھوں نے پاکستان کی ہر طرح سے خدمت کی۔

راجہ صاحب نے لیکن جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور جس کے لئے انھوں نے اتنا ایثار کیا تھا وہ پاکستان انھیں یہاں نظر نہیں آیا۔ اس لئے انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وزارتوں اور پرمٹوں کی بندر بانٹ میں شامل ہونے اور یہاں کی گندی سیاست میں حصہ لینے کے بجائے انھوں نے اس سے دور رہنے میں اپنی عافیت تصور کی۔ پاکستان میں بڑے بڑے اہم منصبوں کی انھیں پیش کش ہوئی لیکن ایسا شخص جو اپنے نظریات کی تکمیل کے لئے اس سے بہت زیادہ عیش و عشرت کو لات مار چکا ہو، بھلا اس کے جال میں کہاں پھنس سکتا تھا۔ اس لئے اس جنجال سے وہ دور ہی رہا۔

ایک روایت کے مطابق "پاکستان کے ایک صدر نے اپنے وزیر صنعت کے ہاتھ تین کارخانوں کے پرمٹ انھیں بھیجے۔ یہ وزیر راجہ صاحب کے پرانے

واقف کار تھے۔ راجہ صاحب نے اس پیش کش کے جواب میں کہا۔ میں نے ابھی تک صنعت قائم کرنے کی درخواست نہیں دی ہے اور غور کر رہا ہوں کہ میں مزدوروں سے جو سلوک واجب سمجھتا ہوں اس کے ساتھ صنعت کاری ممکن ہو گی یا نہیں۔ جب ان وزیر صاحب نے بہت اصرار کیا تو راجہ صاحب نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ بغیر سرمایہ کے تین کارخانے کیسے قائم ہوں گے۔ انھوں نے جواب دیا۔ ایک پرمٹ فروخت کر کے اتنی رقم آپ کو مل جائے گی کہ آپ دو کارخانے قائم کر سکیں۔ راجہ صاحب نے کہا خیر یہ گفتگو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ میری یہ قیمت تم نے مقرر کی ہے یا صدر صاحب نے؟ اس پر وزیر صنعت کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔"

ایوب خاں کا دور اقتدار تھا۔ مہاجرین دعوے داروں کو ان کے تصدیق شدہ دعاوی کے ۵۰ فیصد حصہ سے کسی ثبوت کے بغیر مارشل لار قانون ۸۹ اور ۹۱ کے تحت محروم کر دیا گیا تھا۔ اس کے خلاف اخباروں میں برابر مضامین اور اداریئے شائع ہو رہے تھے اور اس کالے قانون کو منسوخ کرنے کی ہر روز حمایت کی جا رہی تھی۔ لیکن صاحب اقتدار طبقہ کوئی معقول بات سننے کو تیار نہ تھا۔ میں ایک دن شیخ رحمت اللہ صاحب مرحوم کے ساتھ راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں حاضر ہوا وہ کلفٹن پل سے متصل ایک چھوٹے سے بنگلے میں فروکش تھے۔ اطلاع کرائی فوراً نکل آئے، بڑے اخلاق سے ملے۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ہم لوگوں نے اظہار مدعا کیا۔ کہنے لگے۔ "بھائی میں نے پاکستان میں اپنے لئے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ مہاجرین کا معاملہ ہے مجھ سے جو ہو سکے گا کروں گا۔" پھر تھوڑی دیر سوچ کر کہنے لگے "ایوب خاں سے تو میں نہیں کہوں گا۔ انھوں نے

اگر انکار کر دیا تو مجھے صدمہ ہوگا۔ ہاں نواب کالاباغ سے کہہ سکتا ہوں۔ وہ بڑے ایماندار اور حساس انسان ہیں۔ انھیں اس بات کا علم ہے کہ مہاجرین نے یو۔ پی، بہار، بمبئی وغیرہ میں کتنی جائیدادیں چھوڑی ہیں۔ اور انھیں قیام پاکستان کے لئے مہاجرین کی قربانیوں کا اعتراف بلکہ احساس ہے۔" پھر مجھ سے راجہ صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ غالباً انھوں نے نواب کالاباغ سے اس کی سفارش کی تھی جس کی بنا پر دعوے داروں کو کسٹوڈی کی زمین کے خریداری کے حقوق مل گئے۔ اور خریداری میں آسانیاں پیدا کی گئیں۔ نواب کالاباغ نے دعوے داروں کے وفد سے اس کا تذکرہ بھی کیا تھا کہ "میں ایوب خاں سے بارہا کہہ چکا ہوں کہ مہاجرین کے ساتھ انصاف کیا جائے لیکن وہ تیار نہیں ہوتے۔"

یوں تو راجہ امیر احمد خاں ایسے نفس کش اور فقیر منش انسان کے واقعات زندگی کو بیان کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ لیکن ان کے ایک واقف کار اور ساتھی مختار زمن جنھوں نے انھیں بڑے قریب سے دیکھا ہے چند واقعات کو اچھے انداز میں یوں بیان کیا ہے:

"محلوں کے یہ باسی لندن کے تین کمروں کے فلیٹ میں زندگی گزارتے تھے اسلامک کلچر سنٹر کی ملازمت کرتے۔ اپنا کھانا خود پکاتے اور اپنے برتن خود دھوتے تھے۔ جن کے محل کے سامنے ہاتھی جھولتے تھے، اور جن کے یہاں موٹریں دوڑتی تھیں وہ بس میں سفر کرتے تھے۔ لندن میں جب ان پر دل کا دورہ پڑا تو ان کے صاحبزادے میاں سلیمان اور دوستوں نے مجبور کیا کہ کراچی سے ایک ملازم بلوالیں چنانچہ ایک ملازم کو لندن روانہ کیا گیا۔ ایک دن دوپہر کو میں راجہ صاحب کی

خدمت میں حاضر تھا۔ ملازم سے کہا۔ "میاں کھانا لگوائیے"۔ (ملازم سے اسی طرح باتیں کرتے تھے)۔

ملازم نے کھانا میز پر چن دیا۔ ہم لوگ بیٹھ گئے تو ملازم سے کہا: "آیئے آپ بھی ہاتھ دھو کر بیٹھ جایئے"۔ چنانچہ اس نے بھی ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔

ایک انگریز خاتون ان کی سکریٹری تھیں۔ ایک بار باتوں باتوں میں مجھ سے کہنے لگیں: "یہ تمھارے دوست راجہ بھی عجیب آدمی ہیں"۔

میں نے پوچھا: "کیا ہوا؟"

بولیں جب ٹیلیفون کرتا ہے تو مجھ سے کہتا ہے کہ یہ کال پرائیوٹ تھی نوٹ کرلو۔ میں نوٹ کرلیتی ہوں اور پرائیوٹ کال کے پیسے اپنے جیب سے ادا کرتا ہے۔ حالانکہ دفتر کے عملے کے سبھی لوگ درجنوں پرائیوٹ کال کرتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا: "بی بی کسی زمانے میں ہماری قوم کا کردار ایسا ہی ہوا کرتا تھا یہ اسی کی یادگار ہیں"۔

راجہ صاحب نے محمود آباد ریاست کو ایک کواپریٹیو میں تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا تھا جس میں وہ خود اور سارے کاشتکار ممبر بننے والے تھے۔ میں کاشتکاروں کے اس اجتماع کے موقع پر محمود آباد میں موجود تھا۔ جب انھوں نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا: "اگر میرے محل کا کوئی باسی تم پر ظلم کرے تو محل کو آگ لگادینا۔ لیکن ملک تقسیم ہوگیا اور یہ انقلابی پروگرام آگے نہ بڑھ سکا۔

عالم جوانی میں جب رئیس زادے عیش پرستیوں کی طرف راغب ہوتے ہیں، راجہ صاحب نے نفس کشی کو اپنایا۔ معمولی سے تخت پر سوتے تھے۔ کھدر

پہنتے تھے، اور جَو کی روٹی کھاتے تھے۔"

مختار زمن کی زبانی ایک دوسرا واقعہ سنئے:

"کم و بیش دو سال ہوئے جب لندن میں راجہ صاحب کو دل کا دورہ پڑا مڈل سیکس ہسپتال کے اسپیشل وارڈ میں رکھے گئے۔ لیکن انھوں نے کہنا شروع کیا۔ اکیلے میں طبیعت گھبراتی ہے، چنانچہ جنرل وارڈ میں منتقل کر دیے گئے ان دنوں بنگلہ دیش کا مسئلہ زوروں پر تھا، اور پاکستانیوں اور بنگالیوں میں علیک سلیک بند تھی۔ لندن کا ایک سربرآوردہ بنگالی جو ایک ریستوران کا مالک تھا، اسی وارڈ میں داخل ہوا۔ پندرہ بیس بنگالی روزانہ اسے دیکھنے آتے تھے۔ لیکن وہ راجہ صاحب کی بھی مزاج پرسی کرتے تھے اور ان سے بڑی عزت سے باتیں کرتے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب بنگلہ دیش تحریک کے لیڈر تھے۔ کسی زمانے میں میری بھی ان کی شناسائی تھی، لیکن انھوں نے کہا کہ مجھے پاکستان کے لفظ سے نفرت ہوگئی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی صاحب ایک دن راجہ صاحب کے لئے کھانا لئے چلے آرہے ہیں۔ میں نے طنزاً کہا! "یہ کھانا کیوں لائے ہو، جس کے لئے لائے ہو وہ تو پاکستان کے بانیوں میں ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔ "راجہ صاحب جیسے لوگ پاکستان کے حاکم ہوتے تو ہم بنگلہ دیش کیوں مانگتے۔" میں خاموش ہوگیا۔ راجہ صاحب کے لئے بہت سے لوگ کھانا لاتے اور وہ سب مریضوں کو اکٹھا کرکے کھانا کھلاتے۔ اسپتال میں بھی انھوں نے اپنے جذبۂ اخوت اور شرافت کا نقش ثبت کر دیا۔ نرسیں ان کی خدمت ایسے کرتیں جیسے وہ ان کے باپ ہیں۔

ان کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ میں نے ان کے گھر پر بڑے بڑے حاکموں۔ جرنیلوں۔ لکھ پتیوں کو بھی دیکھا اور دریدہ دامنوں والے پریشان گیسوؤں والے بھی ان کے حاضر باشوں میں تھے۔"

راجہ صاحب ایک ایسے مثالی معاشرے کے خواہاں تھے جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔ جس کی بنیاد اسلامی اخوت۔ مساوات اور انصاف پر رکھی گئی ہو، عیش و عشرت میں پلنے کے باوجود ایک انقلابی مزاج لے کر دنیا میں آئے تھے جس میں اسلام کے عہد زریں کے رجحانات پائے جاتے تھے۔

اسی نظریے کے تحت انھوں نے پاکستان کے حصول کے لئے اپنا تن من دھن سب داؤں پر لگا دیا تھا۔ اور اسی کو پاکستان میں پروان چڑھتا ہوا وہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن جب انھوں نے پاکستان کے حالات' یہاں کا ماحول اس سے بالکل برعکس پایا تو انھیں بڑا دکھ ہوا۔ پاکستان کے نام نہاد لیڈروں کے برعکس راجہ صاحب کے قول و فعل میں انتہائی مطابقت پائی جاتی تھی۔ ان کے خوابوں کی جنت پاکستان کی تیز رفتار زوال پزیرائی اور اس کے معاشرہ کی انتہائی زبوں حالی اور آخر کار پچیس سال کے قلیل عرصہ میں اس کے آدھے حصے کی علیحدگی نے انھیں انتہائی دل شکستہ کر دیا۔

راجہ صاحب کو اپنی خودداری اور اصول پرستی کی وجہ سے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں۔ محلوں میں پلنے والا یہ انسان جس کے اشارے کے سینکڑوں ملازم منتظر رہتے تھے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لندن کے اسلامک کلچر انسٹی ٹیوٹ میں ملازمت کرنے پر مجبور ہوا، اور دل کا مریض ہونے

باوجود وہ اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتا۔ برتن اور مکان اپنے ہاتھ سے صاف کرتا تھا۔ بال بچوں سے ہزاروں میل دور انتہائی مشقت کی زندگی بسر کرنے والا یہ شخص آخر کار ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اپنے معبود حقیقی سے جا ملا۔ درمیانہ طبقہ کے ایسے لوگ اب بھی ملتے ہیں جو سادگی اور ایمانداری کی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن وہ انسان عظیم تر ہے جو عیش و عشرت اور فراوانی کی زندگی کو لات مار کر سادگی ایمانداری اور غریبی کو اپنائے۔ راجہ امیر احمد خاں ایسے ہی انسان تھے۔ مجھے اس وقت اقبال کا یہ شعر رہ رہ کر یاد آرہا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

(دوسرا حصّہ)

شعرا، اُدبا
مفکّرین
معلّم، فن کار

علامہ اقبالؒ

علامہ اقبال سے زندگی میں میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی نہ میں نے انھیں کبھی دیکھا تھا۔ لیکن طالب علمی کے زمانے ہی سے مجھے ان سے جو روحانی تعلق رہا، اس کی بنا پر میں نے ہمیشہ انھیں بہت قریب پایا۔ میرے دل میں اسلام کی جو محبت اور سوز و گداز پایا جاتا ہے وہ بڑی حد تک علامہ اقبال کی شاعری کا مرہونِ منت ہے۔ ان کے اشعار نے آنسوؤں کی شکل میں مجھ سے بہت زیادہ خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ انکی ولولہ انگیز اور پر جوش شاعری نے اسلامی ہند کی بیداری اور نشاۃ ثانیہ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ جو آگے چل کر پاکستان کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مکتب کے ایام ہی سے میں اقبال کی شاعری سے متعارف ہو گیا تھا اور ہمارے ساتھی بچے اقبال کی نظم بچے کی دعا اور ترانہ قومی اور ملی بڑے والہانہ انداز میں پڑھتے تھے۔ میں مسلم ہائی اسکول کاکوری میں جب ساتویں،

آٹھویں درجہ کا طالب علم تو روزانہ صبح کی پریڈ میں اقبال کی نظمیں بچے کی دعا اور ترانۂ ملی چند خوش الحان طلبا، پڑھتے تھے اور باقی طلبا، کورس کی شکل میں اسے دہراتے تھے۔ اس طرح اقبال کی شاعری کا نقش میرے دل پر مکتب اور اسکول ہی کے زمانے سے بہت گہرا ہو گیا تھا۔ جب میں کالج اور یونیورسٹی میں پہنچا اور فارغ التحصیل ہونے کے زمانے میں تھا۔ میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر اقبال ہی رہے۔ ان کی نظمیں مسجد قرطبہ۔ شمع و شاعر۔ خضر راہ۔ طلوعِ اسلام۔ صقلیہ۔ فاطمہ بنت عبداللہ۔ بلاد اسلامیہ۔ شکوہ جواب شکوہ۔ تصویر درد اور حضور رسالت مآب میں پڑھ کر میرے دل میں ہیجان پیدا ہو جاتا۔ اور اکثر رقت طاری ہو جاتی۔ اقبال سے مجھے جو عقیدت رہی ہے اس کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے روحانی پیر ہیں۔ ان کے کلام سے میں نے وجدان، سوز و گداز اور روحانی بالیدگی حاصل کی۔

اقبال سیالکوٹ کے صوفی خاندان میں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے ان کے آباؤ اجداد کشمیری برہمن تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اقبال کے والد مولوی نور احمد بہت دیندار قسم کے صوفی تھے۔ اقبال کی ابتدائی تعلیم اور تربیت میں ان کے والد اور استاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ابتدا ہی سے وہ ایک بہت ہونہار طالب علم تھے، اور انھوں نے تمام امتحانات بڑے اعزاز کے ساتھ پاس کیے۔

مشن کالج سیالکوٹ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اقبال نے ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم، اے کا امتحان بڑے

امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ بعد ازاں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ فلسفہ میں ریڈر مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۰۸ء میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مضمون "ایران میں فلسفہ مابعد الطبیعات کا ارتقا" پر انھیں فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ انھوں نے بیرسٹری بھی پاس کیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس آگئے، جہاں وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی ادب کے جزوقتی پروفیسر مقرر ہوئے۔ ساتھ ساتھ انھیں وکالت کرنے کی بھی اجازت تھی، بعد ازاں انھوں نے گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اقبال کی شہرت کی ابتدا انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس سے ہوئی جہاں انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "نالۂ یتیم" سنائی۔ جس نے سامعین کو مسحور کر دیا۔ رسالہ مخزن نے اقبال کو بحیثیت شاعر اردو دنیا سے روشناس کرایا۔ اردو شاعری کے افق پر ابھرنے والے اس روشن آفتاب نے اپنی ضوفشانی سے لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا، اور بہت سرعت کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، اس نے بین الاقوامی فضا کو منور کر دیا۔

ابتدا میں اقبال ایک غزل گو اور قومی شاعر تھے۔ انھوں نے اس زمانہ میں داغ دہلوی سے اصلاح سخن لی۔ لیکن جلد ہی وہ اصلاح سے آزاد ہو گئے۔ اس زمانے میں ان کی قومی شاعری کی شاہکار نظمیں ہمالہ۔ نیا شوالہ۔ قومی ترانہ اور تصویر درد ہیں۔ قیام یورپ میں نوجوان اقبال نے متعدد دلکش رومانی نظمیں لکھیں جو اردو شاعری کا بے بہا سرمایہ ہیں، اور جو ہمیں شیلے۔ کیٹس اور ٹینی سن کی

یاد دلاتی ہیں۔ ان میں جلوۂ حسن۔ ایک شام، کلی، اختر صبح۔ محبت حقیقت حسن بہت مشہور ہیں۔ یورپ کے قیام میں انھیں قومیت کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ جس نے انسانوں میں اتحاد پیدا کرنے کے بجائے انھیں قوموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اور یہی قومیت عالمی انتشار اور افتراق کا باعث ہو کر دو عظیم جنگوں میں رونما ہو چکی ہے۔ اقبال کی دور بیں نگاہوں نے یہ دیکھ لیا کہ قومیت اسلام کی بین الاقوامیت اور فروغ انسانیت کے لئے انتہائی مہلک اور تباہ کن ہے۔ اسی وجہ سے وہ قومیت کے بجائے اسلام کی بین الاقوامیت اور انسانیت کے علمبردار ہو گئے۔ قیام یورپ کے دوران اقبال نے دیکھا کہ قومیت کے جنون نے یورپ میں ایک طوفان بدتمیزی مچا رکھی تھی۔ اور یورپ کے ممالک اپنی قومی ترقی کے لئے ایک دوسرے سے برسر پیکار نظر آتے ہیں اس نے محسوس کیا کہ قومیت انسانی ترقی کے لئے زہر قاتل سے کم نہیں ہے انگلستان کا مشہور شاعر ورڈ سورتھ ابتدا میں انقلاب فرانس کا بڑا مداح تھا۔ لیکن جب اس انقلاب کے عیوب اس پر عیاں ہوئے تو وہ اس کا سخت مخالف بن گیا۔ ایک فاضل مغربی مبصر کا قول ہے کہ قدرت کے قوانین عالمگیر ہیں نہ کہ نیشنل۔ اس لئے نیشنلزم خلاف فطرت ہے۔ ایک دوسرے فاضل مغربی مصنف کا قول ہے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا لیکن شیطان نے اسے قوموں میں تقسیم کر دیا۔ رینان کہتا ہے کہ اسلام وطنیت جنس، نسل اور رنگ کے قیود سے آزاد کر دیتا ہے۔ اقبال پر جب قومیت کی خرابیاں آشکار ہوئیں تو وہ کہنے لگا:

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کا یہ ذہنی ارتقاء بالکل فطری تھا۔ اس لئے اس کی قومی شاعری کو اس کی ملی شاعری کا تضاد نہیں کہا جا سکتا۔ اس قسم کا فطری ارتقائی تضاد دنیا کے تمام بڑے شعرا اور مفکروں میں پایا جاتا ہے۔

اقبال کی رومانی اور قدرتی مناظر سے متعلق شاعری ورڈسورتھ، شیلی اور ٹینی سن کی بہترین شاعری کی ہم پلہ ہے۔ اس میں حقیقت کی عکاسی کے ساتھ تخیل کی بہت لطیف آمیزش ملتی ہے۔ اس میں زبان اور بیان کی ساری خوبیاں ملتی ہیں۔ ہمالیہ سے متعلق وہ کہتا ہے:

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

ڈوبتے ہوئے آفتاب کی ایسی لطیف مکمل اور مختصر منظر نگاری میری نظر سے نہیں گزری۔

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام
لئے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام

اردو میں رومانی شاعری کے چند بہترین نمونے بھی اقبال کے یہاں ملتے ہیں جن کا مقابلہ دنیا کے کسی زبان کی شاعری سے کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت حسن ملاحظہ ہو:

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا — جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا — شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمو اس کی — وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی — فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو — فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے — کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اس میں فلسفہ حسن کو کتنے لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں محاکات تخییل اور صنعت الفاظ کی اتنی حسین آمیزش ملتی ہے جو پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ اسی طرح کلی میں اقبال نے رومانی شاعری کا ایک غیر فانی نمونہ پیش کیا ہے۔

جب دکھاتی ہے سحر عارض رنگیں اپنا — کھول دیتی ہے کلی سینہ زریں اپنا
جلوہ آشام ہے یہ صبح کے میخانے میں — زندگی اس کی ہے خورشید کے پیمانے میں

سامنے مہر کے دل چیر کے رکھ دیتی ہے
کس قدر سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے

مرے خورشید کبھی تو بھی اٹھا اپنی نقاب — بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بیتاب
تیرے جلوے کا نشیمن ہو مرے سینے میں — عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں
زندگی ہو ترا نظارہ مرے دل کے لیے — روشنی ہو تری گہوارہ مرے دل کے لیے
ذرہ ذرہ ہو مرا پھر طرب اندوز حیات — ہو عیاں جوہر اندیشہ میں پھر سوز حیات
اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں — صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں

جانِ مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کر دوں

اقبال کی شاعری کا نقطۂ عروج درحقیقت ان کی ملی شاعری اور ان کا فلسفہ خودی اور بیخودی ہے جو ان کی لافانی فارسی نظموں اسرار خودی اور رموز بیخودی میں پایا جاتا ہے۔ اس شاعری میں اقبال کی ذہنی اور خیالی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال جو اپنی شاعری کے پہلے دور میں ایک قومی شاعر۔ دوسرے دور یعنی قیام یورپ کے دوران ایک رنگین بیان رومانی شاعر۔ اپنے تیسرے اور آخری دور میں ایک اسلامی اور فلسفی شاعر بن گیا۔ حالی نے شاعری کو "قوم کی زبان"۔ اقبال نے شاعر کو" دیدہ بینائے قوم" اور اگلے زمانے میں کسی مفکر نے شاعری کو "جزویست از پیغمبری" قرار دیا ہے۔ اقبال کے اس دور کی شاعری جو قرآن اور اسلام کے عالمگیر اصولوں کی حامل ہے شاعری اور شاعر کے مندرجہ بالا صفات پر پوری اترتی ہے۔

اقبال کی شہرۂ آفاق نظمیں جو اپنے جوش و خروش، بلند پایہ خیالات زبان کی لطافت۔ جذبات کی گہرائی اور قرآنی فلسفہ کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی شاعری کا نقطۂ کمال ہیں ان میں شمع و شاعر۔ شکوہ جواب شکوہ۔ صقلیہ طلوع اسلام۔ مسجد قرطبہ اور بلاد اسلامیہ شامل ہیں۔ بقول محی الدین قادری:

" حالی اور شبلی کی قومی نظمیں محض نقش اولین تھیں۔ اقبال نے جدید شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا"

یورپ کی واپسی پر راستے میں جب اقبال صیقلہ (سسلی) کے قریب

گزرے تو اس کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا۔ انھوں نے برجستہ کہا:

رولے اب، دل کھول کے اے دیدہ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرانشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
غلغلوں سے جن کے لذت گیر اتبک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

گورستان شاہی میں اقبال مسلمانوں کے زوال کا کتنے مؤثر اور درد انگیز الفاظ میں نوحہ کرتے ہیں:

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا | آسماں سے ابر آزادی اٹھا۔ برسا۔ گیا
دہر کو دیتے ہیں موتی دیدہ گریاں کے ہم | آخری بادل ہیں اک گزرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں | برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

شکوہ میں اقبال نے خداوند تعالیٰ کے حضور میں دین خداوندی کی تبلیغ اور اشاعت میں مومنوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کے زوال کا شکوہ کیا ہے۔ اس نظم کے اشعار کا مقابلہ دنیا کی بہترین رزمیہ شاعری

سے کیا جا سکتا ہے۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

جوابِ شکوہ میں خدائے ذوالجلال کی جانب سے اقبال نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب بیان کئے ہیں۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ہر کوئی مست مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اقبال کی شاعری قنوطیت کے برخلاف رجائیت۔ عمل۔ خود اعتمادی اور امید کی پیغامبر ہے۔ شمع و شاعر میں وہ کتنے لطیف پیرائے میں نغمہ سرا ہے:

کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو،
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو
قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے

عمل اور حرکت ہیں زندگی اور ترقی کا راز پوشیدہ ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

خود اعتمادی اور یقین محکم ہی کامیابی کے ضامن ہیں۔ طلوعِ اسلام میں وہ اسی عمل اور یقین کا سبق پڑھاتے ہیں:

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

مجھے اس بات کا یقین ہے کہ عمل پیہم اور یقین محکم کی اتنی خوبصورت اور مؤثر پیرائے میں تلقین دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی ہے۔

اقبال کے خیال میں زندگی جاوداں اور لافانی ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز فردا سے نہ ناپ

جاوداں، پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اقبال کا فارسی کلام اس کے فلسفہ خودی۔ بیخودی نیز حرکت اور عمل کا آئینہ دار ہے۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی میں اس نے پیر رومی کے فلسفہ خودی اور بیخودی کو بڑے اچھوتے اور دل کش انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نے حافظ کے فلسفۂ تقدیر اور صوفیاء کی رہبانیت (ترک دنیا) کو اسلام کی تعلیم کے منافی قرار دیا ہے اور رومی اپنے صوفیانہ کلام میں جو رجائیت۔ عمل اور جد وجہد کی تلقین کرتا ہے۔ اس کو اقبال نے اپنی لازوال فارسی مثنویوں اسرار خودی اور رموز بیخودی میں اپنایا ہے۔ ان کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے۔ اسی طرح اقبال نے جرمنی کے شہرہ آفاق شاعر گوئٹے (GOETHE) کے سلام مغرب کے جواب میں پیام مشرق اور دانٹے (DANTE) کی ڈوائن کمیڈی (DIVINE COMEDY) کے جواب میں جاوید نامہ فارسی نظم میں تحریر کر کے مشرقی ادب میں ایک لازوال اور بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کا انتقال ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو ہوا۔ اسی زمانے میں برصغیر ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کی چپقلش اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اقبال ہی نے سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس

منعقدہ الہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ لیکن ان کے انتقال کی خبر سن کر الہ آباد کے عوام نے ایک شاندار تعزیتی جلسہ محمد علی پارک میں منعقد کیا جس میں کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو اور دیگر زعما مثلاً ڈاکٹر اشرف۔ شاستری رام منوہر لوہیا نے اقبال کو بڑے شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ پنڈت نہرو اور ڈاکٹر اشرف نے تو ان کے اشعار کے حوالے سے انھیں دنیا کا عظیم ترین شاعر اور فخر ہندوستان کے القاب سے نوازا۔ یہ تو غیروں کی بات ہے۔ لیکن اقبال کے اپنے پاکستان میں کبھی کسی وزیر یا سفیر یا صدر کو اس بات کی توفیق نہیں ہوئی کہ وہ یوم اقبال کے تقاریب میں شریک ہو کر اقبال کی شان میں کوئی کلمہ خیر ادا کر دیتا۔

۱۹۷۳ء میں ہندوستان کی علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹیوں میں اقبال پر چار چار روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں وزیروں اور دانشوروں سبھی نے حصہ لیا۔ لیکن پاکستان کی کسی یونیورسٹی کو اس قسم کی تقریب منعقد کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

ایک زمانہ تھا جب اقبال کا روح پرور کلام ہندوستانی مسلمانوں کے گھر گھر میں گونجتا تھا۔ اس کی بچوں کی دعا۔ ترانہ ملی۔ دعا۔ شکوہ جواب شکوہ، کا گھر گھر چرچا تھا۔ ہندوستانی مسلمان بچوں کو قرآن کے بعد انھیں نظموں کو یاد کرایا جاتا تھا۔ کوئی اسلامی مدرسہ یا اسکول ایسا نہ تھا جہاں اقبال کی ان نظموں کو بچوں کے گوش گزار نہ کرایا جاتا ہو۔

یہ قیام پاکستان سے پہلے کا زمانہ تھا، جب حصولِ اقتدار اور طمع مال

نے ہندی مسلمانوں کی اخلاقی قدروں کو پامال نہیں کیا تھا۔ وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرتے تھے۔ ان دنوں میں مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی کی پرخلوص اور پرجوش قیادت اور شاعر اسلام علامہ اقبال کی روح پرور اور ولولہ انگیز شاعری نے ہندی مسلمانوں میں بیداری اور ان کی نشاۃ ثانیہ یعنی حصول پاکستان میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس زمانے میں اقبال کی شاعری کے چرچے گھر گھر ہوئے۔ روح اقبال۔ اقبال کا تعلیمی فلسفہ (سیدین) اور اسی قسم کی سینکڑوں تصانیف اور ہزاروں بلند پایہ مضامین اقبال کی شاعری اور فلسفہ سے متعلق ہندوستان اور بیرون ہند کے موقر جرائد میں لکھے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد سرکاری مالی امداد پر چلنے والی اقبال اکیڈمی نے اقبال کو روشناس کرانے کے لئے اور کلام کو مقبول کرنے کے لئے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا۔ جتنا قیام پاکستان سے قبل اس برصغیر کے مسلمانوں نے اقبال کے روح پرور کلام کو عام کرنے اور ہندوستانی دانشوروں نے اقبال کے کلام کو متعارف کرانے سے متعلق کیا تھا۔ پاکستان نے اقبال سے متعلق بہت بھونڈے انداز میں پروپگنڈا کیا ہے جس سے عوام میں اقبال سے رغبت اور محبت پیدا ہونے کے بجائے اس سے کسی حد تک نفرت اور کراہیت پیدا ہوگئی ہے۔ یوم اقبال کے سلسلے میں اقبال اکیڈمی کی مجالس میں میں نے کئی سال شرکت کی ہے غیر ملکی ادیبوں کی چند بے جان تقاریر اور اقبال کے چند مقربوں کی بے ربط باتوں، اور اس کے بعد ہوٹل میٹروپول کے وسیع لان پر چائے کے ساتھ

گپ شپ کے سوا مجھے وہاں کچھ بھی نہیں ملا۔ غیر منقسم ہندوستان کے بڑے بڑے علمی اور تعلیمی اداروں کو تو چھوڑیئے معمولی معمولی اسلامی مدرسوں اور اسکولوں میں یوم اقبال اس سے کہیں زیادہ جوش و خروش سے منایا جاتا تھا اور سامعین اپنے قلوب میں اقبال اور اس کے زندہ جاوید پیغام کے انمٹ نقوش لے کر گھر لوٹتے تھے۔ وہ اب سب کیا ہوا۔ درحقیقت پاکستان نے مسلمان بچوں کو اقبال سے دور سے دور تر کر دیا۔

اقبال نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا وہ تو خواب ہی رہ گیا۔ آج کا پاکستان درحقیقت اقبال کے پاکستان کا مذاق ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اقبال پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں مقبول ہو رہا ہے۔ پاکستانی قوم تو اقبال اور اس کی تعلیمات کو بھولتی جا رہی ہے اور ان سے دور سے دور تر ہوتی جا رہی ہے، لیکن ہندوستان ان کی تعلیمات سے وجدان حاصل کرتا ہے اور اقبال کا خودی رجائیت اور حرکت کا فلسفہ ان کے تخیلات کی منتہا اور ان کی سربلندیوں کا ذریعہ ثابت ہوا ہے۔

اقبال ایسا دانائے راز صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے، جو اقوام عالم کو شمع ہدایت دکھاتا ہے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات،
تا بہ بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

شاہ محمد سلیمان

الہ آباد ہائی کورٹ کا خاص عدالتی کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آگے کی صف میں ملک کے ممتاز وکلاء بیٹھے ہوئے تھے جو ہندوستان کے ہر صوبہ سے میرٹھ سازش کے مقدمہ میں ماخوذ حضرات کی پیروی کرنے آئے تھے سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جسے انگریز غدر کے نام سے پکارتے ہیں میرٹھ کی سازش سب سے بڑی سازش تھی، جو اس برصغیر میں برطانوی حکومت کے خلاف کی گئی۔ ان وکلاء میں جنہوں نے درجنوں تعلیم یافتہ ماخوذین کی پیروی کرنے کے لئے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کی تھیں، ایسے نامور وکلاء جیسے سر تیج بہادر سپرو۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی۔ سری نواس آئنگر۔ مسٹر بی کے داس۔ مسٹر پیارے لال بیزجی۔ مسٹر آصف علی اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو شامل تھے۔ عدالت کی صدارت کے فرائض ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شاہ محمد سلیمان اور ان کی اعانت جسٹس ینگ کر رہے تھے۔

یہ مقدمہ جو مجسٹریٹ کی عدالت میں دو سال تک چلتا رہا اور جس نے سشن کورٹ میں چار سال سے زائد عرصہ لیا تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ ہائی کورٹ میں بھی یہ برسوں چلے گا۔ لیکن سب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ہائی کورٹ میں اپیل اور اس پر فیصلہ سبھی کچھ صرف آٹھ روز میں ختم ہو گیا اور سر شاہ محمد سلیمان نے اس مقدمہ میں جو فیصلہ دیا وہ برصغیر میں قانون کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں مسٹر جے۔ ایچ مورگن کے سی نے جو برطانیہ کے ممتاز ترین آئینی وکلاء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کلکتہ یونیورسٹی ٹیگور لالکچرز میں فیڈرل کورٹ کے مقدمہ نمبر ۱ کے فیصلہ کے متعلق کہا:

"ابھی میں اس اہم مقدمہ میں فیڈرل کورٹ نئی دہلی کے فیصلے پڑھ رہا تھا۔ ان میں سے ایک فیصلہ بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے اور اس موضوع پر قانونی شاہکار شمار کیے جانے کے قابل ہے یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جو دارالامراء اور پریوی کونسل کے اعلیٰ ترین روایات کا حامل ہے۔ اس سے میری مراد جسٹس سلیمان کے معرکۃ الآرا فیصلہ سے ہے۔ خیال کی گہرائی اور نظریہ کی وسعت، تجزیہ اور ترتیب کی خوبیوں، نیز طرز ادا کی خوبصورتی اور زبان کی روانی کے لحاظ سے اس کا شمار ان چند بہترین فیصلوں میں کیا جاتا ہے جسے مجھے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ ہندوستان کا ہر شخص جو اس کے مستقبل کے آئین میں دلچسپی رکھتا اُسے اس فیصلہ کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔"

گندمی رنگ، چھوٹا قد، بڑی بڑی روشن آنکھیں، چہرہ سے انتہائی ذہانت اور عادت واطوار سے عجز و انکساری ٹپکتی تھی۔ یہ تھے شاہ محمد سلیمان جو ایک جامع الصفات شخصیت کے مالک ہوئے جونپور (یو۔پی) کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے — ان کے آبا و اجداد میں ایک صاحب ملا محمود مشہور ماہر طبیعیات ہندوستان میں نیوٹن کے ہم عصر اور شمس البلاغہ کے مصنف تھے۔ شاہ محمد سلیمان کے والد بزرگوار شاہ محمد عثمان جونپور کے ایک ممتاز وکیل تھے۔

نوجوان سلیمان کو ابتدا ہی سے حصول علم سے بہت شغف تھا۔ اور اپنی تعلیم میں وہ بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۰۶ء میں بی اے پاس کیا اور کامیاب طلباء کے سرفہرست رہے۔ صوبائی حکومت نے اس بناء پر انھیں غیر ملک میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظیفہ دیا۔ شاہ سلیمان نے انگلستان کی مشہور کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور سنہ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے اس یونیورسٹی سے ریاضی میں ٹرپیاس اور سنہ ۱۹۱۰ء میں قانون میں ٹرپیاس حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں انگلستان میں وہ انڈین سول سروس کے امتحان میں شریک ہوئے لیکن خوش قسمتی سے وہ اس میں منتخب نہ ہو سکے، ورنہ سول سروس کے خشک دفتری کام ہندوستان کو اپنے ایک بہترین قانونی اور سائنسی شخصیت سے محروم کر دیتے۔ انھوں نے سول سروس کے امتحان میں دوبارہ بیٹھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور بیرسٹری کے پیشہ کو ترجیح دی۔ انھوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں ڈبلن (آئرلینڈ) سے ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری حاصل کی۔

شاہ محمد سلیمان سنہ ۱۹۱۱ء میں ہندوستان واپس آئے اور جونپور میں اپنے والد کے ساتھ وکالت شروع کی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے کے لئے الہ آباد منتقل ہو گئے۔ یہاں قانونی پیشے سے متعلق شاہ محمد سلیمان کی وہ شاندار زندگی شروع ہوئی جو ہندوستان کی تاریخ میں لاثانی ہے۔ قدرت کی جانب سے انھیں یادداشت کی حیرت انگیز قوت اور مسائل کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت عطا ہوئی تھی۔ انھیں حقیقت شناس نظر اور مشکل سے مشکل معاملات کی تہ تک پہنچنے کی اہلیت عطا ہوئی تھی، جس نے انھیں زندگی کے مختلف اور متضاد شعبوں میں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز حاصل کیا۔ ان کی زندگی درحقیقت بڑے بڑے کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے، اور گوناگوں کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ میں جہاں انھیں پنڈت موتی لال نہرو، سندر لال، سر راس المسٹن، پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو۔ اور مولوی غلام مجتبیٰ ایسے نامور اور عظیم قانون دانوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ شاہ محمد سلیمان نے جلد ہی اپنا مقام پیدا کر لیا۔ رانی شرکوٹ۔ بمرولی۔ دھرم پور اور پلوال کے مقدمات ان کی ابتدائی کامیابی کے حامل ہیں۔ الہ آباد ہائی کورٹ کا انگریز چیف جسٹس ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے ۳۴ سال کی کم عمر میں انھیں ہائی کورٹ جج کا عہدہ پیش کیا۔

سر شاہ محمد سلیمان نے ۴۳ سال کی عمر میں الہ آباد ہائی کورٹ کی چیف جسٹس

کی حیثیت سے کام کیا۔ اور ۴۶ سال کی عمر میں وہ اس ہائی کورٹ کے مستقل چیف جسٹس ہو گئے۔ پانچ سال بعد وہ ہندوستان کی فیڈرل کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور اس طرح انھوں نے نہ صرف برطانوی دولت مشترکہ بلکہ قانون دانوں کی دنیا میں ایک ریکارڈ قائم کیا۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی حیثیت سے سرشاہ سلیمان نے میرٹھ سازش کے مقدمہ میں اپنا معرکۃ الآرا فیصلہ سنایا جو قانون کی دنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

سر سلیمان نے برطانوی سامراجیت کے اس تاریک دور میں قانون کی آزادی اور بالادستی کو برقرار رکھا۔ انھوں نے حکومت اور انتظامیہ یا قانون ساز اسمبلی کو قانونی چارہ جوئی اور انصاف کے کاموں میں کبھی دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں دی۔

سرشاہ ایک گوناگوں اور ہمہ داں شخصیت کے مالک تھے۔ اور انھوں نے علم و فن کے مختلف شعبوں میں نمایاں امتیاز حاصل کیا ہے۔ وہ ایک ادارہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ایک سربرآوردہ ماہر تعلیم تھے جو متعدد تعلیمی اداروں کی ترقی میں انتہائی دلچسپی لیتے تھے، اور ان اداروں پر ان کی شخصیت کی چھاپ بہت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ متعدد تعلیمی اداروں کے وہ بانی صدر رہ چکے ہیں۔ کافی عرصہ تک وہ الہ آباد یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ اور انتظامی کونسل کے ممتاز رکن رہے۔ یو، پی کی تعلیمی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے سنہ ۱۹۲۴ء میں بدایوں میں اس کانفرنس کو دوبارہ زندہ کیا۔ سنہ ۱۹۲۸ء میں انھوں نے تمام ہند مسلم تعلیمی کانفرنس کی اجمیر میں

صدارت کی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں موصوف نے تعلیمی نظام میں انقلابی تبدیلی کی سفارش کی اور تعلیم کے فنی۔ سائنسی اور پیشہ ورانہ پہلوؤں پر زور دیا۔ انھوں نے ڈھاکہ۔ علی گڑھ۔ حیدرآباد (دکن) اور آگرہ کی یونیورسیٹیوں کے کنوکیشن (سالانہ جلسہ تقسیم اسناد) میں انتہائی پر مغز اور مفید خطبۂ صدارت دیا، جو زبان کی سلاست اور عملی نظریات میں آپ اپنی مثال ہیں۔

شاہ محمد سلیمان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس وقت اعزازی وائس چانسلر مقرر ہوئے جب وہ اپنے تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہی تھی۔ اور کئی سال تک اپنی پرخلوص خدمات اور انتھک کوششوں کے ذریعہ انھوں نے یونیورسٹی کو نہ صرف تباہی سے بچایا بلکہ اس کو ترقی کے بام عروج پر پہنچایا۔ انھوں نے یونیورسٹی میں متعدد مفید اصلاحات نافذ کیں اور ایسی دور رس حکمت عملیوں پر کاربند ہوئے جس نے یونیورسٹی کو مالی اور انتظامی بحران سے بچا کر اسے شاہراہِ ترقی پر لگا دیا۔ موصوف نے یونیورسٹی میں تعلیم نسواں کو بڑا فروغ دیا۔ اور اردو کو بی اے میں ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے نافذ کیا۔ انھوں نے یونیورسٹی کی مالی حالت کو سدھارا اور پانی کی فراہمی نیز زرعی اور فنی انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے لئے راہ ہموار کی۔ ان کی فعال شخصیت نے تعلیم کے مختلف مفید شعبوں میں طلباء کے اندر صحت مند مقابلہ کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اس طرح مسلم یونیورسٹی کے طلباء مقابلے کے امتحانات میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں کامیاب ہونے لگے۔ سر شاہ نے مسلم یونیورسٹی کو اعلیٰ سائنسی تحقیق کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔

سر شاہ محمد سلیمان کو مسلم یونیورسٹی کی اعزازی وائس چانسلری قبول

کر کے کافی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ وہ دہلی میں ہندوستانی فیڈرل کورٹ کے جج تھے اور ہر ہفتہ وہ دہلی سے علی گڑھ آیا کرتے تھے اور اس کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے بلکہ وہ علی گڑھ کے دوران قیام طلباء کے ہوسٹلوں میں پکا ہوا کھانا کھاتے اور اپنی جیب سے اس کی قیمت ادا کرتے تھے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ان کے تعلق کی وجہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی اس سب سے بڑی درسگاہ میں اعلیٰ سائنسی اور تاریخی تحقیق کے کام کو بڑی تقویت پہنچی اور علمی اور مالی اعتبار سے یہ یونیورسٹی مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو گئی۔

سر شاہ سالہا سال تک دہلی کے مشہور اینگلو عربک کالج کے صدر رہے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور کل ہند تعلیم بالغان کانفرنس کے صدارتی خطبوں میں انھوں نے ان مسائل کا عملی حل پیش کیا جو اس وقت تعلیمی شعبوں میں برصغیر کو درپیش تھے۔

شاہ سلیمان ایک نامور ادیب بھی تھے۔ وہ شاعری کا بہترین ذوق رکھتے تھے اور انھوں نے متعدد کل ہند مشاعروں کی صدارت کی، شعراء اور دانشوروں کو اپنے پر مغز خطبہ سے مستفیض کیا۔ شوق قدوائی کی شہرۂ آفاق مثنوی "عالم خیال" کو سر شاہ نے ایڈٹ کیا اور اس پر ایک محققانہ دیباچہ لکھا۔

ریاضی اور سائنس کے میدان میں سر سلیمان نے اپنی جامع الصفات اور ہمہ داں شخصیت کے لافانی نقوش چھوڑے ہیں۔ انھوں نے آئینسٹائن کے مشہور نظریۂ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) کی صحت کو چیلنج کیا۔ نیوٹن کے نظریہ کشش اور آئینسٹائن کے نظریہ اضافیت میں جو خامیاں اور غلط اعداد و شمار پائے جاتے

تھے۔ سر سلیمان نے انھیں درست کرنے کے لئے علم ریاضی میں بہت کار آمد تحقیق کی۔ اس کام میں دنیا کے متعدد نامور سائنس دانوں نے ان کی حمایت کی اور بعد ازاں مشاہدۂ قدرت نے ان کے ابتدائی نظریات اور نتائج کو صحیح ثابت کیا۔ لیکن وہ اپنی تحقیق کو مکمل کرنے کے لئے زندہ نہیں رہے۔ اور ۵۲ سال کی عمر میں سنہ ۱۹۴۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سر شاہ سلیمان حقیقی معنوں میں ایک بہترین انسان تھے۔ ایک سائنسداں جج۔ ماہر تعلیم اور ادیب کی نسبت بہ حیثیت انسان ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ اتنے عظیم شخصیت کے مالک ہوتے ہوئے بھی سراپا انکسار تھے۔ غرور کا کوئی شائبہ بھی ان میں پایا نہیں جاتا تھا۔ وہ منکسر مزاجی اور اخلاق کا مجسمہ تھے۔ وہ اپنے ماتحت عملے، یہاں تک کہ اپنے چپراسیوں کو بھی سلام کرنے اور ان کی مزاج پرسی کرنے میں سبقت کرتے تھے۔ ان کے گھر پر امیر غریب برابر تھے۔ اور ان میں کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا تھا۔ عید اور بقر عید میں بڑے اور چھوٹے۔ اعلیٰ حکام اور چپراسیوں سے وہ یکساں طور پر بغلگیر ہوتے تھے اور سب کو اپنے ہاتھ سے شیرینی پیش کرتے تھے۔ اس طرح چھوٹے اور بڑے میں مساوات برت کر وہ پیغمبر اسلام کے ارشادات کی حقیقی تعمیل کرتے تھے۔

سر شاہ محمد سلیمان نے ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو ۵۲ سال کی عمر میں دہلی میں انتقال کیا۔ ان کے کارناموں کا آفتاب نصف النہار تک پہنچنے سے قبل ہی غروب ہو گیا۔

ان کے انتقال سے برصغیر کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اس کا ماتم سارے ہندوستان اور بیرونی دنیا میں منایا گیا۔ ان کے جنازے میں ہزاروں لاکھوں سوگوار شریک تھے۔ جن میں قائد اعظم محمد علی جناح۔ سر محمد یعقوب مسٹر اکبر حیدری قابلِ ذکر ہیں۔ انھیں نظام الدین میں حضرت امیر خسرو کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

کسی شاعر نے سر شاہ سلیمان ایسے عظیم انسانوں کے لئے کیا خوب کہا ہے :

روح امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

مولوی عبدالحق

کراچی تیری خاک میں کیسے کیسے لعل و گہر۔ کیسے کیسے گنجہائے گرانمایہ، اور کیسی کیسی یگانۂ روزگار ہستیاں پوشیدہ ہیں۔ بقول شاعر

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تونے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے

تیری خاک میں بابائے قوم معمار پاکستان، قائد اعظم محمد علی جناح، ان کی ہمشیرہ خاتون پاکستان فاطمہ جناح۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علیخان پاکستان کے عظیم اور پرخلوص رہنما سردار عبدالرب نشتر، نیز تحریک خلافت کے پرجوش مبلغین اور رہنما شعیب قریشی اور عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) ابدی نیند سو رہے ہیں۔ تیری ہی خاک میں اس صدی کے عظیم ترین محدث مولانا شبیر احمد عثمانی۔ جدوجہد پاکستان کے نامور مبلغ مولانا عبدالحامد بدایونی اور اردو کے مایۂ ناز ادیب، اور سیرۃ النبی کے شہرۂ آفاق مصنف سید سلیمان ندوی محو خواب ہیں۔

یتری ہی خاک میں سر سید احمد خاں کے بعد اردو کے سب سے بڑے محسن بابائے اردو مولوی عبدالحق اس صدی میں اردو کے عظیم ترین ادیب اور جامع الکمالات شخصیت علامہ نیاز فتحپوری۔ پاکستانی صحافت کے روشن ترین ستارے الطاف حسین برصغیر ہندو پاکستان کے نامور ترین سارنگی نواز استاد بندو خاں اور شہرۂ آفاق مصور فیضی راحمین اور ان کی اہلیہ نامور ادیبہ عطیہ بیگم، نیز نظریاتی موسیقی کے ماہرین میاں اختر جوناگڑھی اور شاہد احمد دہلوی سو رہے ہیں۔

ان میں سے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے پہلی بار شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع مجھے کراچی میں ملا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں حیات تھے۔ ان کی حکومت نے ازراہ بندہ پروری انجمن ترقی اردو کو پرنسس اسٹریٹ پر ایک عمارت الاٹ کردی تھی۔ جس کے ایک قطعہ میں اردو کالج قائم تھا اور دوسرے قطعہ میں انجمن ترقی اردو کا دفتر۔ کتب خانہ اور اس کے پانچویں قطعے پر بابائے اردو کی رہائش گاہ تھی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کا نشیمن تھا۔ سینکڑوں زینے طے کرکے جب میں ہانپتا کانپتا وہاں پہنچا تو میرے ایسے نوجوان کی سانس پھول رہی تھی، اور بات نہیں کی جاتی تھی۔ مجھے اس پیرانہ سالی جوان ہمت انسان پر تعجب ہوا جو روزانہ کئی بار اس مشق ستم کا شکار ہوتا رہا ہوگا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ مولوی عبدالحق نے زندگی بھر اردو کے لیے مخالفین سے جنگ کی، ان کی زندگی کے آخری ایام میں یہ جنگ زیادہ شدید ہو گئی تھی۔ ساتھ ساتھ زندگی کی تن آسانیوں سے بھی وہ برابر برسرِ پیکار رہے اور اس کی ایک مثال بابائے اردو کی وہ مشقت

تھی جو پیرانہ سالی میں سینکڑوں زینے طے کر کے انھیں اپنی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لئے کرنی پڑتی تھی۔

مولوی صاحب کی رہائش گاہ میں تین چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک کمرے میں ان کا نجی کتب خانہ اور نشست گاہ تھی۔ یہیں وہ روزانہ بڑی پابندی اوقات سے تحقیق تصنیف اور تالیف کے کام سرانجام دیتے تھے۔ ایک کمرہ ان کے آرام کے لئے مخصوص تھا، اور ایک چھوٹے کمرے میں اسٹور تھا، جس میں ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔ سامنے صحن تھا جس کے چہار جانب پھولوں کے گملے قرینے سے آراستہ تھے۔ ایک جانب ایک چھوٹا سا باورچی خانہ، پائخانہ اور غسل خانہ تھا۔

بابائے اردو بڑے وضعدار خوش اوقات اور پابند اصول انسان تھے۔ زندگی ان کے لئے مسلسل جدوجہد کا نام تھی۔ اور زندگی کی آخری سانس تک وہ اسی جدوجہد میں مصروف رہے۔ وہ حقیقی معنوں میں بابائے اردو تھے۔ سرسید احمد خاں کے بعد وہ اردو کے سب سے بڑے علمبردار اور خدمت گزار تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی اردو کی ترویج اور ترقی کے لئے وقف کردی تھی۔

اپنی طویل عمر کا بیشتر حصہ انھوں نے اردو کی خدمت میں صرف کیا۔ پچاس سال سے زائد عرصہ تک انھوں نے اردو زبان اور ادب کی خدمت جس لگن اور خلوص کے ساتھ کی اس کی مثال برصغیر میں نہیں ملتی ہے۔ درحقیقت وہ اردو کے لئے جئے اور اسی کے لئے مرے۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ زندگی کی آخری سانسوں میں انھوں نے فروغ اردو کے لئے دعا کی ہوگی۔

انھیں اپنے مشن سے جتنا لگاؤ تھا دنیا میں کم اشخاص کو رہا ہوگا۔ اردو کے اس دیوانے نے اپنا سب کچھ اردو پر نثار کر دیا تھا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اردو کو تمام جدید علوم و فنون کے حصول کا ذریعہ بنانا تھا۔ اسی خیال کے تحت انھوں نے کراچی میں اردو کالج قائم کیا جس میں سارے علوم و فنون، ڈگری کورس تک اردو میں بڑی کامیابی کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے۔ ان کی دلی خواہش کراچی میں ایک اردو یونیورسٹی کا قیام تھی، لیکن زندگی میں یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اور ان کے انتقال کے بعد تو ان کا اردو کالج بھی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

مولوی عبدالحق بڑے وضعدار اور با اصول انسان تھے۔ چھریرا جسم خشخشی داڑھی۔ شیروانی۔ علی گڑھ وضع کا پائجامہ اور ترکی ٹوپی زیب تن کئے وہ بالکل حالیؔ ثانی معلوم ہوتے تھے۔ ویسے بھی وضعداری۔ رکھ رکھاؤ اور اخلاق میں وہ حالیؔ سے مماثلت رکھتے تھے۔ وہ اردو کے ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ حالیؔ کی طرح خلوص۔ سادگی، اور پُرکاری ان کی تحریروں کی بھی خصوصیات تھیں۔

اردو کو صحیح معنوں میں پاکستان کی قومی زبان بنانے کی جدو جہد کے سلسلے میں میری ان کی اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس زمانے میں بنگالی اُردو کا تنازعہ بڑے زور شور سے چل رہا تھا۔ فرید جعفری مرحوم نے انگریزی کے روزنامے سول ملٹری گزٹ کراچی میں اردو کی موافقت میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ یہ مضامین زیادہ تر میں ہی مختلف ناموں سے لکھا

کرتا تھا۔ مولوی صاحب کو یہ بات معلوم تھی۔ وہ میری بہت ہمت افزائی کیا کرتے تھے۔ وہ پاکستان کے صاحبِ اقتدار افراد سے بہت نالاں تھے، بلکہ بڑی حد تک مایوس ہو چکے تھے۔ ہندوستانیوں کے مقابلہ میں وہ پاکستانیوں سے زیادہ شاکی تھے۔ اور اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من انچہ کرد آں آشنا کرد

پاکستان کے صاحبِ اقتدار افراد کے قول و فعل میں انتہائی تضاد تھا۔ وہ زبان سے اسلام اور اردو کو پاکستان میں نافذ کرنے کا عہد کرتے تھے لیکن ان کے افعال ان کے اقوال کی تردید کرتے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے انجمن ادبائے پاکستان بنائی۔ مولوی صاحب نے بخوشی اس کا سرپرست بننا قبول فرمایا اور اکثر وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں مستفید کرتے تھے۔

ہندوستان سے پاکستان آنے والے دیگر عظیم دانشوروں۔ ادیبوں اور فنکاروں کی طرح وہ پاکستان کے ناقدرے صاحب اقتدار افراد سے بہت دل گرفتہ اور مایوس تھے۔ بقول ان کے ہندوستان میں تو انھوں نے اردو کے لئے غیروں سے بھرپور اور طویل جنگ کی لیکن پاکستان میں اپنوں کی مخالفت کیسے کرتے جن سے انھیں بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ جو آخر کار غلط ثابت ہوئیں۔ ایک بار دورانِ گفتگو وہ کہنے لگے :

"پاکستان تو اردو کے تحفظ۔ ترویج اور ترقی کے لئے بنا تھا۔"

سرسید احمد خاں نے اردو ہندی جھگڑے کی وجہ سے ہی ہندوستان میں

دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا تھا، جو آگے چل کر پاکستان کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔ پاکستان کی جنگ میں اردو نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے وہ سبھی کو معلوم ہے۔ پھر قیام پاکستان کے بعد اردو کے ساتھ یہ بے وفائی اور بے اعتنائی کیسی؟ وہ قائداعظم کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے کہ انھوں نے علالت کے باوجود مارچ سنہ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ اور چٹاگاؤں جاکر یہ بہ بانگ دہل یہ اعلان کیا تھا:

" اردو ہی پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہوگی، اور جو اس کے خلاف سوچتا ہے وہ پاکستان کا بہی خواہ نہیں ہے "

قائدِ اعظم تو یہ اعلان کرکے تھوڑے دنوں بعد دنیا سے سدھار گئے ان کے جانشینوں نے ذاتی مفاد کی خاطر اس معاملہ میں قائداعظم کے ارشادات کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ بنگلہ زبان کی تحریک زور پکڑتی رہی۔ آخر کار قائدِ اعظم کے سچے اور پرخلوص پیروکار خواجہ ناظم الدین جب پاکستان کے وزیرِ اعظم ہوئے تو انھوں نے زبان سے متعلق قائداعظم کے ارشادات کو عملی جامہ پہنانا چاہا۔ لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ ڈھاکہ میں بنگلہ زبان کے حامیوں اور تشدد پسندوں پر گولی چلانی پڑی۔ جس سے سارا کھیل بگڑ گیا۔

غیر منقسم ہندوستان میں بابائے اردو نے گاندھی جی ایسے عظیم کانگریسی لیڈر سے ٹکر لی، جو قرآن کے حروف میں لکھی جانے والی اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان کہتے تھے۔ انھوں نے ناگپور میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہندی (ناگری)، ہندوستان کی قومی زبان ہوگی۔ بابائے اردو نے گاندھی جی

کا یہ چیلنج قبول کرلیا۔ سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک انھوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے کا دورہ کیا۔ اپنی تقریروں اور تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ اردو جو ہندو مسلمانوں کا مشترک سرمایہ اور ورثہ ہے ہندوستان کی قومی زبان ہونے کا استحقاق رکھتی ہے۔ مولوی صاحب کے ساتھ ہندو دانشوروں اور ادیبوں کا ایک با اثر طبقہ جس کے سرخیل سر تیج بہادر سپرو تھے، شامل ہو گیا۔ آخر کار گاندھی جی کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ عربی اور دیوناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندوستانی زبان کو انھیں ہندوستان کی قومی زبان تسلیم کرنا پڑا۔

قیام پاکستان کے بعد ہی دہلی کے فسادات میں انجمن ترقی اردو کا بیش بہا کتب خانہ دریا گنج دہلی میں نذر آتش کر دیا گیا۔ جس میں لاکھوں کتابیں تلف ہو گئیں اس واقعہ سے ۱۲۵۰ء میں ہلاکو خان منگول کے ہاتھوں بغداد کی تباہی اور عیسائی صلیبیوں کے ہاتھوں طرابلس (شام) کے عظیم الشان کتب خانہ کی خاکستری کی یاد تازہ ہو گئی۔ بابائے اردو کو مجبوراً دہلی سے مراجعت کر کے کراچی آنا پڑا، جہاں بڑی امیدوں کے ساتھ انھوں نے اپنا کام شروع کیا۔ لیکن آخر کار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان میں انجمن ترقی اردو کی سربراہی مولوی عبدالحق صاحب کو قائد اعظم ایسی مردم شناس اور صلاحیت نواز شخصیت کی زندگی میں مل گئی تھی۔ مولوی صاحب اگر قائد اعظم کے انتقال کے بعد پاکستان آتے تو انجمن ترقی اردو کی سربراہی بھی حکومت کے کسی خوشامدی کے ہتھے چڑھ جاتی، اور بیچارے

بابائے اردو کو کوئی نہ پوچھتا کہ تم کس کھیت کے مولی ہو۔ بہرحال اس معاملہ میں تو حق بہ حق دار رسید۔ لیکن اردو کی بد قسمتی سمجھیے یا پاکستان کے صاحب اقتدار افراد کی سرد مہری اور بے حسی، مولوی عبدالحق کو پاکستان میں وہ سہولتیں اور تعاون میسر نہ آیا جس کی انھیں اسلام اور زبان کے نام پر قائم ہونیوالے اس ملک میں توقع تھی، ہندوستان میں انھوں نے اردو کی راہ میں حائل بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکر لی۔ ہندو مہا سبھا۔ کانگریس اور دوسری ہندی نواز جماعتوں سے تن تنہا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ گاندھی جی سے بھی اپنا لوہا منوا لیا اور گاندھی جی سے بھی عربی اور دیو ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندوستانی زبان کو سارے ملک کی قومی زبان کا درجہ دلوایا۔ ہندوستان میں مولوی عبدالحق کی سرکردگی میں انجمن ترقی اردو نے بہت مفید اور کارآمد کام سرانجام دیے۔ اردو کی فنی اور ادبی لغات مرتب کیں متعدد ادبی فنی اور علمی کتابیں شائع کیں۔ کئی قدیم شعراء کے دیوان ایڈٹ کئے اور سب سے بڑھ کر سائنس، قومی زبان اور ادب سے متعلق "اردو" ایسے مفید رسالے جاری کئے جو سارے اردو داں طبقہ میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے، اور انتہائی مقبول تھے۔

پاکستان میں انجمن ترقی اردو کی دکان انتہائی سرد رہی۔ اور مولوی عبدالحق کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ان کی توقعات کے خلاف یہاں ہر منزل پر ان کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے۔ حکومت کی سرد مہری اور عوام کے عدم تعاون نے اس جواں ہمت نابغہ ثانی کی ہمت پست کر دی۔

پاکستان میں صاحبِ اقتدار افراد نے اپنی کرسیوں کو بچانے کے لئے اسلام اور اردو زبان کے نام پر قائم ہونے والے ملک پاکستان میں صوبائی علاقائی اور لسانی جھگڑوں کو ہوا دی۔ جس سے مولوی صاحب کو دلی صدمہ پہنچا، جو اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے۔ اس کے پھلنے پھولنے اور اسے علوم وفنون کے خزانوں سے مالا مال کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے، لسانی جھگڑوں سے وہ انتہائی دل برداشتہ ہوئے۔ اس پیرانہ سالی میں انھوں نے اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان بنانے کے لئے ایک بڑے جلوس کی قیادت کی جو دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرنے گیا تھا۔

دنیا کے سارے ترقی یافتہ ممالک میں علمی اور تحقیقی اداروں کی مالی امداد یا تو حکومت کرتی ہے یا عوام۔ مسلم عوام تعمیری۔ علمی۔ معاشرتی بہبود کی سرگرمیوں کی مالی معاونت کرنے میں ہمیشہ پیچھے رہے ہے۔ ہندوستان میں غیر مسلموں کے ہزاروں علمی۔ فنی اور خیراتی ادارے عوامی امداد کے بل بوتے پر چل رہے تھے۔ انھیں کے دیکھا دیکھی چند مخیر مسلمانوں نے بھی اس قسم کے چند ادارے قائم کئے تھے۔ حیدر آباد۔ رام پور اور بھوپال کے ریاستی درباروں نے بھی اسلامی علوم وفنون کی ترویج اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ پاکستان میں یہ ساری عوامی، اور درباری مالی امداد یکسر مفقود تھی۔ اس لئے انجمن ترقی اردو کے منصوبوں کا سارا دارومدار حکومت کی سرپرستی پر تھا جس نے علوم فنون اور تعلیم کی جانب اپنی عام عدم توجہی کی پالیسی کے تحت انجمن ترقی اردو کو بھی اپنی سرد مہری کا شکار بنایا۔ بابائے اردو تو اردو زبان کو پاکستان میں

ہر قسم کی اعلیٰ فنی اور سائنسی تعلیم کا ذریعہ بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے، اور اس مقصد کے تحت انھوں نے کراچی میں اردو کالج قائم کر کے اور اس میں انتہائی کامیاب تجربہ کر کے بھی دکھا دیا تھا لیکن ان کی ساری کوششوں کے باوجود اردو کالج ان کی زندگی میں اردو یونیورسٹی نہ بن سکا۔ اور اب تو اردو کالج موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ مالی وسائل کی تنگی کی وجہ سے انجمن ترقی اردو کی تصنیف اور تالیف کا کام بھی پاکستان میں سرد پڑ گیا۔ انجمن کے انتہائی مقبول جرائد اردو قومی زبان اور سائنس بھی بند کرنے پڑے۔ اس پر بس نہیں کیا گیا، بلکہ انجمن ترقی اردو کو مناقشات اور تنازعات کا اکھاڑہ بنا دیا گیا۔ اس انجمن میں ایسے حضرات داخل ہو گئے اور داخل کر دیے گئے، جو اردو کی ترویج اور ترقی سے کم لیکن اپنی اہمیت جتانے اور اقتدار پر قبضہ کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ اقتدار کی یہ کشمکش مولوی صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں شروع ہو گئی تھی، جس نے اردو زبان کے اس عظیم محسن کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں بڑا دکھ پہنچایا۔ انجمن ترقی اردو کی اس گندی سیاست میں جن افراد نے حصہ لیا۔ ان کے نام گنوانے کی ضرورت نہیں ہے، سبھی کو معلوم ہیں۔ ایوب خاں نے اپنے دور حکومت میں دو چار کام اچھے کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے بابائے اردو کو انجمن ترقی اردو کے ان خود ساختہ ٹھیکہ داروں سے نجات دلائی۔

انجمن ترقی اردو کے تنازعات کا ڈرامہ مولوی عبدالحق کے انتقال

کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی تک مولوی صاحب کی عظمت کے دوست دشمن سبھی قائل تھے۔ گاندھی جی تک قائل تھے۔ ان کا شمار اردو کے عظیم ترین ادیبوں اور محسنوں میں ہوتا تھا۔ لیکن بابائے اردو کے انتقال کے بعد ایک "مردِ ناحق پرست" نے جو اپنی خوشامدانہ باتوں سے ہر دور کے سرکاری حلقوں میں مقبول رہے ہیں اور اس کی بدولت دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے جا رہے ہیں، مولوی عبدالحق کی تصانیف پر اپنا آبائی حق جتانا چاہا۔ اس سلسلے میں اخباروں میں کافی نوک جھونک ہوئی۔ بیچارے بابائے اردو تو زمین تلے سو رہے تھے، ان کے مداحوں نے البتہ ان حضرت کی پوری طرح خبر لی، تب جا کر وہ خاموش ہوئے، ورنہ ان کا ارادہ تو بابائے اردو کی عظمت کو خاک میں ملانا تھا۔ بعض خوشامدیوں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ علمی اعتبار سے کم مایہ لیکن بڑے بننے کے خواہش مند اپنے سرپرستوں کو خوش کرنے اور اس طرح ان کا درجہ بلند کرنے کے لئے عظیم ادیبوں اور دانشوروں کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ بابائے اردو کے خلاف یہ سارا ہنگامہ اسی اسکیم کے تحت کھڑا کیا گیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد ان پر کیچڑ اچھالا گیا، اس سے زیادہ محسن کشی کیا ہو سکتی تھی۔

مولوی عبدالحق نے طویل عمر پائی۔ تقریباً بانوے سال کی عمر میں ۱۶ اگست سنہ ۱۹۶۱ء کو سرطان کے موذی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے قائم کردہ اردو کالج کراچی کے احاطہ میں انجمن ترقی اردو کی عمارت کے سایہ میں وہ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔"

سیّد سلیمان ندوی

بہت عرصہ ہوا نواب زادہ لیاقت علی باحیات تھے۔ کراچی میں دستور ساز اسمبلی کی عمارت سے ملحق ایک بیرک میں اسلامی تعلیمات بورڈ کا دفتر قائم تھا۔ مجھے ریڈیو پاکستان کے لئے انھیں دنوں ایک اسلامی موضوع پر تقریر لکھنا تھا جس کا مواد کہیں نہیں مل رہا تھا۔ یہ خیال کر کے کہ اسلامی تعلیمات بورڈ میں اسلامیات کے ماہرین سے اس سلسلے میں رجوع کیا جائے، میں نے اس جانب رخ کیا۔

وہاں ایک جانب کمرے میں جب داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک نورانی شکل کے بڑے وجیہہ بزرگ۔ سرخ سپید رنگ۔ اس پر سفید لمبی داڑھی۔ سر پر سفید براق عمامہ۔ سفید شیروانی زیب تن کئے ایک کرسی پر جلوہ افروز ہیں، اور سامنے کی میز پر کتابوں کا انبار لگا ہوا ہے۔

میں ان بزرگ کی وجاہت اور نورانی شکل سے بہت مرعوب ہوا! ور السلام علیکم کہہ کر جس کا جواب انھوں نے وعلیکم السلام رحمۃ اللہ وبرکاتہ' سے دیا۔ اپنا مدعا بیان کیا۔ بزرگ نے میرے سوال کے جواب میں آٹھ دس کتابوں کے حوالے دے دیئے اور آخر میں فرمایا کہ ایک اور کتاب "سیرت النبیؐ" بھی ہے اس کی تیسری جلد کے فلاں فلاں صفحات میں آپ کو اس موضوع پر قدرے مواد مل جائے گا۔

میں ان بزرگ کی تبحر علمی سے بڑا متاثر ہوا، اور باہر نکل کر اسی دفتر کے ایک کلرک سے دریافت کیا کہ ان بزرگ کا نام کیا ہے۔ انھوں نے قدرے تعجب سے پوچھا: "آپ سید سلیمان ندوی" کو نہیں جانتے؟" میں نے کہا بھلا ان کو کون پڑھا لکھا شخص نہیں جانتا۔ اچھا یہ سید صاحب ہیں۔" میں فوراً اندر گیا اور ان سے اپنی ناواقفیت پر ندامت کا اظہار کیا۔

سید صاحب کا نام تو بچپن سے ہی میں سنتا چلا آیا تھا۔ لیکن ان سے ملنے کا پہلی بار اتفاق ہوا تھا۔ سید صاحب نے میرے موضوع سے متعلق جن کتابوں کے حوالے دیئے تھے ان میں سب سے زیادہ اور محققانہ مواد سیرت النبیؐ ہی میں دستیاب ہوا۔ جس کے متعلق انھوں نے انتہائی انکساری سے کام لیا تھا۔ کیونکہ یہ خود ان کی تصنیف تھی۔ جس کا جواب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے۔

سید سلیماں ضلع پٹنہ (بہار) کے مردم خیز قصبہ دسنہ کے مشہور سید خاندان میں سنہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم ابوالحسن اپنی تبحر علمی اور ریاضت کی وجہ سے سارے دیہات میں بڑی عزت کی نگاہ سے

دیکھے جاتے تھے۔

سید سلیمان نے پھلواری شریف اور دربھنگہ کے اسلامی مدارس میں تعلیم حاصل کیا۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ لکھنؤ میں ندوہ کے مشہور دارالعلوم میں داخل ہوئے، اس زمانے میں یہ دارالعلوم عربی اور دینی علوم کی برصغیر میں سب سے مشہور درسگاہ تھی۔ یہاں انھوں نے مولانا فاروق چریا کوٹی۔ سید محمد علی مونگیری مولانا حفیظ اللہ اور مولانا شبلی نعمانی ایسے لائق اساتذہ سے کسب علم کیا۔ سید سلیمان مولانا شبلی نعمانی کے بڑے ہونہار طالب علموں میں سے تھے۔ اور مولانا شبلی سے سید سلیمان کا تعلق زندگی بھر رہا اور برصغیر کے ان دو عظیم ترین دانشوروں نے اردو زبان کو تاریخ۔ ادب اور سوانح کی انتہائی بلند پایہ تصانیف سے مالامال کر دیا۔

ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد اور دستار بندی سنہ ۱۹۰۷ء میں لکھنؤ میں نامور ادیب خواجہ غلام الثقلین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں نواب محسن الملک اور ملک کے دیگر شہرہ آفاق دانشوروں اور علماء نے شرکت کی۔ اجلاس میں شریک ایک دانشور نے ندوہ کے استاد مولانا شبلی نعمانی سے اس ادارہ سے فارغ التحصیل ہونے والے طلباء کی عربی دانی پر شبہ کا اظہار کیا۔ اس پر مولانا شبلی نعمانی نے سید سلیمان ندوی کو اشارہ کیا جن کی حال ہی میں دستار بندی ہوئی تھی۔ انھوں نے جدید فلسفہ پر عربی زبان میں ایسی معرکۃ الآرا اور عالمانہ تقریر کی جس کو سن کر حاضرین انگشت بدنداں رہ گئے۔

سید سلیمان سنہ ۱۹۰۸ء میں ندوۃ العلماء میں استاد مقرر ہو گئے، اور انھوں نے دو سال تک سیرت النبی کی تیاری میں اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی معاونت کی۔ مولانا شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد اس کتاب کا بڑا حصہ سید سلیمان نے خود مکمل کیا۔

پیغمبر اسلام کی زندگی اور کارناموں سے متعلق چھ جلدوں پر مشتمل سیرت النبیؐ کی عظیم تصنیف دنیا کی کسی زبان میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور سید سلیمان کا یہ ایک لازوال کارنامہ ہے۔

دنیائے اسلام اس وقت ایک بڑے بحران سے گزر رہی تھی۔ یورپ کی عیسائی حکومتیں "ترک بیمار" کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سازشوں میں مصروف تھیں۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے ترکوں کے زیر حکومت علاقہ طرابلس پر بلا سبب حملہ کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی عیسائی حکومتوں نے خلافت عثمانیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ سید سلیمان نے ایسی فضا میں ندوہ کی ملازمت ترک کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کے مشہور اخبار "الہلال" کی ادارت میں شمولیت اختیار کر لی اور قلمی جہاد کے ذریعہ اسلامی ہند کی بیداری میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ تک "الہلال" سے منسلک نہیں رہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ دکن کالج پونا میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا شبلی نعمانی کے انتقال کے بعد انھیں اپنے استاد کے علمی مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اعظم گڑھ واپس آنا پڑا۔ اس وقت سے دار المصنفین اعظم گڑھ سے

ان کی طویل وابستگی شروع ہوئی، جس نے اس ادارہ کو اسلامی تاریخ۔ فلسفہ اور ادب کا دنیا کا عظیم ترین ادارہ بنا دیا، اور جس نے سید سلیمان ندوی کو لازوال شہرت عطا کی۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک بڑا ہیجان پرور دور تھا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کے چھڑ جانے سے برصغیر میں بھی کانگریس مسلم لیگ اور بعد ازاں خلافت تحریکوں میں بھی حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی کی پرخلوص اور پرجوش قیادت، نیز علامہ اقبال کی روح پرور اور ولولہ انگیز شاعری نے اسلامی ہند کی بیداری میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ علی برادران کی پرجوش قیادت نے کانگریس کو بھی ایک فعال جماعت بنا دیا تھا۔ جنگ عظیم اول کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے خلاف اتحادیوں کی سازشوں نے خلافت تحریک کو ایک انقلابی تحریک بنا دیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی قیادت میں ایک وفد فاتح اتحادیوں سے ترکوں کے لئے معقول شرائط صلح حاصل کرنے کے لئے لندن گیا۔ سید سلیمان ندوی بھی اس وفد کے رکن تھے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں شریف مکہ اور سلطان ابن سعود کے درمیان صلح کرانے کے لئے سید سلیمان ندوی کی قیادت میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد جس میں مولانا محمد علی، اور شعیب قریشی شریک تھے، حجاز گیا جس نے ممالک مقدسہ میں جمہوری حکومت قائم کرنے پر زور دیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں سلطان ابن سعود کی دعوت پر سید سلیمان ندوی کی قیادت اور مولانا محمد علی اور شوکت علی پر مشتمل ایک وفد مؤتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے مکہ گیا۔ مولانا سلیمان ندوی کو مؤتمر کا نائب صدر

منتخب کیا گیا۔ وفد نے کسی خوف کے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔

سید سلیمان ندوی نے اپنی باقیماندہ زندگی تصنیف اور تالیف کے لئے وقف کردی، اور دار المصنفین اعظم گڑھ کو اسلامی تحقیق اور تالیف کا دنیائے اسلام کا عظیم ترین ادارہ بنا دیا۔ یہاں ان کی قیادت میں ایسے بےنفس نامور محققین علماء اور ادبا، اور مفکرین کی ایک ایسی جماعت جمع ہوگئی جس نے اپنی زندگی اور صلاحیتیں علوم و فنون کی تحقیق اور ترقی کے لئے وقف کردیں اور محض گزارہ الاؤنس پر اکتفا کی۔

سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں مصنفین اور محققین کی اس جماعت نے علوم و فنون کی ایسی خدمات سرانجام دیں اور ایسی نادر تصانیف کو منظرِ عام پر لے آئے جن کا جواب برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ اسی ادارہ نے معارف ایسا تحقیقی رسالہ جاری کیا جو گزشتہ نصف صدی سے اپنے بلند علمی اور تحقیقی معیار کو قائم رکھے ہوئے ہے۔

سید سلیمان ندوی کا شمار برصغیر کے عظیم مورخوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ چھ جلدوں پر مشتمل سیرت النبیؐ جس کا بیشتر حصہ انھوں نے مکمل کیا، پیغمبر اسلام کی زندگی اور کارناموں سے متعلق دنیا کی عظیم ترین کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انھوں نے دار الادب کے نام سے عربی ریڈر دو حصوں میں لکھی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے نئے عربی الفاظ کی ایک لغت مرتب کی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی سوانح لکھی۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "عربوں کی جہازرانی"

میں عرب سیاحوں اور بحر پیماؤں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن کے جہازوں نے قطب نما کی مدد سے بڑے بڑے سمندروں کو بلاخوف وخطر عبور کیا۔ جنھوں نے آبنائے بیرنگ، راس امید اور زمانہ جدید کی تحقیق کے مطابق امریکہ کو بھی دریافت کر لیا تھا۔

انھوں نے سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "خیام" میں عمر خیام سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے اور اُسے ایک عظیم سائنسداں ماہر ریاضی اور نجوم کی حیثیت سے اردو داں طبقہ سے روشناس کرایا۔ ان کے خطبات مدراس کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے اور علمی حلقوں میں یہ بہت مقبول ہیں۔

سنہ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے "نقوش سلیمانی" میں مختلف موضوعات سے متعلق اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کیا اور ۱۹۴۳ء میں اپنے استاد کی سوانح "حیات شبلی" لکھی جس میں مولانا شبلی نعمانی کے علمی کارناموں کے علاوہ گزشتہ ایک صدی میں برصغیر کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی کا طرز تحریر بہت سنجیدہ۔ اور سلیس ہے۔

قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں نے سید صاحب کو پاکستان کا اسلامی دستور تیار کرنے کی دعوت دی۔ سید صاحب کے لئے اس سے زیادہ کیا بات، باعث فخر اور ثواب ہو سکتی تھی کہ وہ پاکستان کا اسلامی دستور تیار کریں۔ انھوں نے دعوت قبول کر لی۔ معارف میں ان کے انتقال کے بعد جو ان کی سوانح حیات شائع ہوئی ہے اس کے مطابق پنڈت نہرو کو جب سید سلیمان ندوی کے ارادہ کی خبر ہوئی تو انھوں

نے لکھا کہ: "سید صاحب آپ پاکستان نہ جائیں، وہاں کے لوگ آپ کی قدر نہیں کر سکیں گے۔"

لیکن سید سلیمان کے دل اور دماغ پر اسلامی دستور تیار کرنے کی خواہش غالب تھی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں کراچی وارد ہوئے تو انہیں پاکستان دستور ساز اسمبلی سے متعلق اسلامی تعلیمات بورڈ کا صدر مقرر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں آکر انھیں معلوم ہوا کہ اس بورڈ کی حیثیت محض مشاورتی ہوگی۔ یہ ضروری نہیں کہ ان کا مشورہ قبول کیا جائے۔ سید سلیمان کو محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور ان کے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے اسلامی دستور تیار کرنے کا ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ کافی عرصہ تک انھوں نے یہ عہدہ قبول نہیں کیا۔ لیکن جب انھیں اس کی یقین دہانی کرائی گئی کہ ان کا مشورہ قبول کیا جائے گا تو انھوں نے عہدہ قبول کرنا منظور کرلیا۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ تک اس پر فائز نہیں رہے اور سنہ ۱۹۵۳ء میں انتقال کر گئے۔

غالباً اسی سال انھیں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے اجلاس منعقدہ ڈھاکہ میں صدارت کے لئے مدعو کیا گیا۔ پاکستان میں قومی اتحاد اور یکجہتی کے حصول کے لئے سید صاحب نے اردو اور بنگالی کے لئے عربی رسم الخط اختیار کرنے کی تلقین کی جس کی وجہ سے وہاں ہنگامہ ہوا۔ ان پر جوتے پھینکے گئے۔ جس کا انھیں ایسا دلی صدمہ ہوا کہ وہ صاحب فراش ہوگئے۔ ان کی طویل زندگی میں یہ انوکھا تجربہ تھا جو پاکستان میں انھیں ہوا۔ دو ماہ بعد

کراچی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سارے عالم اسلام میں سید صاحب کے انتقال کا ماتم کیا گیا۔ وہ ایک عظیم دانشور، مورخ اور ادیب تھے جو دنیا کے عظیم دانشوروں کی طرح سادگی بے نفسی اور خاکساری کا پیکر تھے۔ ان کی عظمت نے انھیں سربلند کرنے کے بجائے انھیں سرنگوں کر دیا تھا۔ وہ اپنی علمی خدمات کے تلے جھک گئے تھے۔

سید سلیمان ندوی کی عظمت کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کیا گیا۔ حکومتِ ہند نے اپنا سب سے بڑا ادبی اور علمی اعزاز پدم بھوشن انھیں دیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سنہ ۱۹۴۱ء میں ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری انھیں عطا کی۔ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں بشمول مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ جامعہ ملیہ دہلی۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور ہندوستانی کمیٹی حکومت بہار نے اپنی مشاورتی کمیٹیوں میں انھیں شامل کر کے ان سے استفادہ حاصل کیا۔

سید صاحب ایسے انسان کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بقول اقبال:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

پروفیسر ایس سی دیب

تاریخ میں ایسی متعدد شخصیتوں کا ذکر ملتا ہے جن کو قدرت نے حیرت انگیز قوتِ حافظہ ودیعت کی تھی لارڈ مکالے کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ جو کتاب پڑھ لیتا تھا اسے حفظ ہو جاتی تھی۔ کارلائل کے کتب خانے میں ایک بار آگ لگ گئی جس میں اس کی مشہور کتاب سارٹس ریسارٹس رکھی ہوئی تھی۔ مکالے نے اسے اپنے حافظے سے دوبارہ زندہ کر دیا دنیائے اسلام کے نامور محدث امام بخاری کو تین لاکھ سے زائد حدیثیں مع ان کے حوالہ جات سلسلوں اور راویوں کے شجرے کے ساتھ یاد تھیں۔

مجھے اپنی زندگی میں کسی ایسے شخص کو دیکھنے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا جو ایسی صفت کا حامل ہو۔ اور جسے قدرت نے غیر معمولی حافظہ ودیعت کیا ہو۔ الہ آباد یونیورسٹی میں جب میں نے داخلہ لیا تو مجھے ایک ایسی شخصیت سے ملنے اور اس سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ جس نے میرے ذہن

کے افسانوی کردار کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

یہ شخصیت الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے مشہور استاد ایس سی دیب کی تھی۔

یونیورسٹی میں بی اے فرسٹ ایر میں میرے ساتھ آٹھ سو سے زاید طلبار نے داخلہ لیا تھا۔ انھیں ۵۰، ۵۰، طلبار کے متعدد سیکشنوں میں منقسم کردیا گیا۔ میرا داخلہ سیکشن اے (الف) میں ہوا تھا، جس کے کلاس ٹیچر ایس سی دیب صاحب تھے۔ اور جس میں زیادہ تر ایف اے میں اچھے ڈویژن پانے والے طلبار، شامل تھے۔

دیب صاحب غیر معمولی حافظہ رکھتے ہوئے ایک جامع الصفات اور جامع الکمالات انسان تھے۔ وہ بنگال کے ایک ایسے ہندو گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جو مشرقی اور مغربی علوم میں کافی دسترس رکھتا تھا دیب صاحب نے ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی تھی، اور خالص علمی ماحول میں پرورش پائی تھی، جس نے ابتدا ہی سے علوم و فنون سے سچی لگن اُن کے دل میں پیدا کردی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے انھوں نے انگریزی میں ایم اے کیا اور ساری یونیورسٹی میں اول آئے۔

انھوں نے برصغیر کی اعلیٰ ترین ملازمت آئی سی ایس کے امتحان میں بھی اسی سال شرکت کی جس میں وہ اول آئے۔ اتفاق کہئے یا قسمت کا کھیل الہ آباد یونیورسٹی میں بھی انھیں انگریزی میں جونیئر لیکچرار کی جگہ اُسی سال پیش کی گئی۔ ایک عام طالب علم آئی سی ایس کے مقابلہ میں یونیورسٹی کی

لکچراری کو ٹھکرا دیا لیکن دیب صاحب نے ساڑھے سات روپے ماہانہ کی آئی، سی، ایس کی جگہ کے بجائے سوا سو روپے ماہوار کی یونیورسٹی کی لکچراری قبول کی۔ انھوں نے آئی، سی، ایس کی ٹیپ ٹاپ شان و شوکت کے بجائے یونیورسٹی کے علمی ماحول کو ترجیح دی۔

گول چہرہ، میانہ قد۔ اکہرا جسم۔ ڈھلکتا ہوا سا فولارنگ اور بند کالر کے کوٹ میں ملبوس علوم و فنون کی اس چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا کو دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اس کے چھوٹے سے دماغ میں لاکھوں کتابیں چھپی ہوئی ہیں۔ علوم و فنون میں صحیح معنوں میں ہمہ دانی کی صفت سے موصوف اس انسان میں انکساری اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کلاس میں جب وہ داخل ہوتے تو سارے طلباء مؤدب کھڑے ہو جاتے اور مکمل طور پر خاموشی چھا جاتی۔ ایسی خاموشی کہ اگر کوئی پنسل زمین پر گر جائے تو سارے کلاس میں سنائی دے۔ جب وہ لکچر شروع کرتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم کا دریائے ذخار موجیں مار رہا ہے اور علوم کا خزانہ ابل رہا ہے۔ شیکسپیئر پر لکچر دیتے تو حوالے کے طور ڈاکٹر جانسن، ماتھیو آرنلڈ اور کولرج کی تنقیدی کتابوں سے صفحات کے صفحات اپنے حافظے سے پیش کرتے جاتے۔ حیرت ہوتی کہ یہ کوئی آدمی ہے یا جنات۔ انگریزی زبان میں انھیں اتنا عبور تھا اور وہ اتنی تیز بولتے تھے کہ پانچ چھ ماہ تک تو اچھے سے اچھے انگریزی داں طالب علم کے پلے نہیں پڑتا تھا، بھلا میل ٹرین کا ساتھ کوئی دے سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ دیب صاحب کی تیز رفتاری کو طلباء پا سکتے تھے۔

اتفاق سے ان کے ایک سیمینار (ٹیوٹوریل) کلاس میں چھ سات مسلمان طلبا ر تھے جنھوں نے فارسی اور اردو اختیاری مضامین کی حیثیت سے لے رکھا تھا۔ ہفتہ میں ایک دن ہمارے سیمینار کی باری آتی تھی۔ ڈیب صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ مضامین لکھنے کو دیتے تھے اور دوسری باری میں مضمون نگار سے پڑھا کر سنا کرتے تھے اور اس کے بعد چار درجے اے، بی، سی، ڈی میں سے کوئی مضمون کے معیار کے مطابق عطا کیا کرتے تھے۔ اے کے معنی فرسٹ ڈویزن۔ بی سیکنڈ ڈویزن۔ سی تھرڈ ڈویزن اور ڈی فیل کے مترادف ہوتا تھا۔ معیار کے تعین میں وہ کافی سخت گیر واقع ہوئے تھے اور زیادہ تر ہم لوگوں کو سی اور شاذ و نادر بی ملتا تھا۔

سیمینار میں ڈیب صاحب کا رویہ ہم لوگوں کی جانب بہت مشفقانہ اور دوستانہ ہوتا تھا، وہ کہا کرتے تھے کہ ان کے پسندیدہ مضامین میں تاریخ۔ فلسفہ اور موسیقی ہیں اور ادب کا نمبر ان کے بعد آتا تھا۔ ان کا روز کا معمول تھا کہ وہ صبح آٹھ بجے یونیورسٹی لائبریری آجاتے تھے اور ۶ بجے شام تک مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ درمیان میں کلاس لینے وہ شعبہ انگریزی میں چلے جاتے تھے۔ وہ بی اے کو ایک گھنٹہ اور ایم اے کو دو گھنٹہ پڑھایا کرتے تھے۔

مختلف علوم کے اتنے متبحر عالم ہونے کے باوجود فروتنی اور غرور ان میں چھو بھی نہیں گیا تھا۔ اس کے برعکس ان میں انتہا درجے کی خاکساری پائی جاتی تھی۔ جب کبھی ہم لوگ ان کی قابلیت کی تعریف کرتے تو فی الفور کہتے، آپ لوگ خواہ مخواہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ میں نے

پچاس ساٹھ ہزار کتابیں پڑھی ہیں تو کوئی بڑی بات نہیں ہے آپ کوشش کریں تو مجھ سے زیادہ پڑھ سکتے ہیں۔

دیب صاحب اکثر کلاس میں کہا کرتے تھے کہ ان کے والد تو فارسی جانتے تھے لیکن وہ خود فارسی اردو سے مطلق واقف نہیں ہیں۔ ایک بار انھوں نے ہمارے سیمینار والوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنے پسندیدہ شاعر پر اس بار مضمون لکھیں۔ ہم لوگوں نے دل میں سوچا اور آپس میں مشورہ کیا کہ اچھا درجہ حاصل کرنے کا یہ بہت اچھا موقع ہے، ہر شخص اپنے پسندیدہ اردو یا فارسی شاعر پر مضمون لکھے۔ دیب صاحب اردو فارسی سے نابلد ہیں، اس لئے وہ مضمون کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکیں گے۔ اور ہم لوگوں کو اچھا درجہ مل جائے گا۔ ہم میں سے کسی طالب علم نے اقبال۔ کسی نے غالب کسی نے میر۔ کسی نے انیس۔ کسی نے حافظ اور کسی نے سعدی پر مضامین لکھے۔ حسب معمول انھوں نے ہر طالب علم سے اس کا مضمون پڑھا کر سنا اور باقاعدہ اشعار اور تنقیدی حوالہ جات کے ساتھ ہمارے مضامین کی تصحیح کی۔ ہم لوگوں نے اپنے اردو اور فارسی کے پروفیسروں کو دیب صاحب کی تصحیح دکھائی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ کہنے لگے کہ آپ لوگ اس کو اپنے پاس حفاظت سے رکھیں، یہ بہت عالمانہ اور محققانہ تنقید ہے۔ امتحان میں آپ کے کام آئے گی۔

دوسرے ہفتہ جب ہم لوگ سیمینار میں گئے تو ہم میں سے ایک طالب علم نے دیب صاحب سے پوچھا۔ "صاحب آپ تو کہتے تھے کہ آپ

اردو فارسی سے بالکل نابلد ہیں، لیکن آپ نے اشعار کے حوالہ جات سے ہمارے مضامین کی بڑی عالمانہ تصحیح کی ہے۔"

دیب صاحب مسکرائے۔ کہنے لگے:

"یہ سب کچھ اصغر صاحب کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ اصغر صاحب کے یہاں کبھی کبھی بیٹھک ہوتی ہے اور وہاں اردو فارسی شعرا پر اکثر بحث ہوتی ہے، وہی سب باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔"

دیب صاحب بہت سادہ طبیعت اور مزاج کے آدمی تھے۔ گھر اور بازار میں ان کا لباس دھوتی۔ کرتہ اور چپل یا ہاف جوتا ہوا کرتا تھا۔ بازار میں ملتے تو ہمیشہ خود پہلے سلام کرنے کی کوشش کرتے اور مزاج پرسی کرتے تھے۔ گھر میں بہت اخلاق سے پیش آتے۔ خاطر و مدارات کرتے۔

الہ آباد یونیورسٹی میں ۳۶ - ۱۹۳۵ء میں تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ جس میں مختلف یونیورسٹیوں کے نامور اور اچھے مقرر اساتذہ حصہ لیتے تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹر ہادی حسن اور خواجہ غلام السیدین مدعو کئے جاتے تھے اور ان کی تقریریں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے مختلف اساتذہ نے اس لکچر میں حصہ لیا، لیکن جس دن دیب صاحب کی باری ہوتی تھی تو شعبہ تاریخ کے آڈیٹوریم میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی تھی اور طلباء کھڑکیوں کے باہر بھی کھڑے ہوتے تھے۔

امرناتھ جھا صاحب کے وائس چانسلر ہو جانے کے بعد دیب صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے سربراہ ہو گئے۔ ویسے جھا صاحب کی سربراہی میں بھی عزت دیب صاحب کی زیادہ ہوتی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی میں شاید ہی ایسا کوئی اُستاد کبھی رہا ہوگا جس کی طلبا نے اتنی عزت کی ہو جتنی وہ دیب صاحب کی کرتے تھے۔ درحقیقت قابلیت اور سادگی۔ خاکساری اور بلند خیالی کی وہ زندہ مثال تھے۔

پروفیسر راناڈے

قیام پاکستان سے قبل الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ پروفیسر راناڈے تھے جو اپنے زمانے میں ہندو فلسفہ کے سب سے بڑے عالم (اسکالر) تسلیم کئے جاتے تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی نے ان کی خدمات بڑی کوششوں اور مشکل سے حاصل کی تھیں۔ انھوں نے اپنی شرائط پر یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کا سربراہ بننا منظور کیا تھا۔ ان میں یہ شرائط شامل تھیں کہ وہ جب چاہیں گے چھ ماہ کی رخصت پر جا سکتے ہیں۔ جس طرح چاہیں گے تعلیم دیں گے جو نصاب چاہیں گے مقرر کریں گے۔ کوئی اس میں مداخلت نہیں کرے گا۔ اور ماہانہ کافی بھاری مشاہرہ لیں گے۔ چنانچہ وہ الہ آباد یونیورسٹی کے سب سے زیادہ تنخواہ پانے والے پروفیسروں میں شمار کئے جاتے تھے۔

پروفیسر راناڈے کا حلیہ عجیب و غریب تھا۔ دُبلے پتلے منحنی سے آدمی۔

ڈاڑھی مونچھ صاف، سر پر لال پگڑی۔ دھوتی کرتہ پہنے اور اس پر ایک عدد کمبل یا موٹی چادر اوڑھے رہتے تھے۔ لڑکے انھیں ان کے حلیہ کے مطابق "بُڑھیا" کہا کرتے تھے۔ انھیں پسینہ آنے کی بیماری تھی، اس لیے یونیورسٹی میں دو گھنٹے قیام کے دوران وہ دو تین بار کپڑے تبدیل کیا کرتے تھے۔ انھیں یونیورسٹی میں بہت کم طلباء نے دیکھا ہوگا۔ کیونکہ وہ ایک پرانے ماڈل کی بند کار میں آتے تھے جو ان کے کمرے کے سامنے پورچ میں کھڑی ہوتی تھی۔ کار سے اتر کر وہ کمرے میں داخل ہو جاتے تھے اور پھر اس وقت نکلتے تھے جب انھیں گھر جانا ہوتا تھا۔ ایک لمبا سا کمرہ تھا جس میں وہ بیٹھتے تھے، اس میں وہ ایم اے فلسفہ کے طلباء کو جو تعداد میں بہت کم ہوتے تھے، پڑھایا کرتے تھے۔ اس کمرے کی کھڑکیاں زیادہ تر بند رہتی تھیں یا اس پر موٹے سیاہ پردے پڑے رہتے تھے، کمرہ کی برقی روشنی میں وہ طلباء کا کلاس لیا کرتے تھے۔

ہندوستان کی ساری بڑی یونیورسٹیوں میں پروفیسر راناڈے کی بڑی مانگ تھی، اور اس سلسلہ میں ان میں رسہ کشی ہوا کرتی تھی۔ مختلف یونیورسٹیاں انھیں اکثر اپنے شعبۂ فلسفہ کی صدارت کی دعوت دیا کرتی تھیں، اور ہر سال یہ بات مشہور ہو جاتی تھی کہ امسال پروفیسر راناڈے فلاں یونیورسٹی میں جا رہے ہیں۔ لیکن وہ جاتے نہیں تھے۔ شاید الہ آباد۔ یا اس کی یونیورسٹی انھیں بہت پسند تھی۔

میں نے بھی بی اے میں فلسفہ لے رکھا تھا۔ فلسفہ کے تین پرچے ہوا کرتے تھے۔ نفسیات۔ اخلاقیات اور تاریخ فلسفہ، اور مابعد الطبیعات

نفسیات کی تعلیم پروفیسر کول دیا کرتے تھے جو کشمیری تھے۔ وہ اپنی وجاہت اور خوش پوشی کی وجہ سے فلسفی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اخلاقیات اور تاریخ فلسفہ پروفیسر بنرجی پڑھایا کرتے تھے جو بنگالی عیسائی تھے۔ وہ بہت ہی سنکی لیکن خوش مزاج استاد تھے۔ لڑکے ان سے کافی فری ہو جاتے تھے، لیکن وہ برا نہیں مانتے تھے۔ وہ اخلاقیات سے اکثر سیاسیات اور ذاتیات پر آجاتے تھے۔ ان کے لکچروں میں کافی مزاح اور زندہ دلی ہوتی تھی۔ شاید انھوں نے اپنی مونچھیں زندگی میں کبھی نہیں کتروائی تھیں، اس لئے وہ اتنی لٹک آئی تھیں کہ ان کا دہانہ نظر نہیں آتا تھا۔ بڑا اجھابڑ جھبول قسم کا سوٹ پہنتے تھے۔ آنکھوں پر موٹے شیشے کا چشمہ لگایا کرتے تھے اور شکل سے فلسفی معلوم ہوتے تھے۔

فلسفہ مابعد الطبیعات کی تعلیم پروفیسر مکرجی دیا کرتے تھے جو بنگالی برہمن تھے۔ دوہرے بدن کے آدمی تھے اور چینی وضع کا بند گلے کا سوٹ پہنا کرتے تھے، وہ بڑے قابل استاد تھے۔ لیکن مابعد الطبیعات کے گنجلک اور پیچیدہ فلسفہ کی اتنی تفصیل میں چلے جاتے تھے کہ وہ گورکھ دھندا ہو کر رہ جاتا تھا، اور طلباء کے سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا۔ ہمارے کورس میں بارہ جدید فلسفی تھے، جن پر ڈیکارٹس۔ کانٹ۔ اسپی نوزا۔ ہیوم۔ برکلے وغیرہ شامل تھے۔ ان میں اسپی نوزا سب سے زیادہ مشکل پسند تھا۔ اس نے خدا کے وجود کو آٹھ بار ثابت کیا ہے اور آٹھ بار اپنے دلائل سے انھیں رد کر دیا ہے۔

پروفیسر مکرجی سال بھر تک طلبار کو مابعد الطبیعات کا کورس پڑھاتے رہتے تھے، لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ بی اے فائنل کا سالانہ امتحان جب قریب آتا تو طلبار کا وفد پروفیسر رانا ڈے کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان سے درخواست کرتا:

"صاحب فلسفہ مابعد الطبیعات ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ آپ اس کو امتحان سے خارج کرا دیں، کیوں کہ ہم امتحان کا پرچہ کیسے حل کریں گے، جبکہ ہم اُسے سمجھتے ہی نہیں"۔

پروفیسر رانا ڈے آخر کار جواب دیتے:

"اچھا میں بارہ دن میں بارہ گھنٹے تمہیں لکچر دوں گا۔ ہر فلسفی پر ایک گھنٹہ لکچر دوں گا، اس کے بعد تم لوگ فیصلہ کرنا کہ تمہیں اس پرچہ کا امتحان دینا ہے یا نہیں"۔

پروفیسر رانا ڈے آخر کار اپنے حجرہ سے باہر نکلتے اور بڑے کلاس میں آتے۔ میں نے پہلی بار ان کو اسی کلاس میں دیکھا ہے۔ فلسفہ کے شعبہ سے منسلک ہوئے مجھے دو سال ہو گئے تھے، لیکن پروفیسر رانا ڈے کا جلوہ پہلی بار نظر آیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنا لکچر شروع کیا تو میل ٹرین کی رفتار سے انگریزی بولتے رہے۔ طلبار کو معلوم تھا کہ پروفیسر رانا ڈے بہت تیز انگریزی بولتے ہیں، ان کے لکچر کا نوٹ لینا آسان نہیں ہو گا۔ اس لئے پہلے ہی انتظام کر لیا گیا تھا۔ کامرس سیکشن سے دو تین اچھے شارٹ ہینڈ لکھنے والے طلبار کو مدعو کر دیا

تھا۔ وہ لکچر کا شارٹ ہینڈ میں نوٹ لے رہے تھے۔ جب لکچر ختم ہو جاتا تو شارٹ ہینڈ میں لئے ہوئے نوٹ کو عبارت میں منتقل کر کے اور سائیکلو اسٹائل کر کے اس کی کاپیاں تمام طلبار میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔

واقعہ تو یہ ہے کہ پروفیسر راناڈے مابعد الطبیعات ایسے پیچیدہ اور خشک فلسفہ کو بالکل پانی کر دیتے تھے اور ریاضی کے فارمولے کی طرح ہر مسئلہ کو حل کر کے طلبار کے ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ بارہ گھنٹے میں طلبار اس مضمون کے ایسے ماہر ہو جاتے تھے کہ اس کے پرچے میں کبھی کوئی فیل نہیں ہوتا تھا۔

پروفیسر راناڈے اپنے زمانے کی ایک منفرد شخصیت تھے فلسفیوں کے متعلق عام طور سے مشہور ہے کہ بڑے سنکی ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی علم کی گہرائیوں میں اتنے مستغرق رہتے ہیں کہ اکثر کھوئے، بلکہ حواس باختہ رہتے ہیں۔ عام افراد کے برخلاف بعض اوقات وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں جن کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ ان کا لباس، ان کی وضع قطع، ان کے عادات واطوار عام انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یونان کے مشہور فلسفی دیوجانس سے سکندر اعظم جب ملنے گیا تو وہ ایک ٹب میں بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ اس نے دیوجانس سے دریافت کیا کہ "آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" دیوجانس نے بلا تکلف جواب دیا: "خدمت یہی ہے کہ آپ میری دھوپ چھوڑ کر پرے ہٹ جائیں۔" سکندر اعظم یونان کے اس مشہور فلسفی کی بے نفسی سے بہت متاثر ہوا اور کہا کہ اگر میں سکندر نہ ہوتا تو

دیو جانس ہوتا۔" ہندوستان کے ایک فلسفی کے متعلق مشہور ہے کہ ہمیشہ وہ کھوئے رہتے تھے۔ شب کو سونے کے کمرے میں آئے تو اپنی چھڑی کو کونے میں کھڑی کر کے بستر پر دراز ہو جاتے۔ ایک شب کو وہ اپنے خیالات میں اس قدر کھوئے ہوئے تھے کہ انھوں نے چھڑی کو تو بستر پر سلا دیا اور خود اس کی جگہ کونے میں کھڑے ہو گئے، کافی دیر بعد جب ان کی صاحبزادی کمرے میں کسی کام سے آئیں تو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں کہ چھڑی تو بستر پر دراز ہے اور خود فلسفی صاحب کونے میں کھڑے خیالات میں مستغرق ہیں۔ لڑکی نے جب انھیں ٹوکا تو وہ خیالات سے بیدار ہوئے اور بستر پر آ کر دراز ہو گئے۔

پروفیسر رانا ڈے ظاہر اور باطن دونوں حیثیتوں سے صحیح معنوں میں فلسفی تھے۔ انھیں جس شخص نے ایک بار دیکھا ہو گا وہ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ ان کا عجیب و غریب حلیہ اس کے لوحِ دماغ پر نقش ہو جاتا تھا۔ جنھیں ان سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا، یا ان کا لکچر سننے کا اتفاق ہوا ہو گا وہ علم کے اس بحرِ ذخار کی اتھاہ گہرائیوں سے انتہائی متاثر ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسینؒ

فارسی کی مشہور مثل "مسلمان در گور و مسلمانی در کتاب" جتنی آج کل کے مسلمانوں پر صادق آتی ہے شاید اس سے پہلے کبھی نہیں آئی ہوگی۔ آج کل کے مسلمان اپنے نفس کے بندے محض نام کے مسلمان ہیں۔ اسلام کی ساری خوبیاں مسلمانوں نے ترک کر دی ہیں اور غیر اقوام نے اختیار کر لی ہیں۔ اس طرح بیسویں صدی کا مسلمان محض نام کا مسلمان رہ گیا ہے۔ درانحالیکہ غیر اقوام کے افراد کام کے مسلمان ہو گئے ہیں۔

بیسویں صدی کے مسلمان کے زوال کا سب سے بڑا سبب اسلام کے زریں اصول سے اس کی روگردانی اور نفس پروری ہے۔ زمانہ جدید میں غیر اقوام کی ترقی کا راز ان کے اسلامی اصول کی پابندی میں مضمر ہے۔ زمانۂ حال کے مسلمانوں میں بے راہ روی۔ نفس پرستی، اسرافِ بیجا اور اسی قسم کے بیشمار عیوب پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف غیر اقوام میں سادگی۔ وعدہ کی پابندی اور

کفایت شعاری ایسی سودمند خوبیاں پائی جاتی ہیں۔

دنیائے اسلام کی اس بڑھتی ہوئی تاریکی میں کہیں کہیں روشنی کی کرن چمکی ہے جو مصلحین اور علمائے حق پرست نے روشن کی ہے۔ انھیں مصلحین کے کارناموں میں بیسویں صدی کے اوائل میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے مبارک ہاتھوں جامعہ ملیہ کا قیام تھا۔

جامعہ ملیہ جو ابتدا میں علی گڑھ میں قائم ہوئی بعد ازاں دہلی منتقل کردی گئی۔ اس میں ایسے بہت سے لائق اور بے نفس اساتذہ جمع ہو گئے تھے جنھوں نے اپنی زندگی قوم اور ملت کے لئے وقف کر دی تھی۔ جو سادہ زندگی کے ساتھ بلند خیالی کے اصول پر کاربند تھے، اور جنھوں نے بہت معمولی مشاہرہ پر اس قومی ادارہ کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کردی تھیں۔ اس پاک باطن اور بے نفس جماعت کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں تھے۔ جو اپنے زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مایۂ ناز طالب علم رہ چکے تھے۔

ذاکر حسین خاں فرخ آباد یو۔پی کے قصبہ قائم گنج کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ظاہر ہونے لگے تھے۔ انھوں نے اسکول کالج اور یونیورسٹی کے امتحانات بڑے امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے انتہائی ذہین اور لائق طلباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ وہ کتابوں کے کیڑے کبھی نہیں ہوئے لیکن اپنی ذہانت کی بدولت انھوں نے یونیورسٹی میں ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی کے مباحثوں اور دیگر مشاغل میں بھی نمایاں حصہ لیتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہر نے جب برطانوی طرز تعلیم سے عدم تعاون کی تحریک شروع کی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبار کو یونیورسٹی چھوڑنے کی تلقین کی تو ان کی نگاہ ذاکر حسین پر پڑی۔ محمد علی جوہر نے آخر کار جوہر کو تلاش کر لیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی سربراہی میں ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی داغ بیل علی گڑھ میں ڈالی گئی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے برلن یونیورسٹی سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وہ ایک بے نظیر مقرر اور ادیب تھے۔ ان کی تحریروں میں انتہائی تاثر پایا جاتا ہے جو پڑھنے والوں کے قلوب کو متاثر کرتا ہے۔ بچوں سے متعلق انھوں نے ایسی مفید کتابیں لکھی ہیں، جس سے اردو ادب ابھی تک خالی تھا۔

ڈاکٹر صاحب طبعاً خلوتی واقع ہوئے تھے جلوتی نہیں۔ ہنگامہ آرائی اور اشتہار بازی سے قطعی بے نیاز، وہ ایک خاموش کارکن تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جامعہ ملیہ کی خدمت میں گزار دیا جہاں سے وہ گزارہ کے لئے غالباً ۷۵ روپے ماہوار وصول کرتے تھے۔ انھوں نے بڑی سے بڑی پیشکشوں کو ٹھکرا دیا۔ ایک بار انھیں برطانوی حکومت ہند نے اپنا اقتصادی مشیر مقرر کرنے کی پیشکش کی جس کی تنخواہ چار ہزار روپے ماہوار تھی، لیکن ذاکر صاحب نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ جامعہ ملیہ کے ۷۵ روپے ماہوار کو انھوں نے حکومت ہند کے چار ہزار روپے ماہوار پر ترجیح دی۔ ایسے بے نفس انسان ہمارے ملک میں کہیں ڈھونڈھے سے نہیں ملیں گے۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور ذہن بہت تیز تھا۔ ان کا

احساس بہت قوی اور قوت فکر میں بڑی جولانی تھی۔ ایسے افراد اپنی دنیا آپ بنا لیتے ہیں۔ ان کی خداداد ذہانت اور فطری طباعی نے انھیں برصغیر کا عظیم ترین ماہر تعلیم بنا دیا تھا۔ گاندھی جی نے ذاکر صاحب کے جوہر کو پہچانا۔ اور ان سے "واردھا اسکیم" جو درحقیقت بنیادی تعلیم کی اسکیم ہے تیار کرائی۔ ذاکر صاحب اس تعلیمی اسکیم کے خالق ہیں۔ جو آج بھارت میں رائج ہے۔

جامعہ نے ذاکر صاحب کو صاحبِ فکر سے صاحبِ عمل بنا دیا۔ جامعہ ملیہ کے لیئے انھوں نے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔ جس کی بدولت جامعہ آج ایشیا کے عظیم ترین تعلیمی اداروں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس تعلیمی ادارے میں نظریات کے ساتھ تجربہ اور عمل، حصولِ علم کے ساتھ تعمیر اخلاق اور کردار پر پوری توجہ دی جاتی ہے۔ اس سے جو افراد فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں، وہ دنیاداری سے زیادہ خدمت خلق اور تعمیر اخلاق کا خیال کرتے ہیں بھلا ایسی تعلیم کس کام کی جو کلرک اور پڑھے لکھے نفس پرور اور حیوان صفت افراد پیدا کرے۔ ہندوستان اور پاکستان میں انگریزی تعلیمی ادارے زیادہ تر اسی قسم کے افراد پیدا کرتے ہیں۔ ایسے افراد نے آج کل کے معاشرے کو ہر قسم کے غیر اخلاقی اور تباہ کن اثرات سے پُر کر دیا ہے۔ ذاکر صاحب کی جامعہ ملیہ اس سے بالکل مختلف تعلیمی ادارہ ہے۔ جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تعمیر کردار پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے ــــ ذاکر صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۲ء میں جامعہ ملیہ دہلی میں ہوئی۔ جہاں وہ شیخ الجامعہ تھے۔ سرخ سفید رنگ۔ فرنچ کٹ داڑھی۔ روشن ذہین آنکھیں۔ سفید کرتا پائجامہ۔ شیروانی اور ٹوپی زیب تن کیئے وہ

وجاہت اور شرافت کا پیکر معلوم ہوتے تھے۔ میں اس زمانے میں دہلی میں ملازمت کرتا تھا۔ ان سے مل کر مجھے وہی مسرت حاصل ہوئی جو ایک درویش صفت عظیم دانشور سے مل کر ہوا کرتی ہے۔ وہ طبعاً خاموش آدمی تھے۔ میں نے ان سے جامعہ ملیہ اور واردھا اسکیم کے متعلق گفتگو کی۔ انھوں نے بڑی تفصیل اور فراخدلی سے ان کی بابت مجھے آگاہ کیا۔ جامعہ ملیہ کی کارکردگی اور اس کے منصوبوں سے میں بہت متاثر ہوا۔ واردھا اسکیم سے متعلق انھوں نے میرے بہت سے شکوک دور کر دئے۔

اس کے بعد میں کئی بار جامعہ ملیہ گیا۔ وہاں میرے ایک پرانے دوست رشید نعمانی بھی معلم تھے۔ ردولی کے رہنے والے تھے اور کسی زمانے میں گورنمنٹ کالج فیض آباد میں میرے ساتھ طالب علم تھے۔ اس وقت وہ بڑے فیشنی اور ماڈرن تھے۔ لیکن جامعہ ملیہ نے ان کی زندگی بدل دی تھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی رشید نعمانی ہیں۔ اب ان کے چہرے پر ایک عدد لمبی داڑھی اور سوٹ بوٹ کی جگہ کرتے پائجامہ نے لے لیا تھا۔ وہ اب عابد و زاہد اور ہر وقت خدا رسول کی باتیں کیا کرتے تھے۔

جامعہ ملیہ کو میں نے اچھی طرح سے دیکھا، اور اس کے طریقۂ تعلیم سے بہت متاثر ہوا۔ جب کبھی جامعہ جاتا تو ذاکر صاحب کی قدمبوسی کے لئے ضرور حاضر ہوتا اور وہ بڑے اخلاق اور محبت سے پیش آتے تھے۔ اس زمانے میں جامعہ ملیہ میں ہندوستان کے چند مایۂ ناز استاد اور علمی شخصیتیں درس و تدریس میں مصروف تھیں جنھوں نے بھاری مشاہروں کو ٹھکرا کر یہاں محض گزارہ الاؤنس

پر قناعت کر کے خدمت خلق کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا تھا۔ ان میں پروفیسر مجیب۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ اسلم جیراجپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین مشہور خاتون افسانہ نگار صالحہ عابد حسین کے شوہر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب متعدد کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ جو بہت مقبول ہوئی ہیں۔ چھوٹے بچوں کی متعدد کہانیوں اور کتابوں کو انھوں نے اپنے اچھوتے انداز میں لکھا ہے۔ "معاشیات مقصد اور منہاج" کا ان کا مقالہ جو انھوں نے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے اجلاس میں پڑھا تھا کتابی شکل میں شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکا ہے۔ لیکن ان کی ادبی عظمت کا دار و مدار افلاطون کی شہرہ آفاق تصنیف ریپبلک (REPUBLIC) کے ترجمہ پر ہے جس کا انھوں نے "ریاست" کے نام سے بہت سلیس اردو میں کیا ہے۔

ماہر تعلیم کی حیثیت سے برصغیر ہند و پاک میں ذاکر حسین صاحب کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہر سال وہ ہندوستان کے مشہور تعلیمی اداروں کے سالانہ اجلاسوں کی صدارت کرنے کے لئے مدعو کئے جاتے تھے۔ جامعہ نگر میں ہندوستان کی دوسری بنیادی تعلیمی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھاریئے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیئے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے بکمزور کو زور آور کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن امن کے ساتھ پھل پھول

سکے، اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں جس میں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہو۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین قیام پاکستان کے بعد ہندوستان ہی میں رہ گئے۔ غالباً ستمبر ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا۔ مشرقی پنجاب میں فسادات کی آگ پوری شدت سے بھڑک رہی تھی۔ مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ ان کے مرد عورتیں اور بچے بڑی بے دردی سے تہ تیغ کیے جا رہے تھے۔ ان کی عورتوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی تھیں۔ بچوں کو نیزے پر چڑھایا جا رہا تھا۔ ان کے قافلوں اور ان کی گاڑیوں کو گولی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ ٹرینوں میں اکا دکا مسلمان جو نظر آتے تھے انھیں بڑی بے دردی سے قتل کر دیا جاتا تھا۔ غرضکہ اس رقص ابلیس کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین جموں میل کے ذریعہ کشمیر سے دہلی جا رہے تھے۔ راستے میں غالباً جالندھر میں جب ٹرین رکی تو ہندو بلوائیوں نے انھیں دیکھ لیا۔ جھٹ ان کے ڈبے میں گھس کر ان کا مال اسباب لوٹ لیا اور ذاکر صاحب کو بھی قتل کرنے کی غرض سے پلیٹ فارم پر لے آئے۔ ذاکر صاحب بالکل خاموش تھے۔ اپنی شخصیت کو انھوں نے ان مجنونوں پر ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا، اور تن بہ تقدیر ہو گئے۔

ہندو بلوائی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ پلیٹ فارم پر موجود ایک سکھ کپتان کی نظر ذاکر صاحب پر پڑی، جو انھیں جانتا تھا۔ وہ دوڑا ہوا آیا اور بلوائیوں کو ڈانٹ کر کہا: "کیا کرتے ہو تم۔

نہیں جانتے کہ یہ کون ہیں۔ بھارت کے عظیم فرزند ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں" اس طرح ذاکر صاحب کی جان بچی، اور سکھ کپتان نے انھیں بحفاظت دہلی پہنچا دیا۔

بھارتی حکومت نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی خداداد صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا۔ ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، بعد ازاں صوبہ بہار کے گورنر، بھارت کے نائب صدر اور سب سے آخر میں بھارت کے صدر مقرر ہوئے۔ بھارتی حکومت کے خاص معتمدین میں وہ شمار کیے جاتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہمیشہ سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی۔ دہلی میں راشٹرپتی بھون (ایوان صدر) وہ وائسریکل لاج ہے جس میں ۳۴۰ کمرے اور مغل گارڈن ہیں، اور جو برطانوی استعماریت اور شان و شوکت کی ایک یادگار ہے، ڈاکٹر ذاکر حسین کا خاندان غالباً اس کے صرف چار پانچ کمروں میں سکونت پذیر تھا۔ باقی ماندہ کمرے انھوں نے حکومت کے حوالے کر دیے تھے، جس میں مختلف دفاتر وغیرہ اقامت پذیر تھے۔

ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق بیگم ذاکر حسین نے دربار ہال اس دن دیکھا جس دن ذاکر صاحب کی میت اس میں آخری دیدار کے لئے رکھی گئی۔ جس وقت ذاکر صاحب بیہوش ہو کر گرے، تو بیگم ذاکر حسین روٹی پکا رہی تھیں۔ گھر کا کھانا وہ خود پکاتی تھیں۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں میں اپنے بھتولی غلام محمد مرتضیٰ صاحب کے

یہاں ہندوستان گیا ہوا تھا، جو فتح پور یوپی میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ میرے بہنوئی اسٹیشن پر مجھے لینے آئے تو کرتہ پائجامہ اور چپل میں تھے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ پاکستان میں کوئی ڈپٹی کمشنر اپنے کمرہ خواب سے ڈرائنگ روم میں آتا ہے تو سوٹ پہن کر آتا ہے اور آپ کرتے پائجامے میں اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر لفٹ رائٹ کر رہے ہیں۔ سب کہنے لگے کہ "ہمارے ملک میں وزیر سے لے کر رکشہ والوں تک کا یہی لباس ہے۔"

میں فتحپور ہی میں مقیم تھا کہ ایک دن ذاکر صاحب کے حرکت قلب بند ہو جانے کی خبر آئی۔ موصوف دل کے مریض تھے۔ ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق اس کے نامہ نگار نے ذاکر صاحب کے داماد سے سوال کیا کہ "ذاکر صاحب نے کوئی وصیت نامہ چھوڑا ہے" ان کے داماد خاموش رہے۔ — دوبارہ جب نامہ نگار نے یہی سوال کیا تو انھوں نے آخر کار بتایا: "ڈاکٹر صاحب نے کوئی بنک بیلنس یا جائداد نہیں چھوڑی ہے۔ جامعہ ملیہ میں تین چار کمروں کا ایک پرانا مکان ہے، جو انھوں نے تقسیم ملک کے پہلے تعمیر کرایا تھا۔ یہی ان کی ساری ملکیت ہے پھر وہ کس بات کی وصیت کرتے۔" ہندوستان کا یہ عظیم فرزند جو تقریباً بیس سال تک وائس چانسلر، گورنر، نائب صدر اور صدر کے بڑے عہدوں پر فائز رہا اپنے بعد کوئی بنک بیلنس نہیں چھوڑ گیا۔

جگر صاحب

دسمبر ۱۹۳۴ء کی ایک سرد رات تھی۔ الٰہ آباد یونیورسٹی میں مسلم بورڈنگ ہاؤس کے وسیع احاطہ میں ایک بڑا شامیانہ نصب تھا۔ جسے رنگ برنگ کے برقی قمقموں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک بہت بڑا اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر ملک کے نامور شعراء جلوہ افروز تھے۔ جو مسلم بورڈنگ ہاؤس کے سالانہ مشاعرہ میں ملک کے گوشے گوشے سے تشریف لائے تھے۔ ان شعراء میں سائل دہلوی۔ اصغر گونڈوی۔ جگر مرادآبادی۔ جوش ملیح آبادی۔ روش صدیقی۔ سیماب اکبرآبادی۔ ساغر اور حفیظ ایسے نامور شعراء شامل تھے۔ مشاعرہ کی صدارت اردو کے مایۂ ناز مربی اور انجمن ترقی اردو کے نامور صدر سر تیج بہادر سپرو کر رہے تھے۔ جن کے پہلو میں مسلم بورڈنگ ہاؤس کے سابق آنریری سکریٹری اور الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر شاہ

محمد سلیمان بھی تشریف فرما تھے۔

طرحی مشاعرہ شروع ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا لیکن شامیانہ سامعین سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ جن لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی تھی وہ شامیانے کے باہر کھڑے تھے۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس کا مشاعرہ برصغیر کے سب سے بڑے مشاعروں میں شمار ہوتا تھا، اور اس میں ملک کے سارے عظیم شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔ اس مشاعرہ کی روایات کے مطابق طرحی مشاعرہ شروع ہونے سے قبل شعرائے کرام سے درخواست کی جاتی تھی کہ وہ اپنی ایک غیر طرحی غزل سنائیں۔ مختلف شعراء کے بعد ایک ایسے شاعر کی باری آئی جسے سننے کا مجھے پہلا اتفاق تھا۔ جو اپنی شکل صورت کے اعتبار سے بہت کریہہ واقع ہوا تھا۔ کالا گھٹا ہوا رنگ اس پر سفید سفید کوڑیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔ لمبے لمبے سیاہ الجھے ہوئے بال۔ چپٹی ناک اور بھرواں کالی داڑھی۔ پان خوری کی کثرت سے منہ اگالدان۔ مسکراتے تو دانت شریفے کے بیج کی طرح نمایاں ہو جاتے۔ شراب کے نشے میں دھت۔ جھوم جھوم کر انھوں نے پہلے گنگنانا شروع کیا، اور پھر ترنم کے ساتھ اپنی مشہور غزل بڑے والہانہ انداز میں شروع کی۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا،
دل کچھ اس صورت سے تڑپا انکو پیار آ ہی گیا

نور کا گلا پایا تھا۔ سامعین عالم وارفتگی میں کھڑے ہو گئے۔ سارا پنڈال واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے اڑا جاتا تھا۔ جب جگر صاحب نے اپنا مقطع

سنایا۔

جان ہی دے دی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا

تو سامعین پر بیخودی کا عالم طاری تھا۔ اور سامعین نے ایک زبان ہو کر چلانا شروع کیا۔ ایک اور۔ ایک اور۔ سر سلیمانؔ نے بھی جگر صاحب سے گزارش کی، لیکن جگر صاحب کو مے نوشی کی پیاس بُری طرح ستا رہی تھی۔ اس لئے وہ ہاں سے اٹھ کر کمرے میں شغل مے نوشی کرنے چلے گئے۔

جگر صاحب کو میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ یوں تو ان کا کلام اور نام بہت سنا تھا۔ پڑھے لکھے نوجوان طبقے میں ان کی غزلیں بیحد مقبول تھیں اور ہر شخص کی زبان پر تھیں۔ لیکن جگر صاحب کا جگر سے پار ہونے والا کلام اور ان کے پڑھنے کا والہانہ اور مستانہ انداز ایک ایسا مسحور کن سماں پیدا کرتا تھا جس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس صدی میں کسی دوسرے شاعر کے کلام نے اتنی داد وصول نہیں کی۔ اور مشاعرہ کے لئے ان سے بہتر کوئی شاعر اس صدی میں پیدا نہیں ہوا۔ جگر صاحب کی شرکت مشاعرہ میں جان ڈال دیتی اور ان کی غیر حاضری بڑے سے بڑے مشاعرے کو پھیکا اور ناکام بنا دیتی تھی۔ در حقیقت جگر صاحب کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جگر صاحب غرق مے ناب اولیٰ تھے۔ اور بقول ان کے:

پہلے شراب زیست تھی اب زیست ہے شراب
کوئی پلا رہا ہے پیئے جا رہا ہوں میں

اور — اے رحمت تمام مری ہر خطا معاف
میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا

ان کی رندی اور سرمستی نے ان کے کلام میں ایک والہانہ پن پیدا کر دیا تھا۔ جو اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کے روایتی عشق کو خودداری اور بلندی عطا کی، اردو غزل کے رسوائے زمانہ عاشق نامراد کو معشوق کا ہم پلہ بنا دیا۔ بلکہ بعض حالتوں میں تو عاشق مہجور کو معشوق سے بھی بلند درجہ عطا کیا۔ عاشق تو ہمیشہ سے معشوق کا دلدادہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ جگر صاحب نے معشوق کو بھی عاشق کا طلبگار بنا دیا۔

جگر وہ بھی تو سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

اور — ہم سے پوچھ اے ناصح دل گرفتگی ان کی
ہم نے چھپ کے دیکھا عالم پر آب ان کا

انھوں نے اردو کے ناکام اور نامراد عاشق میں خودداری پیدا کی۔ معشوق کے در کی جبیں سائی اور دربان کی خوشامد سے نجات دلا کر جگر صاحب نے عاشق کے درجہ کو بلند کیا۔

دیا ہے عشق نے وہ مرتبہ بحمد اللہ
کہ آنکھ تک نہ اٹھاؤں اگرچہ تو آئے

جگر کی شاعری میں انتہائی خلوص پایا جاتا ہے اسی لیے اس میں تاثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے جو جذبات شاعر کے دل سے نکلتے ہیں وہ سامعین کے قلوب میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ بقول جگر انھیں اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ ان کی زندگی اور شاعری میں انتہائی مطابقت پائی جاتی ہے۔

جگر وصال کے نہیں فراق کے شاعر ہیں۔ اسی لئے ان کے عشقیہ کلام میں جرأت اور داغ کی گھٹیا معاملہ بندی کے بجائے سنجیدگی اور بلندی پائی جاتی ہے۔

کیا قہر تھا کہ پاس ہی دل میں لگی تھی آگ
اندھیر تھا کہ دیدۂ تر دیکھتے رہے

زندگی کی بے ثباتی کو سارے شعراء نے بے نقاب کیا ہے۔ جگر کی بھی سنئے:

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
یہ زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہوں میں

انسانی زندگی سراپا الم ہے۔ اس میں خوشیاں خال خال نظر آتی ہیں۔ موت ہی پر اس پُرالم افسانہ کا اختتام ہوتا ہے۔

موت کی نیند چھائی جاتی ہے کہہ چکا میں فسانہ غم کیا

صداقت کی اثر انگیزی کو تمام اردو شعراء نے قلم بند کیا ہے۔ جگر کے چھوتے انداز کو دیکھئے:

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

جگر صاحب عہدِ حاضر کے سب سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر تھے بقول ڈاکٹر محی الدین زورؔ:

"وہ اس صدی کے سب سے بڑے اردو غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے عہدِ حاضر میں اپنے بلند پایہ کلام۔ اپنی شائستہ طبیعت اور اپنے پڑھنے کے خاص انداز سے اس تند و تیز سیلاب کا منھ موڑ دیا جو صنفِ غزل کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانا چاہتا تھا"

جگر صاحب نے عمر کے آخری دور میں شراب نوشی یکسر ترک کر دی تھی۔ ان کے آخری مجموعہ کلام "آتشِ گل" کی اشاعت کے بعد معلوم ہو گیا کہ اب جگر صاحب ایک اور ہی کیف اور مستی کے عالم میں پہنچ گئے ہیں۔ تصوف اور عرفان کا نشہ شراب کے نشہ سے کمتر نہیں ہوتا ہے جگر اب مئے عرفانہ سے سرشار تھے، اس لئے ان کے آخری دور کے کلام میں داغؔ اور مومنؔ کے رنگ کے بجائے میرؔ دردؔ کا سوز اور اقبالؔ کی بالغ نظری نمایاں ہے۔

شاہد احمد دہلوی صاحب کے بقول: "بعض چہرے بڑے دھوکہ باز ہوتے ہیں" اس قول کا اطلاق جگر صاحب پر بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ اس بدصورت شخص کے جسم میں ایک حقیقی انسان کا دل پوشیدہ تھا۔ جس میں محبت ہی محبت

تھی جو دوسروں کا دل دُکھانا نہیں جانتا تھا۔ جو اپنا نقصان کر کے دوسروں کو فائدہ پہنچانا اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا۔ اس کے مظاہرے بار ہا اس کی زندگی میں ہوئے۔

جگر صاحب نے شراب نوشی کے زمانے میں بھی کوئی رکیک حرکت سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کیا۔ انھوں نے رکھ رکھاؤ اور رواداری کو ہر حالت میں برتنے کی کوشش کی۔ وہ بڑی خود دار طبیعت کے مالک تھے۔ قدیم شائستگی اور روایات کے وہ حامل تھے۔ اس بدصورت شخص کے اندر کتنی خوبصورتی اور انسانیت پنہاں تھی۔ اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں۔ جنھیں ان سے کبھی واسطہ پڑا ہو، وہ سراپا محبت تھے۔ کارڈینل نیومین نے ایک شریف آدمی کی تعریف یوں کی ہے کہ: "وہ کسی کا دل نہیں دُکھاتا۔" اس تعریف پر جگر صاحب پورے اترتے تھے اور اس کے لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں شریف انسان تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کا دل نہیں دُکھایا۔ کسی کا دل دکھانا ان کے مذہب میں سب سے بڑا گناہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ سفر کر رہے تھے۔ ان کے ایک ہمسفر نے ان کی جیب کاٹی۔ جیب کٹتے وقت انھیں احساس ہو گیا کہ ان کے ساتھ یہ حرکت کی جا رہی ہے لیکن انھوں نے جیب کٹنا گوارا کر لیا لیکن ہم سفر کو ٹوکنا گوارا نہ کیا۔ مبادا اس کو تکلیف پہنچے، شرمندگی ہو اور اس کا دل دُکھے۔

جگر صاحب ایک بڑے خود دار انسان تھے۔ چھوٹوں اور غریبوں

سے وہ بہت جھک کر ملتے تھے۔ لیکن پُرغرور حکام اور امرا سے وہ ہمیشہ تنے رہتے تھے۔ مراد آباد کے ایک پہلوان صاحب جو کراچی میں دودھ کی چھوٹی سی دکان کرتے ہیں۔ جگر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ لیکن جگر صاحب نے کبھی اپنے رویہ سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ بڑے سے بڑے آدمی کے مقابلے میں انھیں حقیر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے جو اپنے کو بڑے سمجھتے ہیں جگر صاحب کا رویہ متمردانہ ہوتا تھا۔ ایک بار کراچی کے ایڈمنسٹریٹر کا آدمی جگر صاحب کو بلانے آیا کہ موصوف کے یہاں احباب کی محفل گرم ہے، آپ کو بلایا ہے۔ جگر صاحب نے جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں کوئی درباری شاعر نہیں ہوں۔

ایک بار جگر صاحب کی محفل میں ایک بڑے عالی مقام حاکم بھی پہنچ گئے، جو شعر و سخن کے معاملے میں انتہائی پھوہڑ واقع ہوئے تھے مثلاً شعر سن کر اظہار پسندیدگی کے طور پر ہنستے تھے، اور اچھے سے اچھے شعر پر خاموش رہتے تھے۔ یکایک جگر صاحب کے ایک شعر پر انھوں نے بےساختہ داد دی، اور کہنے لگے: "پھر پڑھیے" اس پر جگر صاحب نے ان کے جیب میں لگے ہوئے قلم کی جانب اشارہ کر کے کہا، "ذرا قلم عنایت کیجئے۔ اس شعر کو میں کاٹ دوں۔ اس میں ضرور کوئی خرابی ہے کہ آپ کو یہ پسند آیا ہے" حاکم صاحب دانت نکال کر رہ گئے لیکن حاضرین اس "توہین عدالت" پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

شوکت تھانوی مرحوم نے سردار عبدالرب نشتر گورنر پنجاب سے

جگر صاحب کی ملاقات کا تذکرہ بہت دلکش الفاظ میں کیا ہے:

"حضرت جگر مرادآبادی بھارت سے پاکستان آئے ہوئے تھے اور لاہور میں قیام تھا کہ ایک دن ایک صاحب ملنے کو تشریف لائے، نہایت کم سخن سے شرمیلے اور بہت ہی "ہیچمداں" قسم کے۔ جگر صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ ہیچمداں نہیں بلکہ "ہمہ داں" قسم کے بزرگ ہیں اور حیرت ہوگئی، یہ سن کر کہ پی ایچ ڈی بھی ہیں، حالانکہ صورت سے اے بی سی ڈی بھی نظر نہ آتے تھے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جگر صاحب نے پوچھا کہ آج کل آپ کیا کر رہے ہیں، وہ نہایت بے پروائی سے بولے "محکمہ آبادکاری میں ملازم ہوں"۔ رواداری میں تو جگر صاحب نے پان کھاتے ہوئے گردن ہلادی کہ گویا ان کو یہ سن کر اطمینان ہوگیا کہ برسرکار تو ہیں پھر خود ہی چونکے۔ "جی کیا فرمایا محکمہ آبادکاری آپ کا کیا تعلق آبادکاری سے۔ صاحب آپ علمی ڈاکٹر ہیں تعلیمات کے ماہر ہیں۔ آپ آبادکاری کے محکمہ میں کیسے چلے گئے۔ آبادکاری ہی کہا تھا نا آپ نے" ان صاحب نے بڑے سکون سے فرمایا۔ "جی ہاں آبادکاری ہی کے محکمہ میں ہوں اسی محکمہ میں ایک جگہ خالی تھی۔ لہٰذا مجھ کو رکھ لیا گیا"۔ جگر صاحب نے اور بھی چکرا کر کہا۔ "صاحب یہ کیا بات ہوئی فرض کر لیجئے کہ کسی اسپتال میں کسی نرس کی جگہ خالی ہوتی تو گویا آپ کو نرس بنادیا جاتا۔ کسی تھانہ پر ایک تھانیدار کی جگہ خالی ہوتی تو آپ تھانیدار بنا دئے جاتے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آخر محکمہ تعلیم نے آپ کی خدمت سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔"

ان صاحب نے بڑے عجز سے کہا کہ "میرا کوئی اثر ورسوخ محکمہ تعلیم میں

نہیں ہے۔ میری رسائی گورنر تک بھی نہیں ہے جو چانسلر ہیں۔"

ان کی بات کاٹ کر جگر صاحب نے دوسرے حاضرینِ محفل کو ڈانٹنا شروع کیا کہ صاحب یہ کیا اندھیر ہے۔ ہرن پر گھاس لادی جارہی ہے۔ اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ گدھے تو خیر خشکہ کھاتے رہتے ہیں اور میں اس کو ان کی خوبیٔ قسمت سمجھتا ہوں مگر ایک پی ایچ ڈی کا محکمہ آبادکاری سے کیا تعلق!"

جگر صاحب کا یہ سب کچھ زبانی جمع خرچ نہ تھا بلکہ وہ واقعی بےچین تھے۔ وہ سچ مچ پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ ان کا رمی کھیلنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ کئی مرتبہ تاش کی گڈی اٹھائی اور پھر یہ کہہ کر رکھ دی "صاحب مناسبت کیا ہے، پی ایچ ڈی ہیں اور محکمہ آبادکاری میں۔" اور آخر مجھ سے کہا کہ "صاحب آپ مجھے لے کر نشتر صاحب کے پاس چلئے، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔" میں نے جگر صاحب کو سمجھایا کہ نشتر صاحب سے ملنے کے لئے ان کے سکریٹری سے وقت مقرر کرنا پڑے گا، اور اس طرح نہیں ملا جا سکتا کہ آپ شہر والی بہنیں اور ان سے ملنے کے لئے ان کے دروازے پر جا کر آواز دیں۔ اگر آپ فرمائیں تو میں ان کے سکریٹری کو ٹیلی فون کئے دیتا ہوں کہ جگر صاحب گورنر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ جگر صاحب نے بات سمجھتے ہوئے کہا: "جی ہاں۔ جی ہاں، وقت مقرر کر لیجئے۔ اور ڈاکٹر صاحب آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔" میں نے گورنمنٹ ہاؤس ٹیلی فون کر کے گورنر کے سکریٹری کو جگر صاحب کا پیغام پہنچا دیا، اور تھوڑی ہی دیر بعد سکریٹری نے ٹیلی فون پر مجھے اطلاع دی کہ ہز ایکسیلنسی کل سہ پہر کو چار بجے جگر صاحب

کو۔ آپ کو اور ڈاکٹر صاحب کو چائے پر مدعو کر رہے ہیں اور آپ صاحبان کا انتظار کریں گے۔ جگر صاحب بظاہر تو مطمئن ہو گئے۔ مگر اس دن رہ رہ کر یہی کہتے رہے کہ صاحب یہ تو کمال ہی ہو گیا کہ پی ایچ ڈی اور محکمہ آبادکاری میں ملازم۔ یہ خیال ان کو رمی کھیلنے میں بھی آتا رہا اور جب کبھی جو کر نہ آتا تھا یہ خیال ان کو آجاتا تھا۔

"دوسرے دن وقت مقررہ پر ہم تینوں گورنمنٹ ہاؤس پہنچے سکریٹری صاحب نے جو ہمارے منتظر تھے، ہم کو گورنمنٹ ہاؤس کے بالائی منزل پر پہنچا دیا۔ جہاں بالکل گھریلو انداز سے نشتر صاحب لٹھے کی شلوار اور ململ کا سفید لمبا کرتا پہنے ہال کے دروازے ہی پر ہم لوگوں کے منتظر تھے۔ جگر صاحب کو دیکھ کر اس عقیدے سے بڑھ کر ملے ہیں کہ گویا اس وقت وہ شاعر تھے اور جگر صاحب گورنر۔ بڑے تپاک سے سب کو ملاقاتی کمرے میں لے گئے اور جب تک سب کو بٹھا نہ لیا خود بھی نہ بیٹھے۔ جگر صاحب نے بیٹھتے ہی کہا۔

"ہاں صاحب طبیعت خوش ہو گئی۔ ذہن کے کسی گوشے میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں اس سلیقے سے پان بھی رکھے ہوئے ملیں گے۔"

نشتر صاحب جلدی سے اٹھے اور پانوں کی کشتی اٹھا کر پیش کرتے ہوئے کہا، "مجھے معلوم تھا کہ آپ شوق فرماتے ہیں، اور ڈر تھا کہ اس کمی کو محسوس نہ کریں۔"

جگر صاحب نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "خیر نہ سہی۔"

مجھ کو تو جگر صاحب کی اداشناسی کا دعویٰ ہے مگر نشتر صاحب اپنی ذہانت سے کام لے کر ایک طرف لپکے مگر شکر ہے کہ ان کے پہنچنے سے پہلے میں اگالدان تک پہنچ چکا تھا ورنہ یہ گورنر شاید اگالدان تک اٹھالاتا۔ اب جگر صاحب پان تھوک کر اور پان کھاکر اپنے مخصوص انداز میں گل افشانی فرما رہے تھے۔ کہ "وہ جو ایک چیز ہوتی ہے۔ جی ہاں۔ بڑی نزاکتیں ہیں۔ اس میں اس تعلق کا کوئی نام نہیں ہے، اور نہ دیکھا جا سکتا ہے وہ تو بس ایک۔ جی ہاں۔ احساسی چیز ہے۔ چنانچہ وہ ہے اور میں نے اسے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔"

"میں سمجھ رہا تھا کہ نشتر صاحب کی آؤ بھگت اور اس حلم سے متاثر ہیں۔ اور اس خلوص کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو انھیں نشتر صاحب سے ہے مگر خلوص کا نام لینا نہیں چاہتے۔ بس اس کو "ایک چیز" کہہ رہے ہیں۔ نشتر صاحب غور سے ان کی باتیں سنتے رہے اور اس طرح سمجھنے کی کوشش کرتے رہے جس طرح ہم لوگ تجریدی آرٹ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، یا بعض لوگ معمے حل کرنے میں دماغ سوزی سے کام لیتے ہیں۔ اسی وقت اس کمرے میں چائے لگادی گئی اور اس کا دور بھی چلتا رہا۔ نشتر صاحب خود اٹھ کر ایک ایک چیز پیش کرتے رہے۔ اور جگر صاحب کی تو تیمارداری کی حد تک تواضع کرنے میں مصروف رہے۔ آخر چائے کے بعد خود نشتر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کے متعلق دریافت کیا کہ آپ کی تعریف کیجیے۔ تو جگر صاحب کو جیسے اچانک یاد آگیا کہ ان کے واسطے وہ یہاں آئے ہیں

اور ان ہی کا اب تک تعارف نہیں کرایا۔

"اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کی علمی اور تعلیمی صلاحیتوں کی پوری تفصیل ہیں جاکر گورنر صاحب کو بتایا کہ ان صلاحیتوں کا حامل یہ شخص محکمہ آبادکاری میں ملازم ہے۔ نشتر صاحب فوراً تہ کو پہنچ گئے اور دو لفظوں میں اس پوری تفصیل کا جواب دے دیا کہ" اب یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں ان کو صحیح منصب پر پہنچا دوں۔" یہ صرف سرسری اور رسمی وعدہ نہ تھا بلکہ ڈاکٹر صاحب دو ماہ بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ بھی کر دیئے گئے۔

"ذکر تھا نشتر صاحب سے اس ملاقات کا جس میں ابھی چائے کا دور چل رہا تھا۔ چائے کے اس دور کے بعد ہی نشتر صاحب کے ایک، صاحبزادے نہایت ادب سے آکر ایک طرف بیٹھ گئے۔ غالباً ان کو انتظار تھا کہ جگر صاحب سے کچھ سنا بھی جائے گا۔ مگر نشتر صاحب نے آخر تک یہ فرمائش بھی نہ کی اور جگر صاحب کو یہ زحمت بھی نہ دی۔ ہم سب تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد گورنمنٹ ہاؤس سے رخصت ہو کر جب باہر نکلے تو ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے اپنے استعجاب کا اظہار کیا۔

" میرے تو ذہن میں بھی نہ آسکتا تھا کہ اس منصب پر پہنچ کر بھی اخلاقی قدروں کا اتنا لحاظ رکھا جا سکتا ہے۔"

"جگر صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی۔" جی ہاں۔ مگر وہ جو ایک چیز ہوتی ہے۔ وہی راز ہے ان تمام ترقیوں کا۔ عالی ظرفی انسان کو چھلکنے نہیں دیتی۔"

جگر صاحب کے انتقال کی خبر کم سے کم دو مرتبہ اخبارات میں نکل چکی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں یہ خبر بڑے زور شور سے اڑی۔ تمام اخبارات نے ان کا ماتم کیا، جامع مسجد دہلی میں تعزیتی قرارداد منظور کی گئی اور غائبانہ نماز جنازہ بھی پڑھائی گئی۔

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد جگر صاحب اپنے دوست محمود علی خاں صاحب کے مکان پر قرول باغ دہلی پہنچے۔ محمود صاحب کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا تھا کہ مراد آباد میں مردہ بھی زندہ ہو جاتا ہے۔ جگر صاحب نے قصہ بتایا کہ چند احباب کے ساتھ وہ جنگل شکار کے لئے گئے۔ واپسی میں وہ کہیں راہ بھٹک گئے۔ دوستوں نے مذاقاً کہہ دیا کہ جگر صاحب تو انتقال کر گئے۔ اخبار اسٹیسمن کے نمائندے نے اسے سچ سمجھ کر اپنے اخبار کو تار دے دیا۔ وہ خبر چھپی تو سارے ملک میں کہرام مچ گیا۔ انڈیا ریڈیو نے جگر کی یاد میں جگر ڈے منانے کا اعلان کر دیا۔ دوسرے دن یہ پروگرام ہونے والا تھا۔ محمود خاں صاحب نے ریڈیو کو ٹیلی فون کیا کہ جگر صاحب جامعہ ملیہ کے دفتر میں موجود ہیں۔ انڈیا ریڈیو کا ڈائرکٹر بھاگم بھاگ جامعہ ملیہ پہنچا۔ طے ہوا کہ جگر ڈے تو بدستور منایا جائے لیکن تعزیت کی جگہ اسے حیات جدید کا رنگ دے دیا۔ دوسرے دن جگر صاحب نے ہندوستانی ریڈیو سے اپنا کلام سنایا۔

دوسری مرتبہ ۱۹۵۸ء میں جگر صاحب کی موت کی خبر اڑی جبکہ ان پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ پاکستان میں یہ خبر سب سے پہلے لاہور کے ایک اخبار میں شائع ہوئی۔ کراچی کے اخباروں نے اس کی نقل کی۔ تعزیت کی قرارداد بھی منظور ہوئی جس کی صدارت احسان دانش نے کی۔ آخر کار یہ خبر بھی

غلط ثابت ہوئی۔

لیکن موت سے کسے رستگاری ہے۔ آخر کار اس بیماری دل نے کام تمام کیا اور ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء کو اس بلبلِ ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔ سارے ہندوستان اور پاکستان میں جگر صاحب کا سوگ منایا گیا اخبارات نے ضمیمے شائع کئے حکومت ہندوستان اور حکومت اتر پردیش نے ان کی بیوی کے لئے چار سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔

اس سے قبل حکومت ہند نے جگر صاحب کو اپنا سب سے بڑا ادبی اعزاز "پدما بھوشن" اور ان کی غزلیات کے نئے مجموعے "آتشِ گل" کو پانچہزار روپے کا انعام عطا کیا تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی تھی۔

حکومت ہند اردو ادیبوں کو اعزازات تقسیم کرنے میں ابھی تک بہت ہوشمند اور منصف مزاج ثابت ہوئی ہے اور ابھی تک جتنے اردو ادیبوں کو یہ اعزازات بخشے گئے ہیں وہ واقعی اس کے مستحق تھے۔ ان میں نیاز فتحپوری۔ جوش ملیح آبادی۔ جگر مرادآبادی۔ عبدالماجد دریابادی۔ رشید احمد صدیقی۔ فراق گورکھپوری۔ سید سلیمان ندوی وغیرہ شامل ہیں۔

جگر صاحب جب تک زندہ رہے برابر پاکستان آتے رہے پاکستان میں ان کے نیازمندوں اور مداحوں کی کافی تعداد تھی۔ کراچی آتے تو مہینوں یہاں ٹھہرتے۔ ان کے متعدد نیازمند صاحبِ ثروت اور صاحبِ اقتدار

طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ برابر کوشاں رہتے تھے کہ جگر صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے مستقل طور سے پاکستان میں آباد ہو جائیں۔ طرح طرح کی ترغیبات سے کام لیتے تھے اور ہندوستان میں مسلمانوں پر ہونے والی زیادتیوں اور ستم رانیوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ ایک بار جب اصرار زیادہ بڑھا تو جگر صاحب نے بہت خوبصورت شاعرانہ جواب دیا۔ انھوں نے فرمایا:

"جناب آپ جو فرماتے ہیں درست ہے، لیکن میں ہندوستان نہیں چھوڑ سکتا۔ کیا کیا جائے مجھے ان کا کرم بھی عزیز ہے اور ستم بھی عزیز ہے۔"

جوشؔ ملیح آبادی

ہندوستان میں مغربی تہذیب کے اتصال نے قومی زندگی کے سارے شعبوں کو متاثر کیا۔ اردو ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اردو کی روایتی گل و بلبل کی شاعری میں مبالغہ آرائی کی جگہ حقیقت پسندی اور فطرت نگاری نے لے لی۔

آزادؔ اور حالیؔ نے سب سے پہلے اس انقلاب کی ضرورت کو محسوس کیا۔ آزادؔ نے اپنی چھوٹی چھوٹی نظموں میں مناظرِ فطرت کو بڑی خوش اسلوبی سے قلم بند کیا۔ حالیؔ نے اپنے "مقدمہ شعر و شاعری" میں اس انقلاب کی نشاندہی کی۔ حالیؔ کی اس تصنیف میں جو اردو شاعری میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، جدید اردو شاعری کی نشاندہی اور اس کے لئے زمین تیار کی گئی ہے۔ حالیؔ نے اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اردو غزل کو زندگی سے

متعلق ہر قسم کے خیالات کا مظہر بنایا۔ ان کی "مسدس حالی" جس کا شمار اردو کی مقبول اور عظیم ترین نظموں میں ہوتا ہے اور ان کے مرثیہ غالب نے جدید اردو شاعری کے لئے بلند پایہ مثالیں قائم کیں۔

جدید اردو شاعری نے بڑے نامور اور عظیم شعراء پیدا کئے، ان میں عظیم مزاحیہ شاعر اکبر الہ آبادی۔ خمریات کے امام ریاض خیرآبادی۔ جدید اردو نظم کے تابندہ ستارے اقبال، چکبست اور جوش۔ اور جدید اردو غزل کے مستحکم ستون حسرت۔ فانی۔ اصغر اور جگر شامل ہیں۔ اقبال کی شاعری جس میں تخیل کی بلند پروازی۔ فطرت اور حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ خیالات کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ دنیا کی بہترین شاعری کی صف میں جگہ پانے کی قابل ہے۔ جدید شاعری نے حالی کی ابتدائی نظموں سے ترقی کر کے اقبال اور جوش کے یہاں پختگی اور بلندی اختیار کر لی۔

ہندوستان کی تاریخ میں بیسویں صدی کا زمانہ بڑا انقلاب آفریں دور کہلانے کا مستحق ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جسے مغربی مورخین غدر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسلامی ہند کا معاشی اور سیاسی انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ گیا تھا۔ سید احمد خاں نے اس کو روکنے کی کوشش کی۔ برطانوی استعمار کے معاشی اور سیاسی استحصال نے برصغیر کی سونا اگلنے والی سرزمین کو بنجر کر دیا تھا اور اس کے عوام کو ننگا اور بھوکا بنا دیا تھا۔ ایسے ماحول میں کانگریس، مسلم لیگ اور بعد ازاں خلافت تحریکوں نے جنم لیا اور پروان چڑھیں۔ ان تحریکوں نے ہندوستان کے پسماندہ عوام میں بیداری

کی لہر دوڑادی۔

اسی انقلابی ماحول میں شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی نے جنم لیا۔ وہ ملیح آباد لکھنؤ کے ایک متمول جاگیردار خاندان میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی پرورش جاگیردارانہ ماحول میں ہوئی اس وقت کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ جاگیردار کا یہ بچہ جاگیرداری۔ سرمایہ داری کا کٹر دشمن اور اپنے زمانے کا سب سے بڑا انقلابی شاعر ہوگا۔ لیکن بچپن ہی سے وہ بڑے آزاد خیال واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے پہلے مجموعہ کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"میں بچپن ہی سے بہت آتش نوا واقع ہوا تھا۔ اور یہی خصوصیت میری نظموں میں بعد ازاں ظاہر ہوئی۔"

جوش کی شاعری کی ابتدا، رومانیت سے ہوئی۔ میتھو آرنلڈ کا قول ہے کہ "شاعری زندگی کا عکس اور آئینہ ہوتی ہے"۔ جوش کی ابتدائی شاعری میں نوجوان جوش کے رومانی اور عشقیہ جذبات اور خیالات کی بہت دلکش عکاسی ملتی ہے۔ جوش کی اس زمانے کی نظموں میں فطرت نگاری۔ عشقیہ شاعری اور مناظرِ قدرت کے بہت بلند پایہ نمونے نظر آتے ہیں۔

جوش کی رومانی شاعری ان کی شاعری کا نقطۂ عروج ہے جو ان کی انقلابی شاعری سے زیادہ دیرپا اور لافانی ہے۔ فطری طور پر وہ رومانی شاعر ہیں۔ ان کی رومانی شاعری میں مناظرِ قدرت اور فطرتِ انسانی کے بڑے حسین خاکے ملتے ہیں۔ ایک چابکدست مصور کی طرح انھوں نے انسانی جذبات، اور خیالات کی بڑی فطری عکاسی کی ہے۔ اور انھیں

بڑے حسین اور فطری رنگوں میں پیش کیا ہے۔ ورڈسورتھ کی طرح انھوں نے مناظر قدرت میں تخئیل کی رنگ آمیزی کرکے اسے حسین تر بنادیا ہے۔ اپنی شاہکار نظم "جنگل کی شہزادی" میں انھوں نے اسے اس طرح بیان کیا ہے۔

حوریں ہزار جان سے قربان ہوگئی ہیں

رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی ہیں

شاعر کو اس بات کی شدید خواہش ہے کہ وہ ان کوہستانوں اور جنگلوں میں قیام کرتا اور جنگل کی شہزادی کے جلوؤں سے لطف اندوز ہوتا:

شام و سحر کے جلوے میرے قریب ہوتے

یہ چاند اور ستارے میرے رقیب ہوتے

شام کے وقت جنگل کے منظر کو اس نے کتنے حقیقت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے:

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں

طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

الفاظ کے استعمال میں جوش اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ الفاظ کی جتنی فراوانی اور تنوع جوش کے یہاں پایا جاتا ہے اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ وہ خیالات اور تصورات کے مطابق موزوں ترین الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

وہ چہکے عنادل وہ سنکی ہوائیں۔

گلوں کی طرح چاک داماناں کر

جوش حقیقی معنوں میں ایک سوشلسٹ شاعر ہیں انھوں نے غربت اور امارت کے بہت موثر نقشے کھینچے ہیں۔ انسانی زندگی میں غیر مساوات۔ امیری اور غریبی کے نمایاں فرق نے ہر زمانے میں ذی شعور اشخاص کے احساسات کو مجروح کیا ہے۔ اور شعراء نے خدائی انصاف پر بھی شک وشبہ کا اظہار کیا ہے غالب نے کہا تھا:

زندگی اپنی جو اس طرح سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

جوش جو فطرتاً ایک انقلابی شاعر ہے انسانی زندگی میں غیر مساوات سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اور انھوں نے اپنی نظم امیر وغریب میں، امارت اور غربت کے اس فرق کی بڑی فطری عکاسی ہے۔

مال کا ایک، ڈبہ جس میں ریل کے مزدور تھے
آکے ٹھہرا دوسرے درجہ کے بالکل سامنے
اس طرف ناپاکیاں تھیں خاک کا انبار تھا
اس طرف ہر ذرہ گویا مصر کا بازار تھا
آہ ان دونوں میں اک شے مشترک جو ہر نہ تھی
ان کے جوتوں پر چمک تھی ان کے چہروں پر نہ تھی
اللہ اللہ اس قدر عدل وتناسب کی کمی
اس طرف بھی آدمی تھے اُس طرف بھی آدمی
کوئی محروم اور کوئی رحمتوں سے بہرہ مند　　آدمی اور آدمی میں اس قدر پست وبلند

آہ اس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون
جز خدا اس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون

اسلام نے دنیاوی اور اخروی زندگی کی تفسیر اس خوبی سے کی ہے جس سے یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے اور اس میں جو تضاد پایا جاتا تھا وہ دور ہو گیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے اور دنیا جائے امتحان ہے۔ دنیاوی اعمال کا بدلہ انسان کو اس کی اُخروی زندگی میں ملے گا جو ابدی اور جاودانی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر زمانے میں خدا کے نیک بندوں نے دنیا میں بڑی عُسرت۔ تنگدستی اور نفس کشی کی زندگی بسر کی ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

جگہ دل لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

جوش کی انقلابی شاعری میں بہت بے باکی اور تندی پائی جاتی ہے۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران انھوں نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف اور ہٹلر اعظم کی تعریف میں جو نظمیں کہی ہیں وہ بغاوت کے حدود میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس طرح انھوں نے سیکولر بھارت کی کانگریسی حکومت کی غیر جمہوری اور مسلم کش پالیسی کی بھی خوب خبر لی ہے۔ اور اس وقت لی ہے جب وہ ہندوستان میں مقیم تھے، اور بھارتی حکومت کے ملازم تھے۔ پاکستان میں اگر ایسی نوبت آتی تو شاید وہ ملک بدر کر دیئے گئے ہوتے۔ جوش صاحب کے شاعرانہ کمالات میں ان کی خمریات بھی شامل ہے

جس میں انھوں نے شراب نوشی کو بڑے دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس میں اکثر واعظ اور شیخ پر طنز بھی ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں:

کیا شیخ ملے گا لن ترانی کر کے

توہین مزاج زندگانی کر کے

تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے انھیں

جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے

جوش صاحب کو سب سے پہلے میں نے ۱۹۳۴ء میں دیکھا۔ الہ آباد یونیورسٹی کی مسلم بورڈنگ ہاؤس کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے اردو کے نامور شعراء اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ سائل دہلوی۔ بے خود۔ موہانی۔ صفی لکھنوی۔ تاباں بدایونی۔ نوح ناروی۔ اصغر گونڈوی۔ سیماب اکبرآبادی۔ جگر مرادآبادی۔ روش صدیقی۔ ساغر نظامی۔ جوش ملیح آبادی۔ آنند نرائن ملا۔ اور ان کے علاوہ درجنوں شعرا تھے۔ سامعین میں الہ آباد اور لکھنؤ کی ممتاز شخصیتیں تھیں جن میں سر تیج بہادر سپرو۔ شیو پرشاد سنہا۔ سر شاہ محمد سلیمان امرناتھ جھا۔ پروفیسر ضامن علی۔ تیج نرائن ملا۔ اور جسٹس نعمت اللہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

جوش صاحب کی یہ جوانی کا زمانہ تھا۔ جوش صاحب کی چڑھتی جوانی اور اودھ کی رنگین فضاؤں نے ان کی شاعری کو اور بھی دوآتشہ بنا دیا تھا۔ یہی زمانہ تھا جب ان کی رومانی شاعری اپنے شباب پر تھی، اور ان کی

انقلابی شاعری کا آغاز ہو رہا تھا۔ سبھی شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ سب کا جداگانہ اور مخصوص رنگ تھا۔ جوش صاحب کی باری آئی تو انھوں نے رباعیات اور قطعات سے آغاز کیا۔ جس کو سن کر سامعین جھوم جھوم گئے۔

مسلم بورڈنگ ہاؤس میں شعراء کرام کی بڑی خاطر مدارات کی جاتی تھی۔ ان کے آرام و آسائش اور دیگر لوازمات کا ہر طرح سے خیال کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شراب پینے والے شعراء کو شراب بھی مہیا کی جاتی تھی۔ مشاعرہ ہر سال دسمبر میں ہوا کرتا تھا۔ کافی سردی کا موسم ہوتا تھا۔ بعض شعرا کو چائے پینے کی لت ہوتی ہے۔ ان کے لئے رات میں کئی بار چائے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ لاہور کے ایک شاعر صاحب کو رات میں ہر گھنٹے کے بعد چائے اور گرم پانی درکار ہوتا تھا۔ ان کی ضرورتوں اور دیکھ بھال کے لئے ایک بیرے کو ان کے کمرے پر متعین کر دیا گیا تھا، جو رات بھر ان کے لئے گرم پانی اور چائے کا انتظام کیا کرتا تھا۔

مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مشاعرہ کے دوسرے دن ایک مخصوص محفل منعقد ہوتی تھی، جو مشاعری کے نام سے موسوم تھی۔ اس میں مشہور شعرا سے ان کا غیر طرحی اور شاہکار کلام سنا جاتا تھا۔ جگر اور جوش مقبول ترین شعرا تھے، جن کے کلام سے سامعین کی کبھی سیری نہیں ہوتی تھی، اور بار بار اصرار کر کے ان کا کلام سنا جاتا تھا۔ مشاعرے کے دوسرے یا تیسرے دن سر تیج بہادر سپرو کے یہاں بھی محفل گرم ہوتی تھی۔

جس میں سربرآوردہ شعراء کو مدعو کیا جاتا تھا۔ سر تیج بڑے باذوق انسان تھے اور اردو شاعری کے تو دلدادہ تھے۔ ان کے یہاں بڑی صاف ستھری محفل ہوتی تھی، اچھے اشعار پر جی بھر کر داد دی جاتی تھی، اور مجلس کے آداب کو پوری طرح ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

جوش صاحب کو الہ آباد یونیورسٹی بورڈنگ ہاؤس کے سالانہ مشاعروں اور دیگر مشاعروں میں متعدد بار مجھے سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کا رنگین اور رندانہ کلام سامعین سے بہت داد وصول کرتا تھا اور اکثر تو مشاعرے پر وہ چھا جاتے تھے۔ بلاشبہ جگر مرادآبادی۔ فانی بدایونی اور اصغر گونڈوی اور مزاحیہ نگار شاعر ظریف لکھنوی کے بعد وہ اس زمانے کے مشاعروں کے سب سے مقبول شاعر تھے۔

جوش صاحب کے رندانہ کلام نیز واعظ۔ شیخ اور خدا سے متعلق خیالات کو مذہب پرست شعرا اور سامعین پسند نہیں کرتے تھے۔ اس معاملہ میں روش صدیقی ان کے سخت مخالف تھے۔ اور مشاعرے میں ان دونوں میں نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ غالباً ۱۹۴۴ء کا مسلم بورڈنگ ہاؤس کا مشاعرہ تھا۔ جوش نے ایک رباعی ارشاد فرمائی جس میں خدا کی ذات پر حملہ کیا گیا تھا۔ روش صدیقی اس پر چراغ پا ہو گئے اور حاضرین احتجاج کے طور پر کھڑے ہو گئے۔ قریب تھا کہ آپس میں جوتم پیزار ہو جائے کہ مشاعرے کے منتظمین نے جوش صاحب کو عقبی دروازے سے ہوسٹل سے باہر نکال کر محفوظ جگہ پر پہنچا دیا۔

عرصہ ہوا کراچی کے یوم جگر کے مشاعرے میں بھی فنا کانپوری اور

جوش صاحب میں اس قسم کی تکرار ہوگئی تھی لیکن وہ شاعرانہ نوک جھونک تک محدود رہی۔

جوش صاحب اردو کے عظیم شاعر ہیں۔ رومانی انداز اور انقلابی شاعری میں ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ انسانی معاشرے میں غیر مساوات اور ظلم و ستم سے وہ بہت متاثر ہیں۔ اور اس کا ذمہ دار کسی حد تک وہ خدا کو ٹھہراتے ہیں جس کی وجہ سے وہ مذہب پرست حلقوں میں غیر مقبول ہیں۔ انھیں خصوصیات کی بنا پر وہ بھارت کے برسر اقتدار طبقہ میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ بھارت کے وزراء اور سفراء جوش صاحب کی بڑی عزت اور تکریم کرتے تھے۔ بقول ان کے نہرو اور آزاد کے پاس تو وہ کسی وقت کسی اجازت اور کسی تکلف کے بغیر چلے جاتے تھے لیکن پاکستان میں انھیں معمولی معمولی سرکاری اہلکاروں سے ملاقات کرنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جوش صاحب نہرو کی شخصیت سے بہت متاثر ہیں، اور انھیں ایک عظیم انسان تصور کرتے ہیں۔ وہ انھیں اس طرح مخاطب کرتے ہیں: "اے لافانی جواہر لال! ارضِ انسانیت کا سجدہ قبول کر۔" ان کے مطابق: "اچھے سیاست والوں کے واسطے یہ لازمی شرط ہے کہ اصول خدمت و انسانیت کے اعتبار سے وہ ناقابلِ برداشت حد تک بڑا آدمی ہو۔" جوش صاحب اپنی مشہور خود نوشتہ سوانح حیات "یادوں کی برات" کے صفحہ ۵۳۲ پر پنڈت نہرو کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، جو پاکستانیوں کے لئے باعث عبرت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" ایک بار جب پاکستان سے رخصت ہو کر میں دہلی میں ان سے (جواہر لال سے) ملا تو بڑے طنز کے ساتھ انھوں نے مجھ سے کہا "جوش صاحب پاکستان کو اسلام ۔ اسلامی کلچر اور اسلامی زبان یعنی اردو کے تحفظ کے لئے بنایا گیا تھا لیکن ابھی کچھ دن ہوئے کہ میں پاکستان گیا تھا، اور وہاں میں نے یہ دیکھا کہ میں تو شیروانی اور پائجامہ پہنے ہوں لیکن وہاں کی گورنمنٹ کے تمام افسر سو فیصد انگریزوں کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مجھ سے انگریزی بولی جا رہی ہے، اور انتہا یہ ہے کہ مجھے انگریزی میں ایڈریس دیا جا رہا ہے۔ مجھے اس صورتحال سے بے حد صدمہ ہوا۔ میں سمجھ گیا اردو اردو کے نعرے جو ہندوستان میں لگائے گئے تھے وہ سارے اوپری دل سے اور کھوکھلے تھے، اور ایڈریس کے بعد جب میں کھڑا ہوا تو میں نے اس کا اردو میں جواب دے کر سب کو حیران کر دیا، اور یہ بات ثابت کر دی کہ مجھے اردو سے ان کے مقابلے میں کہیں زیادہ محبت ہے ۔ اور جوش صاحب معاف کیجئے گا، آپ نے جس اردو کے واسطے اپنے دیش کو تج دیا ہے، اس اردو کو پاکستان میں کوئی منہ نہیں لگاتا ہے اور جائیے پاکستان ۔"

جوش صاحب لکھتے ہیں "میں نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں، ان سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن ان کی باتیں سن کر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ میں نے پاکستان کے ایک بڑے شاندار منسٹر صاحب کو جب اردو میں خط لکھا اور ان صاحب بہادر نے انگریزی میں جواب مرحمت فرمایا تو میں نے جواب الجواب میں یہ لکھا تھا کہ جناب والا میں نے تو آپ کو اپنی مادری زبان میں خط لکھا،

آپ نے اس کا جواب اپنی پدری زبان میں تحریر فرمایا ہے۔

"چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"

پاکستان میں بھارت سے آنے والے عظیم مسلم دانشوروں۔ فنکاروں اور ادیبوں کی جس طرح مٹی پلید ہوئی وہ منظرِ عام پر آچکی ہے۔ جوش صاحب بھی اس مشقِ ستم سے بچ نہیں سکے۔ جوش صاحب کو پاکستان ہجرت کرنے کے لئے جن ترغیبات۔ وعدوں اور وعید سے کام لیا گیا، اور بڑی سے بڑی سرکاری سطح پر انھیں جو سبز باغ دکھائے گئے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے سبھی کو معلوم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان کے اعلیٰ ترین سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں حضرت جوش کی بڑی قدر و منزلت تھی، اور انھیں اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ پاکستان میں اس عظیم شاعر رومان اور انقلاب کو کھینچ لانے کے لئے یہاں کے اعلیٰ ترین سرکاری حلقوں کی جانب سے ہر قسم کی ترغیبات کی پیش کش کی گئی۔ پاکستان میں حضرت جوش نے اردو کی خدمت کے لئے اردو ترقی بورڈ کا منصوبہ تیار کیا۔ اس منصوبے کو پروان چڑھانے میں بیگم شائستہ اکرام اللہ اور ان کے بھائی پاکستان کے سابق وزیر اعظم حسین شہید سہروردی ان کے پرائیویٹ سکریٹری آفتاب احمد خاں اور پھر وہاں سے نکل کر مرکزی محکمہ تعلیم کے مشیر عترت حسین زبیری اور آخر میں مالی امداد فراہم کرنے میں وزارتِ مالیات کے علم دوست سابق سکریٹری جناب ممتاز حسن خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اردو بورڈ کے قیام سے متعلق جوش صاحب کے منصوبہ کو

عملی جامہ پہنانے کا سہرا انھیں بزرگوں کے سر ہے۔

اردو ترقی بورڈ کا کام اردو زبان کی ایک جامع لغت مرتب کرنا تھا اور اس کے لئے حضرت جوش ملیح آبادی سے زیادہ موزوں دوسرا شخص ملنا مشکل تھا۔ جو بذاتِ خود اردو الفاظ کا خزانہ ہیں، اور جن کے کلام میں بلاشبہ سب سے زیادہ اردو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اس لغت کی ادارت حضرت جوش کے سپرد کی گئی اور ان کی اعانت کے لئے ڈاکٹر شوکت سبزواری، اعجاز الحق قدوسی اور مولانا ناز کریا وغیرہ کو مقرر کیا گیا۔ لیکن اس ادارہ کے منتظمین نے اس کو سیاسی اکھاڑہ بنا دیا۔ پاکستان کے دیگر سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر کی طرح وہ اس ادارہ کو بھی جی حضوریوں کا ادارہ بنانا چاہتے تھے لیکن ملک کے عظیم دانشوروں سے یہ بات بعید تھی کہ وہ اپنی خودداری اور عزت نفس کو ترک کر کے جی حضوریوں کے زمرہ میں داخل ہو جائیں۔ میر تقی میر کی تنگ مزاجی غالب کی خودداری۔ اقبال کی قلندری۔ نظیر اکبر آبادی اور میر درد کی استغنا سبھی کو معلوم ہے۔ اردو بورڈ کے دانشوروں اور خصوصاً حضرت جوش کے لئے یہ انوکھا تجربہ تھا جس پر وہ کبھی پورے نہیں اتر سکتے تھے۔

پاکستان کے عوام میں کھرے اور کھوٹے کی تمیز کی کمیابی اور صوبائی تعصبات کی فراوانی نے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح دانشوری اور ادب کے میدان میں بھی بہت سے تیس مار خاں پیدا کر دئے ہیں، جو اپنے کھوٹے سکوں کی دھاک بٹھانے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہتھکنڈا عظیم دانشوروں اور ادیبوں کی عظمت گھٹانے کے لئے ان کی

پگڑیاں اچھالنا بھی ہے۔ کھرے سکوں کے سامنے کھوٹے سکوں کا چلنا مشکل ہوتا ہے اس لئے ان خود ساختہ دانشوروں اور ادیبوں کا کام ان کھرے سکوں کی تضحیک ان کو ہر طرح سے بدنام کر کے ان کو کھوٹا ثابت کرنا ہوتا ہے۔ اردو ترقی بورڈ میں یہی کچھ ہوا۔

دنیا کے سارے ممالک میں دانشوروں۔ سائنس دانوں۔ فنی ماہروں اور ادیبوں کے ریٹائر ہونے کی کوئی عمر نہیں ہوا کرتی ہے۔ جب تک ان کے قویٰ اور ذہن کام کرتے ہیں وہ اپنے فن کی خدمت میں ہمہ وقت منہمک رہتے ہیں عمر کی بالیدگی ان کے فن اور کام میں پختگی پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم دانشوروں اور ادیبوں نے بڑی بڑی عمریں پائی ہیں۔ سعدی۔ برٹنڈرسل برنارڈ شاہ۔ رابندر ناتھ ٹیگور۔ مولوی عبدالحق۔ ٹالسٹائی اور شبرک ولیمز اور اسی قسم کے بہت سے دانشوروں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس زمانے میں انگلستان میں پروفیسروں اور ججوں کی عمریں عموماً ساٹھ سال سے زائد ہوتی ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں دانشوروں، ادیبوں اور سائنس دانوں سے اس وقت تک کام لیا جاتا ہے جب تک ان کے قویٰ اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ان کے ریٹائرمنٹ کی کوئی عمر نہیں ہوا کرتی ہے۔ سرکاری محکموں سے ساٹھ سال کے بعد انھیں جواب نہیں دے دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سرسی وی رمن۔ اور امریکہ میں آئینسٹائن نے اسی سال کی عمر تک سرکاری محکموں کی سربراہی کی ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اور ڈاکٹر ذاکر حسین ستر سال سے زیادہ عمر پانے کے باوجود

بھارت کے صدر رہے۔ نہرو نے ۲، سال تک وزارت عظمیٰ کے فرائض سرانجام دیئے۔ سر ظفر اللہ خاں اور محمد شعیب کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہو گی۔ لیکن عالمی اداروں نے انھیں ان کی عمر کی بنا پر سبکدوش نہیں کر دیا۔

پاکستان میں جہاں باصلاحیت افراد کا قحط الرجال ہے، خوشامدیوں کو کام سے لگانے کے لئے باصلاحیت افراد کو پچپن اور ساٹھ سال کی عمر میں ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان کے عظیم ترین سائنسداں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اسی ساٹھ سالہ قانون کا شکار ہوئے، حالانکہ وہ اب بھی اسی تندہی اور دلچسپی سے سائنسی تجربات کرتے رہتے ہیں

اردو ترقی بورڈ میں باصلاحیت افراد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اسی ساٹھ سالہ قانون کا سہارا لیا گیا اور ریٹائرمنٹ کا کلہاڑا ایسے افراد پر چلایا گیا جن کا بدل پاکستان میں تو کیا سارے برصغیر میں نہیں مل سکتا، اور جن میں ابھی کام کرنے کی صلاحیتیں اور بے انتہا لگن پائی جاتی ہے۔ ان میں حضرت جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر شوکت سبزواری خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں تو غیر ممالک کے دانشوروں، مفکروں سائنسدانوں اور فنی ماہروں کو بھاری بھاری مشاہرہ پر ملازمت کی دعوت دی جاتی ہے اور بیچارے ترقی پذیر پاکستان میں جہاں باصلاحیت افراد کی ویسے ہی قحط سالی ہے جو دو چار باصلاحیت افراد نکلتے ہیں۔ انھیں کوئی جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ اور جنھیں کسی طرح جگہ مل جاتی ہے انھیں مختلف بہانوں اور قانون کے

ذریعہ نکال باہر کیا جاتا ہے۔

اب ذرا ڈاکٹر شوکت سبزواری کی سبکدوشی سے متعلق سکریٹری ترقی اردو بورڈ کراچی کی کارستانی جمیل الدین عالی کی زبانی سنئے۔

"اسی سال یہ بھی ہوا کہ لغت کبیر اردو کے مدیر اعلیٰ ڈاکٹر شوکت حسین سبزواری اپنے عہدے سے بہ بنائے شصت سالگی سبکدوش کر دئے گئے۔ یہ لغت کوئی سولہ سال سے ترقی اردو بورڈ کراچی کے زیر اثر مرکزی حکومت کی رقم سے بنتی رہی ہے۔ مدیر اوّل بابائے اردو تھے۔ وہ بھی ہمارے مخدوم جناب شان الحق حقی کو ناپسند تھے، اور شان صاحب اس بورڈ کے مستقل نامزد معتمد اعزازی چلے آرہے ہیں۔ شکر ہے کہ مولوی صاحب نے بروقت انتقال کیا۔ ہمارے شان صاحب اپنے اخباری بیانات کے مطابق مرحوم کو ایسا اہل بھی نہیں جانتے تھے۔ اگر مولوی صاحب زیادہ چلتے تو کسی نہ کسی سرکاری ضابطے کے تحت سبکدوش کر دئے جاتے۔ جوش صاحب قبلہ بھی اس لغت کے مشیر ادبی قرار پائے تھے، اور جب قرار پائے تھے اس وقت بھی ان کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی، مگر ایک دن یہ ہوا کہ وہ پیرانہ سالی کی بنا پر اس مشیری سے بھی سبکدوش کر دئے گئے۔ ہمارے بیان کے علاوہ ان کی سوانح عمری بھی ملاحظہ ہو، ویسے ترقی اردو بورڈ ایک شاندار کہانی ہے۔

ہمیں سب ہے یاد ذرا ذرا

انھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ڈاکٹر شوکت سبزواری بیک وقت سنسکرت۔ عربی۔ فارسی جانتے ہیں۔ مولوی صاحب مرحوم نے انھیں ڈھاکے سے نوکری چھڑوا کر بلایا تھا۔ وہ ایک محتاط مصنف اور مستند محقق ہیں۔ عیب ان کا یہ ہے کہ وہ یوں تو سب کو بہت کچھ مانتے ہیں مگر کسی غیر عالم کو عالم نہیں گردانتے ہیں۔ سو وہ بھی ریٹائر ہوئے۔ ترقی اردو بورڈ سرکاری محکمہ نہیں اس کے ملازمین پر سرکاری ملازمین والی ذمہ داریاں اور مراعات "نافذ" نہیں۔ مگر یار لوگوں نے ریٹائرمنٹ کے لئے سرکاری ضابطے لاگو کر دا دیئے ہیں۔ جبکہ اسی سال سرکاری طور پر قائم شدہ ثقافتی کونسل کے تنخواہ دار صدر ہمارے مخدوم جناب فیض احمد فیض مقرر ہوئے ہیں۔ جن کی عمر کوئی دو یا تین اوپر ساٹھ ہے۔ جبکہ محکمہ اشاعت حکومت پاکستان کے مشیر بھی جوش صاحب مقرر ہوئے ہیں اور ان کی عمر بھی ساٹھ سے کہیں اوپر کہی جاتی ہے۔ یارا اگر آج مرزا غالب اور سر سید احمد خاں زندہ ہوتے تو لغت کبیر اردو پر کام کرنے کے اہل قرار نہ دیئے جاتے کیونکہ وہ دونوں بھی ساٹھے پاٹھے ہو چکے تھے۔"

دنیا کے عظیم دانشوروں۔ ادیبوں۔ فلسفیوں۔ سائنس دانوں، مفکروں شاعروں اور فنکاروں کو عام اخلاقی معیار سے جانچنا درست نہیں۔ بہت کم ایسے

دانشور گزرے ہیں جو بلند اخلاقی معیار پر پورا اترتے ہوں گے۔ اس لئے دانشوروں کو جانچتے وقت ان کے کردار کے بجائے ان کے فن پر نگاہ رکھنی چاہیے، ورنہ غالب۔ بوعلی سینا۔ عمر خیام۔ حافظ۔ آسکر وائلڈ۔ شیلے۔ شیکسپیئر اور کیٹس کو تو چھوڑیئے۔ اقبال اور مولانا شبلی نعمانی بھی اسی قسم کے اعتراضات سے نہیں بچ سکتے ہیں۔ اسی لئے جوش۔ فیض۔ نیاز۔ منٹو کو ان کی بعض مبینہ اخلاقی کمزوریوں سے جانچنے کے بجائے ان کی ادبی خدمات سے جانچنا چاہیے اور اس کی بنا پر ان کی عظمت کا تعین کرنا چاہیے۔

ساحر صدیقی

غالباً دسمبر ۱۹۵۵ء کی کوئی رات تھی۔ کراچی جمخانہ گراؤنڈ پر ایک وسیع شامیانہ نصب تھا جو رنگ برنگ کے برقی قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا، اور تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ یہاں ایک بین المملکتی ہند و پاک اردو مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں پاکستانی شعراء کے علاوہ شہرۂ آفاق ہندوستانی شعراء جگر، جوش اور روش کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مشاعرہ کی صدارت برصغیر کے مشہور ادیب اور مزاحیہ نگار پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس کر رہے تھے۔

مشاعرہ شروع ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی۔ سامعین حسبِ دستور ہر نئے اور غیر معروف شاعر کا مذاق اڑانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ کئی مقامی شعراء کے بعد ایک غیر معروف اور شکل و صورت سے بدھو قسم کا شاعر اسٹیج پر نمودار ہوا۔

آہستہ آہستہ وہ مائیکروفون کی جانب بڑھا۔

حاضرین نے طرح طرح کی آوازوں سے اس کا استقبال کیا۔ اس پر طرح طرح کے آوازے کسے گئے۔ سیٹیاں بجائی گئیں۔ میاؤں میاؤں کی آوازیں نکالی گئیں ان ساری ہمت شکن حرکات سے بے نیاز ہو کر اس نے آہستہ آہستہ اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ اس کی آواز اور کلام میں خدا جانے کیا سحر تھا کہ پنڈال میں تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی جو بعد ازاں واہ واہ سبحان اللہ کے نعروں میں تبدیل ہو گئی۔

شاعر کی آواز آہستہ آہستہ بلند ہوتی گئی۔ اس کے مترنم اور دلسوز کلام کا سحر سامعین کو مسحور کر چکا تھا اور وہ والہانہ انداز میں واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے پنڈال اڑائے دے رہے تھے۔ پاکستان کے افق شاعری پر طلوع ہونے والا یہ شاعر ساحر صدیقی تھا جو گجرانوالہ سے پہلی بار کراچی کے ایک مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے آیا تھا۔ اس نے جب اپنی مرصع غزل ختم کی تو سارا پنڈال ایک اور ایک اور کے شور سے گونج اٹھا۔ پطرس نے بھی اس سے مزید کلام سنانے کی فرمائش کی۔ انھوں نے بھی شاید ساحر کو پہلی بار سنا تھا، اور وہ بھی اس کے کلام سے پوری طرح محظوظ ہوئے تھے۔

ساحر نے دو ایک اور غزلیں اپنے مخصوص مترنم آواز میں سنائیں۔ چھوٹی بحر میں ان غزلوں نے میر اور فانی کے کلام کی یاد تازہ کر دی۔ اسی شب کو اگرچہ موجودہ دور کے چند عظیم ترین اردو شعراء مشاعرے میں موجود تھے۔ لیکن ساحر صدیقی کا کلام سب پر حاوی رہا اور اس نے سامعین سے سب سے

زیادہ خراجِ تحسین وصول کی۔

دوسری بار ۱۹۵۸ء میں مجھے اس غیر فانی شاعر کو سننے کا اتفاق ہوا۔ اس جگہ پریڈ گراس کے زیر اہتمام مشاعرہ منعقد کیا گیا تھا۔ چند سامعین کے سوا جو وہاں موجود تھے باقی لوگوں نے ساحر کو بھلا دیا تھا۔ جب وہ اسٹیج پر نمودار ہوا تو حسب دستور حاضرین نے ہر قسم کی فقرہ بازی اور طرح طرح کی آوازوں سے اس کا استقبال کیا۔ وائس آف امریکہ اور ریڈیو پاکستان والوں نے بھی اپنے ٹیپ ریکارڈر بند کر دئے۔ ایک غیر معروف شاعر کا کلام ریکارڈ کر کے بھلا وہ کیا کرتے۔ لیکن جلد ہی انھیں اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا۔ ساحر کے پہلے ہی شعر پر سارا پنڈال واہ واہ سبحان اللہ کے شور سے گونج اٹھا۔ جب ساحر نے اپنے اچھوتے مترنم انداز میں یہ شعر پڑھا:

تم کو کس نام سے پکاریں ہم
آج تک یہ بھی فیصلہ نہ ہوا

تو کئی منٹ تک پنڈال واہ واہ مکرر ارشاد کے نعروں سے گونجتا رہا۔

پوری غزل بڑی مرصع تھی۔ سادگی اور پرکاری۔ اختصار اور تاثر میں ڈوبا ہوا ہر شعر سامعین کو مومن اور جگر کی یاد دلا رہا تھا۔

معشوق کی موجودگی میں عاشق کی خود فراموشی ایک فرسودہ خیال ہے جسے سبھی اردو شعرا نے اپنی استعداد کے مطابق قلم بند کیا ہے۔ میر کا شعر ہے:

ہم کہتے تھے یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آیا　　سب کہنے کی باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

غالب نے اس قسم کے خیال کو اس طرح ادا کیا ہے:

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

مومن نے اسی خیال کو یوں باندھا ہے:

ہوش جاتا رہا نہیں لیکن — جب وہ آتا ہے تب نہیں آتا

ساحر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں:

جانے کیا ہو گئی تھی گویائی
مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

معشوق کا دیدار اردو شعرا کا عام موضوع رہا ہے اور سبھی شعرا نے اسے اپنے مخصوص انداز میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساحر نے کس خوبی اور اختصار کے ساتھ اس کو ادا کیا ہے۔

عمر بھر کی تلاش کا حاصل — ایک جلوہ جو رونما نہ ہوا

واعظ اور ناصح کی طرح رہبرانِ قوم بھی شعراء کی طعن اور تشنیع کا شکار ہوئے ہیں۔ ساحر نے اس خیال کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

رہنماؤں کے دور میں ساحر — کوئی منزل سے آشنا نہ ہوا

ساحر کی نجی زندگی کے متعلق زیادہ معلوم نہیں ہے۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ غالباً گجرانوالہ میں درزی کی ایک دکان تھی۔ یہی ان کی معاش کا ذریعہ تھی۔ لیکن گدڑی کے اس لعل کے جوہر اس وقت کھلے جب اس نے مشاعرے میں پہلی بار شرکت کی پھر تو باذوق حضرات نے

اسے ہاتھوں ہاتھ لینا شروع کیا، اور دیکھتے دیکھتے اس کی شہرت پاکستان کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ پاکستان کے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو مشاعروں میں اتنی داد ملی ہو جتنی ساحر کو ملی۔ ان کا شمار اردو مشاعروں کے چند مقبول ترین شعرا جگر، فانی۔ شکیل اور مجروح سلطان پوری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

ساحر انتہائی بے نفس اور خوددار انسان تھے۔ عام شعرا کے برخلاف وہ تعریف اور تحسین سے دور بھاگتے تھے۔ شعراء کی عموماً خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ان سے کلام سنانے کی فرمائش کرے۔ بعض وقت تو وہ خود ہی گنگنانا شروع کر دیتے ہیں، اور کوئی اگر سننے کو تیار ہو جاتا ہے تو اسے سنا سنا کر اتنا بور کر دیتے ہیں کہ آئندہ کے لئے وہ توبہ کر لیتا ہے۔

ساحر ایسے نہ تھے۔ وہ بہت خاکسار قسم کے آدمی تھے۔ عام شعرا کے نخرے بھی انھیں نہیں آتے تھے۔ کوئی فرمائش کرتا تو سنا دیتے ورنہ زبردستی اپنا کلام سنا کر داد وصول کرنے کے وہ قائل نہ تھے۔ جب ان کی شہرت عام ہوئی تو باذوق سامعین نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اشعار سنانے کی فرمائشوں کی بھرمار کر دی۔ لیکن ساحر ان فرمائشوں سے کبھی چین بجبیں نہیں ہوتے تھے اور واہ واہ سے بے نیاز ہو کر انھیں پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

ساحر کے کلام کی خصوصیات سادگی اور پرکاری۔ خلوص اور تاثیر ہے۔ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات سامعین کے قلوب میں جاگزیں ہو جاتے تھے۔ وہ اردو کے روایتی غزل گو تھے۔ جو اردو غزل کے سارے لوازمات پوری کرتے تھے، لیکن ان کا کلام تصنع اور تکلف سے

پاک ہے۔ اس معاملہ میں وہ لکھنؤ شعرا کے برخلاف دہلی کے شعرا میر اور مومن اور جدید غزل گو شعرا، جگر، فانی اور حسرت سے قریب تر تھے۔ لکھنؤ کے شعرا نے خلوص اور تاثر کو نازک خیالی، صنائع اور بدائع پر بھینٹ چڑھا دیا تھا جنھوں نے ان کے اشعار کو معمہ اور گورکھ دھندا بنا دیا تھا۔ ناسخ۔ وزیر اور امانت اردو میں اسی قسم کی شاعری کے سب سے بڑے علمبردار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ساحر نے اپنے اشعار میں خلوص اور تاثر۔ سادگی، اور جامعیت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ ان کے اشعار عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پر تاثیر ہیں۔ جگر نے اردو شاعری کے روایتی عاشق مجبور کو ذلت اور بدنامی کے قعر مزلت سے نکال کر اسے بلند مرتبہ عطا کیا۔ عاشق کو خودداری اور عزت نفس کی صفات سے موصوف کرایا۔ انھوں نے معشوق کو بھی عاشق کا طلب گار قرار دیا۔

جگر وہ بھی تو سرتا پا محبت ہی محبت ہے
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

ساحر نے اس معاملہ میں اردو کی روایتی عشقیہ شاعری کی پیروی کی ہے۔ اردو کی عشقیہ شاعری درحقیقت فارسی کی عشقیہ شاعری کا چربہ ہے۔ اس میں گل و بلبل۔ شیریں فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں کے متعلق خیالات اور جذبات فارسی شاعری سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اسی لئے اردو غزل میں وہ خلوص اور تاثر نہیں پایا جاتا ہے جو اس قسم کی شاعری میں عموماً پایا جاتا ہے۔ قدما اردو شعرا میں میر اور مومن۔ غالب اور ظفر نے اس ڈگر

سے ہٹ کر اردو غزل کو اپنے جذبات کا مرقع بنایا۔ جدید اردو غزل کو حالی اور اکبر حسرت اور اصغر۔ جگر اور فانی نے البتہ اردو غزل کو خلوص اور تاثر عطا کیا اور اس طرح اس میں سادگی اور پرکاری پیدا کی۔ ساحر بھی انھیں شعرا کے زمرے میں شامل ہیں۔ جرأت اور داغ کی معاملہ بندی اور جنسی شاعری سے بھی ساحر کا کلام پاک ہے۔ داغ اور جرأت کے برخلاف ساحر کی عشقیہ شاعری میں سنجیدگی اور بلندی پائی جاتی ہے۔

ساحر صدیقی پاکستان کے مقبول ترین شاعر تھے۔ اس صفت میں صرف جگر مرادآبادی اور شکیل بدایونی ان کے مدمقابل تھے۔

پاکستانی مشاعروں میں ان کی شرکت سے جان پڑ جاتی تھی۔ ان مشاعروں کے مقبول ترین شعراء میں ساحر صدیقی اور زہرہ نگاہ سرفہرست ہیں۔ ان کے کلام کا تاثر اور ان کے پڑھنے کا دل کش انداز سامعین کو مسحور کر دیتا اور انھیں والہانہ انداز میں داد دینے پر مجبور کرتا۔ درحقیقت ان دونوں نے سامعین سے جتنی داد وصول کی ہے وہ شاید ہی کسی پاکستانی شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔

ساحر کی غزلوں میں محبت کا سوز و گداز اور خلوص زہرہ نگاہ کے اشعار کا سیاسی رنگ اور رمزیت اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہیں۔ جو سامعین کے قلوب میں اتر جاتی ہیں۔

لیکن قدرت نے ساحر کو بہت جلد اس دنیا سے اٹھالیا۔ اگست ۱۹۵۹ء میں وہ ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے مری گئے جہاں وہ

ہیضہ کا شکار ہوئے۔ اس طرح پاکستان ایک بہت ہونہار اور مقبول شاعر سے محروم ہوگیا، جس سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔

بقول کسے

"خوش درخشیدہ ولے شعلہ مستعجل بود"

زہرہ نگاہ

محترمہ زہرہ نگاہ سے مجھے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، لیکن ان کا کلام ان کی زبان سے سننے کا بارہا موقع ملا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل دہلی اور لکھنؤ۔ رامپور، اور حیدرآباد دکن۔ بھوپال اور عظیم آباد۔ علی گڑھ اور بدایوں اسلامی ہند کی تہذیب و تمدن کے گہوارے تھے ان شہروں نے اسلامی علوم و فنون کو فروغ دینے میں بہت نمایاں حصّہ لیا ہے۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر قیام پاکستان تک ان شہروں اور ان کے ملحقہ علاقوں نے اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بڑے بڑے صاحب دل و دماغ۔ بڑے بڑے صاحبِ سیف و قلم اور بڑے بڑے صاحبِ علم و فن پیدا کیے۔ شعرا اور ادبا، فنکار اور معمار۔ سیاست داں اور مفکرین۔ انقلابی اور مصلحین، کونسا ایسا شعبۂ زندگی ہے جس میں ان علاقوں کے مسلمانوں نے برصغیر

کی عظیم شخصیتیں پیدا نہیں کیں۔

درحقیقت گزشتہ دو صدیوں میں اسلامی ہند کے علم و ادب، سیاست اور اصلاح کی ساری تحریکیں انھیں علاقوں سے اٹھیں اور یہیں پروان چڑھیں۔ برصغیر میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ اردو زبان کا پودا سرسبز ہونا شروع ہوا۔ ہندوستان میں جب اسلامی سلطنت کا چراغ ٹمٹانے لگا تو اردو زبان کا چراغ روشن ہوا۔ اس چراغ کو فروزاں کرنے میں سودا، اور میر۔ غالب اور مومن۔ ظفر اور نظیر۔ میر امن اور رجب علی سرور نے نمایاں حصہ لیا۔ اردو زبان کا ادب اور خصوصاً شاعری چونکہ اسلامی ہند کے انحطاط کی پیداوار ہے اس لئے اس میں قنوطیت کا رنگ غالب ہے۔ دہلی کے بعد لکھنؤ اور لکھنؤ کے بعد رامپور۔ حیدر آباد لاہور اور بھوپال نے باغ اردو کی آبیاری کی۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں اردو مشاعرے بہت مقبول ہوئے۔ جہاں شعرا کا مقابلہ ہوتا تھا اور اس طرح ان مشاعروں نے اردو شاعری کے فروغ میں بڑا کام کیا ہے۔ اس دور میں بہادر شاہ ظفر جو خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ اردو شاعری کے سب سے بڑے سرپرست تھے۔ دہلی کا آخری مشاعرہ اب بھی کبھی کبھی اسٹیج کیا جاتا ہے جس میں غالب۔ مومن۔ ذوق۔ شیفتہ ایسے نامور شعرا نے شرکت کی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد اس مملکت خداداد میں ہندوستانی علاقوں سے ہجرت کرنے والے مسلمان جہاں اپنے ساتھ اسلامی تہذیب و تمدن کی بے شمار روایات اور رسومات علوم و فنون لائے وہاں مشاعرہ بھی ان کے ساتھ یہاں آیا۔

لاہور اور کراچی حیدرآباد اور سکھر ان مہاجر مسلمانوں کے سب سے بڑے مرکز بنے۔ ان شہروں کی زندگی کو مہاجروں نے بہت متاثر کیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے قیام پاکستان کے ابتدائی زمانہ میں کراچی اور حیدرآباد۔ لاہور اور پنڈی میں مشاعروں کا بڑا زور تھا۔ اس وقت پاکستان میں بھی مشاعرے کے بڑے بڑے شعرا۔ قمر جلالوی۔ ظریف جبلپوری۔ مجید لاہوری۔ ہادی مچھلی شہری۔ ادیب سہارن پوری۔ نظر حیدرآبادی۔ ساحر صدیقی وغیرہ زندہ تھے۔ اور ہندوستان سے بھی اس دور کے عظیم اردو شعرا جگر مرادآبادی۔ جوش ملیح آبادی فراق گورکھپوری۔ روش صدیقی۔ جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری شکیل بدایونی وغیرہ برابر کراچی اور لاہور کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ابوالاثر حفیظ جالندھری۔ زہرہ نگاہ۔ احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض بھی مشاعروں میں حصہ لیتے تھے۔ اس زمانے میں اردو مشاعرے ہماری ثقافتی زندگی کی سب سے زیادہ مقبول تقریب ہوا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں اخبار ڈان ہر سال ایک مشاعرہ منعقد کیا کرتا تھا۔ جسے مجید لاہوری مرحوم نے "عظیم الڈان مشاعرے" کا نام دے دیا تھا۔

عظیم الڈان مشاعروں میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ یا پاس ہوا کرتا تھا، اور ان مشاعروں میں پاکستان اور ہندوستان کے نامور شعرا شرکت کرتے تھے۔ ٹکٹ سے ہونے والی آمدنی سے شعرائے کرام کو سفر خرچ اور جیب خرچ ادا کیا جاتا تھا۔

اسی ڈان کے ایک مشاعرے میں غالباً ۱۹۵۱ء میں مجھے زہرہ نگاہ کے

کلام کو پہلی بار سننے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت غالباً وہ کراچی کے گورنمنٹ کالج برائے خواتین کی طالبہ تھیں۔ بہت دُبلی۔ سوکھی سی۔ لیکن قدرت نے انھیں نور کا گلا عطا کیا ہے۔ جب وہ اپنا کلام سناتیں تو محفل پر سماں بندھ جاتا، واہ واہ سبحان اللہ سے پنڈال اڑا جاتا۔ شاید ہی کوئی ایسا موقع آیا ہو گا کہ ایک غزل سنا کر زہرہ نگاہ کی گلو خلاصی ہو گئی ہو۔ انھیں مکرر اور سہ کرر دو تین غزلیں سنانی پڑتی تھیں، اور پھر بھی سامعین کا اصرار "ایک اور ایک، اور" جاری رہتا تھا۔

زہرہ نگاہ کی آواز میں بڑا سوز و گداز پایا جاتا ہے، اور ان کے کلام میں خلوص۔ سیاسی رنگ آمیزی اور رمزیت نے اس میں بڑا تاثر پیدا کر دیا ہے اس طرح قیام پاکستان کے بعد زہرہ نگاہ اور ساحر صدیقی پاکستانی مشاعروں کے مقبول ترین شعرا ہوئے ہیں۔ زہرہ نگاہ کے اچھوتے کلام کے تاثر، اور بلند پردازی کی وجہ سے لوگوں نے یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ اپنے نانا کا کلام مشاعروں میں سنایا کرتی ہیں۔ جس طرح بہادر شاہ ظفر کے کلام کو استاد ذوق اور ساغر نظامی کے کلام کو سیماب اکبر آبادی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ بات قابل اعتنا نہیں ہے۔ کیونکہ ظفر اور ذوق کی طرح ساغر اور سیماب کے کلام میں بڑا اور بیّن فرق ہے۔ ظفر اور ساغر کا خلوص اور تاثر ذوق اور سیماب کے یہاں خال خال بھی نہیں نظر آتا ہے۔

زہرہ نگاہ بدایوں کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس نے فانی اور شکیل بدایونی ایسے نامور شعرا اور عبدالقادر بدایونی ایسے عظیم مورخ پیدا

گئے۔ زہرہ نگاہ کے باپ دادا تلاش معاش میں حیدر آباد دکن مراجعت کر گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد زہرہ نگاہ اپنے خاندان کے ساتھ حیدر آباد دکن سے ہجرت کر کے کراچی آ گئیں۔ اسی شہر میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ابتدائی زمانہ میں پاکستان میں بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوئے۔ ان میں عظیم الشان مشاعرے عرصہ تک پابندی کے ساتھ ہر سال ہوتے رہے۔ ان کے علاوہ ریڈ کراس، یوم جگمہ اور حیدر آباد سندھ میں نیاز صاحب مرحوم سی ایس پی کمشنر کی سرپرستی میں سالانہ مشاعرے پاکستان کے یادگار مشاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں مشاعروں کو غیر مقبول بنانے میں ریڈیو اور ٹی وی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ریڈیو پاکستان نے جس طرح اقبال کے کلام، اردو غزل اور نیم کلاسیکی موسیقی کا بیڑا غرق کیا ہے، اسی طرح اس نے اردو مشاعرے کو بھی جہنم رسید کیا ہے۔ ریڈیو پاکستان کے مشاعرے درحقیقت مشاعروں کا مذاق ہوا کرتے ہیں۔ میں تو اپنا ریڈیو سیٹ ایسے اوقات میں اکثر بند کر دیتا ہوں۔ ان میں ریڈیو پاکستان سے منسلک یا بیرونی پٹھو۔ بے سرے اور غیر مقبول شعرا جن کے کلام میں کوئی شعریت نہیں ہوا کرتی ہے اپنے کلام بے ہنگام سے سامعین کو بور کیا کرتے ہیں بھارتی ریڈیو کے مشاعرے ریڈیو پاکستان کے مشاعروں کا بہت نمایاں تضاد پیش کرتے ہیں۔ بھارتی ریڈیو سے ری پبلک ڈے پر نشر ہونے والے مشاعرے سننے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ملک کے بڑے بڑے شعرا، اور ایک زمانے میں پاکستان کے نامور شعرا بھی شرکت کرتے تھے۔ ریڈیو پاکستان نے ایسا کوئی مشاعرہ منعقد کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس طرح اردو مشاعرے

کا جھنڈا اب بھی پاکستان کے بجائے بھارت میں سر بلند ہے۔ بھارت کی قومی زبان ہندی اور پاکستان کی اردو ہے لیکن اردو کی خدمت اب بھی بھارت میں زیادہ ہوتی ہے اور اردو زبان میں علوم و فنون کی بلند پایہ کتابیں اب بھی بھارت میں لکھی جا رہی ہیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد محترمہ زہرہ نگاہ کی شادی مسٹر ماجد علی سی، ایس، پی سے ہوگئی، جو مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں اور آج کل عرب ممالک میں ڈیپوٹیشن پر ہیں۔ زہرہ نگاہ اب بھی مشاعروں میں حصہ لیتی ہیں لیکن گاہے گاہے۔ شادی کے بعد پتلی دبلی زہرہ نگاہ موٹی تازی زہرہ نگاہ میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

جدید اردو غزل میں زہرہ نگاہ کا اپنا مقام ہے۔ ان کی شاعری میں ایک انفرادیت ہے جس کی خصوصیات بے پناہ خلوص اور تازہ سادگی اور پرکاری اور سب سے بڑھ کر اس کا سیاسی رنگ ہے جو اب پختہ تر ہو گیا۔ گل و بلبل، وطن اور چمن۔ رہبر اور رہزن۔ قفس اور آشیانے کے پردے میں وہ بڑے بڑے سیاسی حقائق بیان کر جاتی ہیں۔ اور ہماری گندی سیاست پر بھر پور طنز کرتی ہیں۔ جس کا اثر عرصہ تک زائل نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح وہ پاکستان کی مقبول ترین شاعرہ تسلیم کی جاتی ہیں۔

غالباً ۱۹۵۲ء میں ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی کے مشاعرے میں محترمہ زہرہ نگاہ نے ایک بڑی مرصع غزل سنائی، جس نے مشاعرے کو لوٹ لیا، اس کا ایک شعر ہے:

جہاں پہ مہر خموشی لگی ہے ہونٹوں پر
جو ہو سکے تو اسی انجمن کی بات کرو

زہرہ نگاہ کو مشاعروں میں سننے کا درجنوں بار مجھے اتفاق ہوا ہے، اور ہر بار میں نے نقش ثانی کو نقش اول کے مطابق بلکہ بہتر پایا، اور ہر بار مشاعرے کا پنڈال سامعین کے واہ واہ اور سبحان اللہ سے گونجتا رہا۔

عشق و محبت اردو غزل کا بہت مقبول اور فرسودہ موضوع ہے لیکن زہرہ نگاہ نے اسے ایک اور انداز سے پیش کیا ہے۔

کہاں کا عشق و محبت کہاں کا ہجر و وصال
یہاں تو لوگ ترستے ہیں زندگی کے لئے

۱۹۵۴ء میں اپوا کے مشاعرے میں زہرہ نگاہ نے اپنی ایک مقبول غزل میں پاکستان کی زبوں حالی کی ایک اور دلکش تصویر کھینچی ہے:

کلی اداس چمن سوگوار گل خاموش
یہ انتظار بہاراں ہے دیکھئے کیا ہو

پاکستان میں جس طرح ترقی معکوس کو حقیقی ترقی کے مترادف سمجھا گیا ہے اور جس طرح سے غلط اندازوں کو عوام کے ذہنوں پر مسلط کیا گیا ہے اور جس طرح تقریر اور تحریر کی آزادی کو سلب کیا گیا، اس کو زہرہ نگاہ نے بہت دلکش پیرائے میں بیان کیا ہے۔

یہ حکم ہے کہ اندھیرے کو روشنی سمجھو
ملے نشیب تو کوہ و دمن کی بات کرو

فریب خوردہ رنگیں ہیں ہم کو کیا معلوم
بطرز راہبری راہ زن کی بات کرو

پاکستان میں ظلم و ستم اور بے انصافی کا جو دور دورہ رہا ہے اور اس کو جس طرح قومی ترقی، اور وطن پرستی کا نام دیا گیا ہے اس پر زہرہ نگاہ نے سخت طنز کیا ہے:

قدم قدم پہ فروزاں ہے آنسوؤں کے چراغ
انھیں بجھاؤ تو صبح وطن کی بات کرو

ہمارے ملک میں سیاسی اور معاشی استحصال کے خلاف زہرہ نگاہ نے ان الفاظ میں آواز بلند کی ہے:

خزاں نے آکے کہا میرے غم سے کیا حاصل
جہاں بہار لٹی اس چمن کی بات کرو

پاکستان ایسے غریب ملک میں ہمارے برسر اقتدار طبقہ کی عیش کوشی اور لوٹ کھسوٹ اور غریبوں کے استحصال پر زہرہ نگاہ نے بڑی خوبصورتی سے چوٹ کی ہے۔

ہر آستاں پہ لکھا ہے اب نام شہر یار
وابستگانِ دل کے لئے کوئی جا نہیں
صد حیف اس کے ہاتھ ہی ہر زخم کا رفو
دامن میں جس کے ایک بھی تار وفا نہیں

زہرہ نگاہ کی شاعری زندہ جاوید اور بہت دیر پا ہے کیونکہ اس میں ہمارے معاشرے اور ہمارے زمانے پر بھرپور اور لطیف طنز پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا بے پایاں خلوص، اس کی سادگی اور پرکاری

مدت دراز تک لوگوں کے قلوب کو گرماتی اور ان سے خراج تحسین وصول کرتی رہے گی۔

ہماری زوال پذیر سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اتنا پر تاثیر اور دل کش طنز پاکستان کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتا ہے۔

علّامہ نیاز فتحپوری

اردو کے ادیبوں میں نیاز فتحپوری ایسی بارعب با اصول اور پروقار شخصیت میں نے بہت کم دیکھی ہے۔ سائل دہلوی بلاشبہ بڑے وجیہہ شکل صورت کے مالک تھے اور جب وہ اسٹیج پر نمودار ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہادر شاہ ظفر دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ لیکن نیاز صاحب کی شخصیت میں وجاہت کے ساتھ ساتھ وقار بھی تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ ابتدا میں انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز تھانے داری سے کیا تھا۔ ان کے والد بھی محکمہ پولیس سے وابستہ رہ چکے تھے۔ لیکن نیاز صاحب کو پولیس کی ملازمت راس نہیں آئی اور جلد ہی انھوں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر کے ادب کے میدان کو اپنی جولانگاہ بنایا اور زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ اس میدان میں وہ سب سے آگے نکل گئے، یہاں تک کہ بیسویں صدی میں اردو کے وہ

سب سے بڑے ادیب بلکہ ادیب گر ثابت ہوئے۔

نیاز فتحپوری ایسی جامع الکمالات اور ہمہ گیر شخصیت اردو ادب نے بہت کم پیدا کی ہے۔ ان کی پہلودار شخصیت اگرچہ متنازعہ فیہ ہی لیکن جب کبھی جہاں کہیں انھوں نے مبارز طلبی کی ان کا مدمقابل ان سے شاذونادر ہی کامیاب ہوسکا۔ ان کی ضربوں کی سختی اور ان کے دلائل کی معقولیت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے۔ اردو کے صاحبِ طرز ادیب صحافی۔ شاعر۔ نقاد۔ افسانہ نگار۔ ناول نگار۔ مورخ۔ ماہر لسانیات۔ ماہر جنسیات کونسی ایسی صفت تھی جو اردو کے اس نابغہ ثانی میں پائی نہیں جاتی تھی۔

میں نے پہلی بار انھیں قیام پاکستان سے قبل فتحپور کے ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس مشاعرہ میں حضرت جگر مرادآبادی۔ خمار بارہ بنکوی۔ بسمل الہ آبادی۔ ساغر نظامی اور روش صدیقی شریک تھے۔ نیاز صاحب نے جو پرمغز افتتاحی مقالہ پڑھا وہ جدید اردو شاعری کے سارے پہلوؤں پر محققانہ احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اور اس موضوع پر ایک شاہکار تھا۔

دوبارہ میں نے انھیں کراچی کے ایک مشاعرہ میں دیکھا جس کا انتظام بلیر کی کسی ادبی انجمن نے کیا تھا۔ اور مشاعرہ کے جی اے گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ اس میں حضرت جوش اور فراق شرکت کرنے ہندوستان سے تشریف لائے تھے۔ نیاز صاحب بھی اسی مقصد کے لئے لکھنؤ سے آئے تھے۔

نیاز صاحب کا طویل محققانہ صدارتی مقالہ کراچی کے سامعین پر بار گزرا جس کی وجہ سے انھیں اس کو مختصر کرنا پڑا۔ کراچی ایسے کاروباری شہر کے

کم مایہ سامعین جو مشاعروں میں ہلکی پھلکی مترنم غزلیں سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں بھلا نیاز صاحب کے پرمغز اور ثقیل مقالے کو کیسے ہضم کر سکتے تھے۔ مقالے نے طوالت اختیار کی تو پنڈال میں اِدھر اُدھر سے آوازیں آنی شروع ہو گئیں نیاز صاحب نے ان بدذوق اور بے مغز سامعین سے چھٹکارا پانے کے لئے اپنا مقالہ جلد ہی ختم کر دیا۔

ایوب خاں کے دور اقتدار میں نیاز صاحب نے ہندوستان سے ہجرت کر کے ناظم آباد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ لیکن اس ملک خداداد میں بھی جہاں صاحبانِ علم اور فن کی ایسی ناقدری ہوتی چلی آئی ہے جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی ہے۔ نیاز صاحب کے ساتھ بھی مذاق کیا گیا۔ نیاز ایسے عظیم تخلیقی ادیب کو کراچی عجائب گھر کی کتابوں کی فہرست تیار کرنے پر مامور کیا گیا۔

پاکستان کے ادب نواز بزرگ ممتاز حسن صاحب نے ایک ہزار روپے ماہوار پر نیاز صاحب کو اس کام پر مقرر کیا۔ نیاز صاحب نے اپنی فطری دیانت داری کی بنا پر اس کام کو بحسن خوبی انتہائی پابندی وقت کے ساتھ سرانجام دیا۔ لیکن پاکستان میں آنے والے دیگر عظیم ادیبوں۔ دانشوروں اور فنکاروں کی طرح نیاز صاحب بھی زیادہ عرصہ یہاں زندہ نہیں رہے اور سرطان ایسے موذی مرض کا ۲۴ مئی ۱۹۶۶ء کو شکار ہو گئے۔ ان کی عمر اس وقت ۸۲ سال تھی، قویٰ اچھے تھے۔ انھوں نے اپنے بلند پایہ رسالہ نگار کو چالیس سال سے زائد عرصے سے اپنے اعلیٰ معیار کو قائم رکھے

ہوئے تھا۔ پاکستان میں نئی زندگی بخشنی چاہی لیکن ان کے مرنے کے بعد یہ تاریخی جریدہ پاکستان کے ناقدروں کے ہاتھوں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اور آخرکار بند ہو گیا۔

انجمن ادیبان پاکستان جس کا سکریٹری جنرل ہونے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ نیاز صاحب کے مفید مشوروں سے بہت مستفید ہوئی۔ میری درخواست پر انھوں نے اس انجمن کی سرپرستی قبول کر کے ہماری عزت افزائی فرمائی۔ انجمن کے اجلاسوں میں شرکت کی غرض سے حضرت نیاز اکثر میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے۔ اس برصغیر کے سارے بڑے بڑے ادیب، شاعر، دانشور، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، نیاز صاحب سے انتہائی نیازمندی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے تبحر علمی اور ان کی تنقید اور تبصرے کے سبھی قائل تھے، بلکہ بڑے بڑے ادیب اور شاعر تو ان سے خائف رہتے تھے کہ نیاز صاحب کی تنقیدی نگاہ کہیں ان کے کلام پر نہ پڑ جائے تو اس کی دھجیاں بکھر جائیں۔ نیاز صاحب نے جب غالب اور اقبال کو نہیں بخشا اور ان کی شاعرانہ لغزشوں سے نگار کے صفحات مہینوں سیاہ ہوتے رہے تو آج کل کے نیستا۔ کم مایہ ادیب اور شاعر ان کے تنقیدی نشتر دل کے سامنے بھلا کب ٹھہر سکتے تھے۔ اور ان کی تاب کیسے لا سکتے تھے۔

پاکستان میں نیاز صاحب بہت بدل گئے تھے۔ ان کی وہ شعلہ افشانی اور آتش نگاری اب سرد پڑ چکی تھی۔ غالباً انھوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ پاکستان میں انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں علم و فن کی قدر ہے کہیں

زیادہ دربارداری اور چاپلوسی کا لحاظ کیا جاتا ہے، اور یہی صفات یہاں کام آتی ہیں۔ پاکستان میں وہ اس حد تک تو نہیں گر سکے کہ یہاں کے چاپلوس، اور دربار دار ، ادیبوں کے معیار تک پہنچ جاتے۔ تاہم انھوں نے اپنے تنقیدی تیر و نشتر اپنے سینے میں دفن کر لئے اور خلاف عادت سکوت اور یہاں کے گھٹیا ادبی ماحول سے قدرے بے توجہی اور بے رخی اختیار کر لی۔ مجھے یاد ہے نیاز صاحب کو پاکستان آئے ہوئے کئی مہینے ہو چکے تھے۔ اسی زمانے میں پاکستان کے ایک شاعر کی کراچی میں بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ کہیں کسی محفل ادب کی صدارت کے فرائض سر انجام دے رہے ہیں تو کہیں مہمانِ خصوصی بنے بیٹھے سامعین سے واہ واہ، سبحان اللہ کے ڈونگرے وصول کر رہے ہیں۔ کوئی دن اور کوئی شام خالی نہ جاتی تھی کہ ان صاحب کی آؤ بھگت نہ ہوتی ہو۔ اخبار کے صفحات ان کی تصاویر اور ارشادات عالیہ سے بھرے ہوتے تھے اور یہ سلسلہ مہینوں سے جاری تھا۔ ایک دن میں نے نیاز صاحب سے تذکرۃً کہا! "نیاز صاحب فلاں صاحب کی کراچی میں بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے، ہاتھوں ہاتھ لئے جا رہے ہیں۔ کوئی شام ان کی خالی نہیں جاتی، حالانکہ وہ پاکستان کے باشندے ہیں۔ اور آپ اس صدی میں اردو کے سب سے بڑے ادیب اور انشاء پرداز ہیں، اور ہندوستان سے تشریف لائے ہیں، آپ کو کوئی نہیں پوچھتا۔" اس پر نیاز صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے

"خواجہ صاحب آپ پاکستان میں ۱۹۴۷ء سے ہیں، آپ

نہیں جانتے پاکستان میں ہر بات اُلٹی ہوتی ہے۔"

نیاز صاحب کا یہ حقیقت افروز تبصرہ پاکستان کی صورت حال کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ یہاں کھرے کھوٹے کی مطلق تمیز نہیں کی جاتی ہے ٹکے سیر بھاجی اور ٹکے سیر کھاجا کی مثل یہاں بالکل صادق آتی ہے۔

نیاز صاحب پاکستان رائٹرز گلڈ کے اجلاسوں میں اکثر شرکت کرتے تھے، میں نے دو ایک بار انھیں وہاں دیکھا پیچھے خاموش بیٹھے ہیں، کوئی نہیں پوچھتا کہ بھیا کون ہو۔ اس کے برخلاف سرکاری ادیبوں اور درباری مقبول شعراء کو لوگ وہاں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، اور چھوٹے ادیب تو ان ادیبوں کے آگے پیچھے گھومتے رہتے تھے، اور اس بات کے منتظر رہتے کہ رُخ ذرا ادھر ہو تو سلام ہی کریں یا خیر و عافیت ہی دریافت کریں۔

نیاز صاحب کی ادبی عظمت کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے، اردو ادب، تاریخ، تنقید کا وہ کونسا شعبہ ہے جس میں نیاز صاحب نے اپنی انمٹ چھاپ نہ چھوڑی ہو، اور جس کو اپنی سحر نگاری سے زندہ جاوید نہ بنا دیا ہو۔ ادب کے جس میدان میں بھی انھوں نے قدم رکھا اسے اپنی تخلیقات اور کارناموں سے شہرت دوام عطا کیا۔

نیاز صاحب نے اردو افسانہ کو رنگین اور شاعرانہ زبان عطا کی۔ اردو افسانہ میں ایسی رنگین اور رومانی زبان کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ درحقیقت انھوں نے اپنے افسانوں میں شاعری کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ایسی دلکش اور سحر انگیز عکاسی کی گئی ہے جس سے

پڑھنے والا مبہوت ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کے مجموعے "نگارستان" اور "جمالستان" میں الحمرا۔ کیوپڈ و سائکی۔ ایک رقاصہ۔ چنگاری۔ مطربۂ فلک ایک شاعر کا انجام۔ نزاکت خیال۔ طرز ادا اور رنگین بیانی ہیں۔ اردو ادب میں شاہکار ہیں۔ اور اب پارے ہیں۔ جو ادب عالیہ کی حیثیت سے زندہ جاوید ہو گئے ہیں۔

اپنے افسانہ ایک مصور فرشتہ میں نیاز صاحب لکھتے ہیں:

"ایک شب کا واقعہ ہے وادی قاف میں سپید پھولوں کی کثرت سے ایک طوفان عریانی بپا تھا۔ فرط نقطر سے پنکھڑیاں جا بجا شق ہو گئی تھیں۔ چاند اپنے سارے وجود کے ساتھ اتر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تو جیں جن میں ضیاء ماہ بھر کر رہ گئی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی زنجیریاں ہیں اور حباب کے گھونگھرو دانے جو صبا کے سبک اور نازک پاؤں سے فرش آب پر ہنگام رقص نکل کر رہ گئے ہیں۔"

اپنے افسانے کیوپڈ و سائیکی میں تحریر کرتے ہیں:

"جب رات کو شاہی باغ اور کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو کر غائب ہو جاتی تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائیکی نقاب الٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔"

اپنے افسانے دنیا کا اولین بت تراش "میں نیاز صاحب نے ایک

تخلیق کردہ بت اور اس کے خالق بت تراش کے احساسات یوں بیان کرتے ہیں:

"اس سے کچھ بات کرے اور وہ جواب دے۔ اس کو اپنے آغوش میں لے لے اور اس کا بدن لچک جائے......

بسا اوقات وہ اس خیال سے اس حد تک متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اسے واقعی زندہ سمجھنے لگتا ہے اور اس سے جا کر پوچھنے لگتا ہے کہ تیرے لب کیوں نہیں کھلتے۔ کیا مجھ سے برہم ہے۔"

نیاز کے افسانوں کا موضوع حسن وعشق ہے۔ درحقیقت حسن عشق عورت اور محبت کی جیسی رنگین اور دلکش تصاویر نیاز کے افسانوں میں ملتی ہیں اردو کے کسی دوسرے افسانہ نگار کے یہاں نہیں ملتی ہیں۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

"نیاز کے افسانے محبت اور عورت کو ایک لطیف راگ میں منتقل کر دیتے ہیں، جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا اور پڑھنے والے کو اس طرح مبہوت کر لیتا ہے کہ اس کو پھر کسی بات کا ہوش نہیں رہتا۔ نیاز کے عشقیہ افسانے سوز و گداز اور تاثیر کے ایسے مرقع ہیں جن کی مثال نیاز سے پہلے نہیں ملتی۔"

اردو تنقید میں نیاز کا منفرد مقام ہے۔ انھوں نے بگڑے شاعروں پر یا اچھے شعرا کے بگڑے ہوئے اشعار کا تجزیہ کر کے ادبی ذوق کی صحیح رہنمائی

کی۔ ان کے انتقادیات میں شعرا کی زبان اور تخیل کی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اور خیال و بیان کی غیر آہنگی کی جانب توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

نیاز صاحب کے انتقادی استدلال اتنے زوردار ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کا ہم نوا ہو جاتا ہے، اور ان کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان کی تنقید میں مومن کا جائزہ بہت فکر انگیز ہے وہ مومن کے اتنے شیدائی اور قدر دان تھے کہ ایک جگہ انھوں نے لکھا:

"مجھے کلیات مومن دیدو باقی سب اٹھالے جاؤ۔"

نیاز نے اصول تنقید میں زبان کو بڑا درجہ دیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری کی جو تحسین نیاز کے یہاں ملتی ہے وہ بھی اسی خیال کے زیر اثر ہے۔ ان کے نزدیک حسن خارجی حقیقت سے عبارت ہے۔ ادب شاعری اور جملہ فنون کی ابروان کے طرز اظہار سے قائم ہے۔ ان کا خیال ہے کہ

"شاعری حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیر بیان کا اظہار فطرت انسانی ہے۔"

نیاز صاحب نے ناتمام اور نارسا شاعری کی سخت گرفت کی ہے۔ انھوں نے زبان اور خیال کے اعتبار سے اردو کی بھونڈی شاعری کے خلاف آواز بلند کرکے اردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے اردو کے بڑے سے بڑے شاعر، غالب، اقبال، جوش، کسی کو نہیں بخشا ہے۔

اردو شعرا میں وہ مومن۔ حسرت موہانی۔ فانی بدایونی اور علی اختر کے مداح تھے۔

نیاز ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ان کے طرز تحریر میں بڑی رنگینی اور بے ساختگی پائی جاتی تھی۔ انھوں نے افسانہ۔ تاریخ۔ تنقید اور تحقیق کے لئے جداگانہ اسلوب بیان اور طرز تحریر استعمال کیا ہے لیکن رنگینی عام ہے اور تخیل کی آمیزش ہر جگہ جھلکتی ہے۔ اردو ادب میں نیاز ایک خاص ادبی دور کے رہنما ہیں۔" جس کو جمالیاتی دبستان کہنا چاہیے۔ رومانیت اور جمالیات دونوں ان کی ادبی تخلیقات کی بہت نمایاں خصوصیتیں ہیں"۔

نیاز صاحب نے اردو ادیبوں کی موجودہ نسل کو بہت متاثر کیا ہے اردو ادب کی تاریخ میں" نیاز کا اسلوب ایک زندہ قوت ہے جس کے اثرات کبھی فنا نہیں ہو سکتے"

مکتوبات نیاز میں ایسے بے شمار خطوط ملتے ہیں جو اپنی بے ساختگی اور ادبیت کے لحاظ سے خطوط غالب کا پرتو معلوم ہوتے ہیں۔ نیاز کے خطوط میں" ایک دلکش اور وقیع ادبیت ہے۔ ان میں طنز بھی ہے اور ظرافت بھی چھیڑ چھاڑ بھی ہے اور تیر و نشتر بھی۔ وہ ایک ادبی شعور کے آئینہ دار ہیں"

مذہب کے معاملہ میں نیاز نے آزاد خیالی اور عقلیت کا پرچار کیا۔ جس کی وجہ سے انھیں بڑے مصائب اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنا مسلک ترک نہیں کیا۔ انھیں کی زبانی سنئے:

"جوں جوں وقت گزرتا گیا میں مولویوں کے بنائے ہوئے اسلام سے متنفر ہوتا گیا...... سارے ملک کے مولوی میرے دشمن ہو گئے۔"

اس طرح اردو ادب میں نیاز صاحب نے آزاد خیالی اور بے باکی کے لئے راہ ہموار کی۔

نیاز صاحب نے اپنی زندگی اور اپنے مرنے کے بعد اردو کے سارے عظیم ادیبوں سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ ان کے مخالفین اور موافقین سب ہی ان کی ادبی عظمت کے قائل تھے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

"ان کے تحریری کارناموں میں افسانے اور ادبی تنقید کے علاوہ ایک ضخیم حصہ متفرقات کا بھی ہے۔ جن میں اخلاقیات و حکمت۔ اقتصادیات و معاشرت۔ ارضیات۔ فلکیات مذہب و تصوف۔ جنسیات۔ سمدرک یعنی علم فراست الید علم نجوم اور پھر سیاسیات حاضرہ غرضکہ زمین اور آسمان کا کون سا قضیہ ہے جس کو نیاز صاحب نے نہ چھیڑا ہو، اور جس کو اپنے طرز تحریر کے جادو سے بڑے بڑے مرتد پڑھنے والے کے لئے دلکش نہ بنا دیا ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیاز نے جب کبھی کسی موضوع کو اٹھایا تو کافی تحقیق اور چھان بین سے کام لے کر اسے بڑے سلیقہ سے پیش کیا۔"

موجودہ دور میں اردو کے عظیم شاعر اور ادیب فراق گورکھپوری کے قول کے مطابق:

"نیاز صاحب ہمارے ادب اور تہذیب کے قطب مینار ہیں میں قریب قریب ستر برس کی عمر میں یہ کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں نے ان کی تحریروں سے اردو سیکھی ہے اور ان کا رسالہ "نگار" چالیس برسوں سے میرے لئے ایک فیض گاہ درس گاہ رہا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جو ادیب معتقد نیاز نہیں ہے وہ آپ اپنے بیری ہے۔"

حضرت نیاز پر ایک نہایت قابل قدر مفکر۔ مقالہ نگار، فسانہ نگار۔ نقد و تبصرہ نگار اور ایک بلند پایہ اسٹائلسٹ (STYLIST) کی حیثیت سے اگر اختصار سے بھی لکھا جائے تو وہ ایک دفتر ہو جائے گا۔

اردو کے عظیم انقلابی شاعر حضرت جوش ملیح آبادی نے جن کی شاعرانہ لغزشوں سے مہینوں نگار کے صفحات سیاہ ہوتے رہے نیاز صاحب کے متعلق فرمایا ہے:

"حضرت نیاز ان چند گنے گنے استثنائی افراد میں سے ہیں جن کے پیدا کرنے کے لئے یہ دوں پرور آسمان ازل سے اب تک بخل کرتا چلا آرہا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ان کی ایک ذات کے احاطے میں کتنے

خلاقی کے شہر آباد ہیں۔ اتنے شعور کے لشکر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ اور رامش و رنگ کی اتنی براتیں اتری ہوئی ہیں تو بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ ان کو گلے سے لگا لوں۔
کاش نیاز فتحپوری کا سا خالقِ طرز انشا پرداز کسی زندہ قوم میں پیدا ہوتا۔ لیکن کیا کیا جائے۔

ہائے وہ عقل جو نرغے میں ہو دیوانوں کے"

مولوی سیّد محمّد نصیر

جہاں تک مجھے یاد ہے اکتسابِ علم کے سلسلے میں مجھے سب سے پہلا سابقہ مولوی سید محمد نصیر صاحب سے پڑا تھا۔ جن اساتذہ کے علم اور کردار کے نقوش میرے دل پر ثبت ہیں ان میں ایک مولوی نصیر بھی ہیں۔ جنھوں نے تین ماہ کے قلیل عرصہ میں قرآن پاک مجھے ختم کرایا اور اردو کی ابتدائی کتابیں مجھے پڑھائیں۔

برصغیر ہندوستان میں خلافت کی تحریک اپنے شباب پر تھی کانگریس اور خلافت کے اشتراک عمل نے پورے ملک میں آگ لگا دی تھی۔ علی برادران اور مولانا حسرت موہانی کی پرخلوص اور پرجوش قیادت اور گاندھی جی کی مثالی زندگی نے ہندوستانی عوام میں بیداری کی روح پھونک دی تھی۔ وہی ہندوستانی جواب تک انگریزوں کے نام سے کانپتا تھا، اب انگریز کا مقابلہ

کرنے کے لئے سینہ سپر ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی سامراج کے قدم اب ہندوستان کی مقدس سرزمین سے اکھڑنے والے ہیں، اور انگریز اب ہندوستان میں چند روز کے مہمان ہیں۔

میرے والد اپنے علاقے کے ایک بڑے اور معزز زمیندار تھے۔ انھوں نے علی گڑھ اینگلو محمڈن کالج سے ۱۹۰۵ء میں فارغ التحصیل ہو کر ملازمت کی جانب کوئی توجہ نہیں کی تھی۔ زمینداری اور تجارت کے آزاد پیشے کو انھوں نے ملازمت پر ترجیح دی۔ انھوں نے ایک نوجوان مولوی سید محمد نصیر کو جو حال ہی میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہوئے تھے میری ابتدائی تعلیم کے لئے مامور کیا۔ ان کی تنخواہ بارہ روپے ماہوار تھی۔ کھانے پینے رہنے سہنے کے سارے اخراجات ہمارے والد کے ذمے تھے۔ وہ ہمارے گھر پر رہتے اور خاندان کے ایک فرد کی طرح ہمارے ساتھ خورد و نوش میں شریک ہوتے تھے۔

مولوی نصیر جو ایک بڑے پرجوش مقرر اور علمی اعتبار سے بڑے قابل انسان تھے۔ کانگریس خلافت تحریک سے بڑے متاثر تھے۔ بلکہ اس کے پرجوش مبلغ تھے۔ انھوں نے میرے والد کو بھی اپنے انقلابی اور قومی نظریات سے متاثر کیا۔ میرے دادا جو ایک بہت بڑی مسلمان ریاست کے مدار المہام ہوا کرتا دھرتا تھے۔ قدرتی طور پر حکومت برطانیہ کے بڑے وفادار تھے۔ راجہ صاحب میرے دادا کو بڑے بھائی کہا کرتے تھے، اور ان کے انتظامی امور میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔

مولوی نصیر کے انقلابی نظریات نے میرے والد کو اس حد تک متاثر کیا کہ وہ بھی خلافت تحریک کے پرجوش حمایتی بن گئے بلکہ انھوں نے کانگریس کی عدم تعاون کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا۔ بدیشی کپڑوں اور سامان کا ایک بڑا الاؤ گاؤں کے وسط میں لگا دیا گیا اور قیمتی بدیشی کپڑوں کو گاؤں والوں کے جیکاروں کے دوران نذر آتش کر دیا گیا۔

میرے دادا کے لئے جو ریاست اور تاج برطانیہ کے بڑے وفادار تھے میرے والد کی یہ انقلابی تبدیلی بہت پریشان کن تھی۔ انھوں نے اقتدار اور امارت کی جو عظیم الشان عمارت تعمیر کی تھی وہ متزلزل ہوتی نظر آتی تھی۔ میرے والد اب خلافت اور کانگریس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنا قیمتی سامان اور میری والدہ کے زیورات ترکوں کے خلاف فنڈ کے لئے نذر کر دئے۔ میرے دادا میرے والد کی اس حیرت انگیز تبدیلی کا ذمہ دار مولوی نصیر صاحب کو سمجھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مولوی نصیر کے ساتھ بہت ترش رویہ اختیار کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ مولوی نصیر ہمارے گھر سے چلے جائیں۔ لیکن مولوی نصیر ہمارے گھر کے فرد بن چکے تھے۔ اور میرے والد انھیں جدا کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے۔ یہ بات ہمارے دادا اور ہمارے والد میں اختلافات کو وسیع کرنے کا سبب ہوئی۔ لیکن خدا کی کرنی ایسی ہوئی کہ مولوی نصیر کی ایک انقلابی بلکہ باغیانہ تقریر کی وجہ سے جو انھوں نے ایک عوامی جلسے میں کی تھی، انھیں گرفتار کر لیا گیا، اور انھیں دو سال کی قید

بامشقت کی سزا ہوگئی۔

مولوی نصیر کے چلے جانے سے ہماری تعلیم پر بہت بُرا اثر پڑا۔ وہ ایک بہت اچھے اور ذہین استاد تھے۔ پرانے قسم کے مولویوں سے بالکل مختلف وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کھیل کود کی جانب بھی پوری توجہ کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ گاؤں میں سب سے پہلے فٹ بال انھوں نے ہمارے لئے منگوایا تھا، اور شام کو سارے بچے میدان میں فٹ بال کھیلنے جایا کرتے تھے جس میں مولوی صاحب خود بھی شریک ہوتے تھے۔ وہ بہت سخت خیالات کے آدمی تھے، اور اپنی پسند اور ناپسندیدگی میں بڑی حد تک جذباتی واقع ہوئے تھے، اس لئے وہ انتہا پسند طبیعت کے مالک ہوگئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ہٹے کٹے فقیروں سے سخت نفرت کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ خدا نے انھیں ہاتھ پیر دیئے ہیں جن سے کام نہیں لیتے اور بھیک مانگ کر حرام سے پیٹ بھرتے ہیں۔ کبھی اگر کوئی ہٹا کٹا فقیر ادھر آنکلتا تو مولوی صاحب اسے مارنے کو لپکتے اور اکثر اسے مارنے کے لئے دو دو فرلانگ تک اس کا پیچھا کرتے۔ عجیب منظر ہوتا، فقیر آگے آگے بھاگا چلا جا رہا ہے اور مولوی صاحب ایک ہاتھ میں جوتا تھامے اس کے پیچھے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

میرے والد اب کٹر کانگریسی اور خلافتی ہو چکے تھے۔ ان کی زندگی میں بھی انقلاب آچکا تھا۔ انھوں نے سارے سامان تعیش ترک کرکے عوامی زندگی اختیار کرلی تھی۔ ململ اور سلک کے بجائے موٹے کھدر

کے کپڑے پہننا شروع کر دیئے تھے۔ جس پر وہ ساری زندگی کاربند رہے۔ مولوی نصیر کے زمانہ قید میں انھوں نے مولوی نصیر کے مشن کو جاری رکھا۔ مولوی نصیر کی گرفتاری کے بعد میرے دادا کو قدرے سکون ہو گیا تھا کہ چلو بلا ٹلی۔ لیکن جب میرے والد کی انقلابی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اس میں اور شدت اور پختگی پیدا ہو گئی تو میرے دادا میرے والد کی جانب سے مایوس ہو گئے، اور ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے آپ کو تن بہ تقدیر کے حوالے کر دیا۔

مولوی نصیر جب جیل سے چھوٹ کر آئے تو میرے والد اور قرب و جوار کے عوام نے ان کا بڑا شاندار استقبال کیا۔ انھیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور ان کے استقبال کے سلسلے میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں مولوی صاحب نے دھواں دھار تقریر کی۔

میرا گھر اب ضلع فیض آباد میں خلافت اور کانگریس کا سب سے بڑا مرکز بن چکا تھا۔ سینکڑوں والنٹیر اور لیڈر میرے گھر مہمان رہتے تھے۔ میرے والد کی تجارت خلافت تحریک کے نذر ہو چکی تھی۔ زمینداری بھی مٹی میں مل چکی تھی۔ آمدنی مفقود تھی۔ پرانا سرمایہ صرف ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں میرے ایک گاؤں اریا بازار میں کانگریس کا ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نے کی۔ پنڈت جی دو دن ہمارے یہاں مہمان رہے۔ ہندوؤں کی پرانی رسم کے مطابق جلسہ میں دیہاتیوں نے ان کے قدم چھونے چاہے جس سے پنڈت جی بہت برہم

ہوئے۔ اس زمانے میں ان پر دہریت غالب تھی اور اس قسم کی لغویات کو پنڈت جواہر نہرو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کا تذکرہ انھوں نے اپنی مشہور سوانح حیات "نہرو" میں کیا ہے۔

مولوی نصیر صاحب اب مکمل طور پر انقلابی ہو گئے تھے۔ تقریر کے دوران انھیں اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا تھا۔ وہ قابو سے باہر ہو جاتے تھے اور برطانوی سامراج کے لئے گالی گفتار پر اتر آتے تھے۔ ان کی تقاریر عام طور سے باغیانہ ہوا کرتی تھیں اس لئے ان کی زندگی زیادہ تر جیل میں گزرتی تھی۔ ابھی جیل سے چھوٹ کر آتے، جلسہ ہوا۔ انھوں نے باغیانہ تقریر کی اور پھر دھر لئے گئے۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ مولوی صاحب دو ہفتہ قبل جیل سے رہا ہو کر آئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ہمارے ساتھ برآمدے میں چائے پی رہے تھے اور خوب خوش گپیاں کر رہے تھے۔ اسی دوران داروغہ قریشی جو ان کے دوست بن چکے تھے وہاں تشریف لائے۔ ہم لوگ سمجھے شاید ملنے آئے ہوں گے۔ لیکن آتے ہی انھوں نے مولوی صاحب سے کہا کہ چلئے آپ کی طلبی ہے، اور وارنٹ ان کے حوالے کر دیا۔ مولوی صاحب چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے فوراً ان کے ساتھ اس طرح روانہ ہو گئے جیسے کسی تفریح کے لئے جا رہے ہوں۔ معلوم ہوا کہ تین چار دن قبل انھوں نے جلال پور میں جو باغیانہ تقریر کی تھی اس کے نتیجہ میں انھیں گرفتار کیا گیا۔

مولوی نصیر اب جیل کی زندگی کے بالکل عادی ہو گئے تھے، بلکہ

آزادی ان کی طبیعت پر گراں گزرتی تھی اور اپنی فطرت کے خلاف معلوم ہوتی تھی۔ معلوم نہیں کتنی بار وہ جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ ان کے بال بچوں کی کفالت میرے والد کیا کرتے تھے۔ میرے والد اپنی تقریروں میں البتہ حد سے تجاوز نہیں کرتے تھے، اور اپنے آپ پر قابو رکھتے تھے کوئی ایسی بات نہیں کرتے تھے جس سے بغاوت کی بو آتی ہو۔ اس لئے وہ قید و بند سے محفوظ رہے۔ لیکن انھوں نے مولوی نصیر کے مشن کو بڑے جوش و خروش اور کامیابی سے جاری رکھا۔

نہرو رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد کانگریسی اور خلافتی مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ ہندو کانگریس کا فریب ان پر پوری طور سے آشکارا ہو گیا تھا۔ ہندو کانگریس کو انھوں نے اپنے اصلی خد و خال میں دیکھ لیا تھا۔ اسی وجہ سے علی برادران اور مولانا حسرت موہانی ایسے پرخلوص قائدین جنھوں نے کانگریس کو ایک انقلابی جماعت اور گاندھی جی کو ایک عوامی لیڈر بنایا تھا۔ کانگریس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ مولوی نصیر بھی اس وقت قدرے ٹھنڈے پڑ گئے اور انھوں نے چھیتاپٹی میں ایک مقامی انگریزی اسکول میں فارسی کے استاد کی جگہ پر ملازمت کرلی۔ یہ اسکول ریلوے لائن سے آٹھ دس میل دور تھا، اور وہاں یکہ کے سوا کوئی دوسری سواری نہیں جاتی تھی۔

گرمیوں کی تعطیل ہوئی تو مولوی صاحب نے دو درجن لڑکوں کے ساتھ پا پیادہ اکبر پور کا رخ کیا جو اسکول سے دس میل کے فاصلے پر تھا۔

وسط مئی کا گرم دن تھا۔ گرم ہوا کے تھپیڑے بدن کو جھلسائے دے رہے تھے اسی حالت میں مولوی صاحب لڑکوں کو ہنکاتے ہوئے اکبر پور کی جانب رواں دواں تھے۔ ابھی دو تین میل گئے ہوں گے کہ ان پر جھن جھنیاں کا حملہ ہوا۔ یہ مرض اس زمانے میں بہت پھیلا ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے بدن میں آگ سی لگنے لگی۔ لڑکوں نے انھیں ایک کنوئیں کی جگت پر بٹھا کر سینکڑوں ڈول ٹھنڈا پانی ان پر اونڈیل دیا۔ تب جا کر ان کی سوزش دور ہوئی اور ان کو ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ گاؤں والوں نے بہت اصرار کیا، منت سماجت کی کہ مولوی صاحب جو شیطان کی طرح سارے قرب و جوار میں مشہور تھے، ایک دن آرام کرلیں۔ لیکن مولوی صاحب دھن کے پکے تھے، وہ بھلا کبھی دوسرے کی کب سننے والے تھے۔ فوراً سفر پر روانہ ہو گئے، اور اکبر پور پہنچ کر دم لیا۔ لڑکے جو ان کے ساتھ تھے بیدم ہو گئے تھے، لیکن مولوی صاحب کے ڈر کی وجہ سے اُف نہیں کر سکے تھے۔ ان کے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ لیکن حرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتے تھے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت جب عوامی انتخابات ہوئے تو مولوی نصیر صاحب نے کانگریس کا ساتھ دیا۔ بدایوں میں حافظ محمد ابراہیم کے تاریخی ضمنی انتخاب میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے سارے بڑے لیڈروں نے اس انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

مسلم نشستوں کے لیے یوپی کے درجنوں ضمنی انتخابات ہوئے ان میں سے کانگریس کو صرف حافظ ابراہیم کے انتخاب میں کامیابی ہوئی تھی، لیکن اس کامیابی کا سہرا حافظ ابراہیم کی ذاتی مقبولیت کے سر تھا۔ بدایوں کے انتخاب کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈر ایک ہی ٹرین سے واپس لوٹے اور اتفاق سے ایک ہی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں بحث و تکرار کی نوبت پہنچی۔ مولوی نصیر نے کوئی سخت بات قائد اعظم کی شان میں کہہ دی جس پر ایک مسلم لیگی نے انھیں چھرا مار دیا۔ مولوی صاحب کو بریلی کے اسٹیشن پر ٹرین سے اتار کر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ کانگریسی وزارت صوبہ میں قائم ہو چکی تھی۔ کانگریسی اخباروں نے اس واقعہ کو بڑی ہوا دی اور بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا، لیکن کانگریسی حکومت نے خلاف توقع اس کا زیادہ اثر نہیں لیا۔

۴۶ ۱۹ء کے انتخابات میں مولوی نصیر ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے کانگریسی ٹکٹ پر صوبہ کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ اور بعد ازاں اسمبلی کے سکریٹری مقرر ہو گئے۔ انھیں کانگریسی حکومت نے لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی کا استاد مقرر کر دیا۔ حالانکہ وہ انگریزی سے قطعی نابلد تھے۔ اور پنشن حاصل کرنے تک وہ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔

مولوی صاحب اپنی عادتوں میں بھی بہت انقلابی اور انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ سخت سے سخت اور دیرینہ سے دیرینہ عادت کو یکلخت چھوڑ دیتے تھے، خواہ اس سے انھیں کتنی ہی جسمانی اور ذہنی تکلیف کیوں نہ ہو۔ ایک زمانہ میں وہ پان اور تمباکو اس کثرت سے کھاتے تھے کہ ان کا

منہ اگالدان معلوم ہوتا تھا اور دانت شریف کے بیچ، پان کی پیک منہ سے بہہ کر ان کی داڑھی کو اکثر لالہ زار بنا دیتی تھی۔ لیکن جب انھوں نے پان ترک کیا تو پھر کبھی اس کو منہ نہ لگایا۔ یہی حال حقّے اور سگریٹ کا ہوا ایک زمانہ تھا کہ سگریٹ اور حقے کے کش پر کش لگایا کرتے تھے لیکن جب چھوڑا تو پھر اسے قریب نہیں آنے دیا۔

اُستاد بُندو خاںؑ

الہ آباد یونیورسٹی کے میور سنٹرل کالج کا مشہور وجیا نگرم ھال تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہندوستان کے چپہ چپہ سے چیدہ چیدہ موسیقار اور گائک ملک کی سالانہ موسیقی کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ اسٹیج پر ایک جانب برصغیر کے نامور موسیقار گلوکار اور ساز کار۔ بشمول آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں۔ عبدالکریم خاں۔ استاد مشتاق حسین اور بڑے غلام علی خاں۔ ستار نواز علاءالدین خاں اور سارنگی نواز استاد بندو خاں جلوہ افروز تھے۔

آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں نے جب اپنی گلوکاری ختم کی تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری تھی۔ وہ ملک کے سب سے بڑے گائک تھے۔ اور ان کے الاپ سے محفل پر سماں بندھ جاتا تھا۔ ان کے

بغیر کسی گائک یا سازکار کا چراغ نہیں جلتا تھا۔

فیاض خاں کے بعد ایک نحیف و نزار شخص جب اپنی سارنگی بغل میں دبائے ہوئے اسٹیج پر سامنے آیا تو لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا کہ استاد فیاض خاں کے بعد کون اس کی سارنگی سنے گا۔ وہ اسٹیج پر بیٹھ گیا، اور اس نے اپنی سارنگی کے تاروں کو آہستہ آہستہ چھیڑنا شروع کیا۔ سارنگی سے ہلکی ہلکی آوازیں نکلنے لگیں جو رفتہ رفتہ تیز اور بلند ہوتی گئیں۔ سازکار کے ہاتھ کی کمان برقی رفتار سے سارنگی پر چل رہی تھی۔ اور ساز سے نکلنے والی آتش موسیقی نے سامعین کے قلوب میں انتہائی سوز و گداز پیدا کر دیا تھا، جو اس کے سحر سے اس وقت آزاد ہوئے جب سازکار نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ یہ سازکار استاد بندو خاں تھے جو اپنے زمانہ میں دنیا کے سب سے بڑے سارنگی نواز تھے، اور جن کا شمار ایشیا کے عظیم ترین موسیقاروں میں ہوتا تھا۔

استاد بندو خاں دہلی کے ایک مشہور موسیقاروں کے گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ یہ گھرانہ عہد مغلیہ سے معزز چلا آتا تھا۔ اسی گھرانے نے گائیک بھی پیدا کیا، لیکن سارنگی نوازی میں بڑا نام پیدا کیا، اور یہی اس گھرانے کی شہرت کا باعث تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد کے زمانے میں اس گھرانے کے ممن خاں نے بڑا نام پیدا کیا، وہ اپنی سارنگی نوازی اور موسیقی سے متعلق معلومات کی بنا پر شمس موسیقی کہلاتے تھے۔ انھوں نے سارنگی کے ساز میں بھی اختراعات اور اضافے کیے۔ عام سارنگیوں

سے ان کی سارنگی کا حجم ڈیوڑھا تھا۔ اس کا نام انھوں نے "سرساگر" رکھا۔

ممن خاں بڑے نمازی۔ پرہیز گار، اور وضعدار انسان تھے۔ ان کی شہرت کا آفتاب جب چمکا تو ہندوستانی ریاستوں میں ان کی طلب ہونے لگی۔ میسور۔ بروده، نیپال۔ پٹیالہ کے ریاستی درباروں میں ان کی سارنگی نے جادو کے جوت جگائے۔ کچھ عرصہ تک ریاست میسور میں ملازم رہے، لیکن دہلی کی یاد نے انھیں زیادہ عرصہ وہاں قیام نہ کرنے دیا۔ ملازمت ترک کر کے دہلی آگئے۔ کچھ دنوں بعد ریاست پٹیالہ سے منسلک ہو گئے۔ زندگی کے آخری ایام دہلی میں گزارے۔ برصغیر ہندو پاکستان میں ان کے یوں تو سینکڑوں شاگرد ہیں لیکن انھوں نے دو عظیم یادگاریں چھوڑیں۔ ان کے لڑکے چاند خاں جو ملک کے مشہور گائک ہوئے اور ان کے بھانجے اور داماد بندو خاں جو اپنے زمانے کے سب سے نامور سارنگی نواز تسلیم کیے گئے۔

موسیقی سے متعلق بندو خاں کی تعلیم اور تربیت کا سہرا ان کے ماموں ممن خاں کے سر ہے۔ آٹھ سال کی عمر سے بندو خاں نے سخت انہماک، استقلال اور مشقت سے یہ تربیت جاری رکھی جو بیس سال کی عمر میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ممن خاں کے قول کے مطابق ان کے خاندان میں موسیقی کی تربیت بچہ کی پیدائش کے وقت ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ موسیقی میں بندو خاں کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ بچپن ہی سے ہو گیا تھا۔ مثل مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ان صلاحیتوں کو

ان کے نامور ماموں ممن خاں کی تربیت نے جلا بخشی۔ بقول بندو خاں وہ موسیقی کی ریاض دن رات کرتے تھے اور اکثر رات کو دیر تک جاگتے اور موسیقی کی مشق کرتے رہتے۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد بن گئی تھی۔ ان کی خوشیاں اور غم اسی سے وابستہ ہو گئے تھے۔

ایک بار نوجوان بندو خاں نے بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے خاندان کے افراد کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ بڑی واہ واہ ہوئی۔ بندو خاں نے اپنے ریاض میں جان کی بازی لگا دی۔ کچھ عرصہ بعد جب انھوں نے سامعین کی ایک بڑی محفل میں اپنے فن کا دوبارہ مظاہرہ کیا تو ان کی سارنگی نے ایسے جادو جگائے کہ سامعین مسحور ہو گئے۔ ممن خاں بھی وہاں موجود تھے، مظاہرہ کے اختتام پر انھوں نے اپنے بھانجے کو سینے سے لگایا۔ بندو خاں کی عمر اس وقت صرف تیرہ سال تھی۔

استاد ممن خاں نے انھیں نصیحت کی تھی کہ علم جہاں بھی ملے بے جھجک لینا۔ اس لئے بندو خاں نے بھاٹوں اور چماروں تک سے موسیقی سیکھی۔ بندو خاں نے جن بڑے استادوں کی سنگت کی ان میں تان رس خاں کے بیٹے امراؤ خاں۔ آفتاب موسیقی استاد فیاض خاں۔ چاند خاں اور استاد بڑے غلام علی خاں کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

استاد بندو خاں اندور کے ریاستی دربار سے ۲۷ سال تک منسلک رہے۔ انھوں نے ہندوستان کی قدیم موسیقی تک دسترس حاصل کرنے کے لئے وہاں سنسکرت سیکھی۔ موسیقی کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے

ان کی انتھک محنت نے ان کی تندرستی پر برا اثر ڈالا لیکن ان کی ہمیشہ یہی خواہش رہتی کہ فن میں کمال حاصل کیا جائے۔ اسی کوشش میں ان کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ جب کبھی وہ دہلی آتے اور اس کی سڑکوں پر گزرتے تو ان کی سارنگی ان کے پہلو سے لٹکی ہوتی تھی۔ اندر وہ اوپر سے چادر اوڑھے رہتے تھے۔ راستہ چلتے ہوئے بھی وہ اپنی سارنگی پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔ بندو خاں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سارنگی کو سورنگی بنا دیا۔ اس میں بڑی مفید اختراعات کیں اور اسے مختلف سازوں کا مجموعہ بنا دیا جس سے طرح طرح کی آوازیں اور سر نکالے جاسکتے تھے ایک مشہور ساز کار کے سوال کے جواب میں بندو خاں نے ایک بار کہا تھا کہ:

"میں لکڑی کے کسی ٹکڑے سے موسیقی پیدا کر سکتا ہوں"

بندو خاں نے بڑے بڑے گائکوں سے سنگت کی اور کبھی ہیٹے نہیں رہے بلکہ گائکوں پر ہمیشہ وہ غالب رہے۔ اس سلسلے میں دو ایک واقعات شاہد احمد دہلوی صاحب کی زبان میں سنیئے:

"استاد فیاض خاں جیسا چونکھا گویا ابھی آج تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ فیاض خاں بندو خاں کی بڑی عزت کرتے تھے، اور کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ بھی کرتے تھے۔ فیاض خاں ایک کانفرنس میں گا رہے تھے۔ بندو خاں ان کی سنگت کر رہے تھے۔ جب بندو خاں کی سارنگی فیاض خاں کے

گانے پر چڑھنے لگی تو فیاض خاں نے چپکے سے مزاحاً کہا:
"کیا بانس بجایا کرتے ہو؟" بندو خاں نے ہنس کر کہا "یہ بانس کہہ رہا ہے۔ ہندوستان میں کتنے کوڑھ ہیں؟"

"مہاراجہ اندور کے یہاں ہولی کے موقع پر گانے بجانے کا بڑا عظیم الشان جلسہ ہوتا تھا۔ سارے ہندوستان کے چیدہ چیدہ فنکار جمع ہوئے تھے۔ بیس بیس پچیس پچیس ہزار کے انعام استادوں کو ملتے تھے۔ سنگیت سمراٹ استاد رجب علی خاں اپنے وقت کا بڑا اکڑوا گویا تھا۔ گھنٹوں درت گاتا تھا اور ایک سے ایک نئی لاتا تھا۔ ایک ہولی میں جب رجب علی خاں گانے بیٹھے تو ان کے ساتھ سارنگی بجانے کے لئے مہاراج نے بندو خاں کو بٹھا دیا۔ دونوں کی چڑھتی جوانی۔ ریاض چڑھے ہوئے گویئے کو یہ زعم کہ گلے کا ساتھ بھلا ہاتھ کیا کرے گا۔ اور سارنگی نواز اسی ترنگ میں کہ تمہارا سارا علم میرے ناخنوں میں ہے۔ جو گانا بجانا شروع ہوا ہے تو نہ وہ ہٹتا ہے نہ یہ۔ اور تانیں وہ بن بن کر آ رہی ہیں کہ ساری محفل پھڑک جاتی ہے۔ ہاتھ اور گلے کا ساتھ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو جیسا اس دن ہوا۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ دونوں ایسے گتھے ہوئے تھے جیسے بلبلوں کی پالی ہو رہی ہو۔ نو گھنٹے تک یہ پکڑ جاری

رہی ۔ کانٹے کی کشتی ہو رہی تھی، مگر نہ آر ہوتی تھی نہ پار۔ آخر مہاراج نے دونوں کو انعام دے کر برابر چھڑا دیا۔"

بندو خاں موسیقی کے ایک چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے۔ انھوں نے پانچ سو راگوں پر مکمل دسترس حاصل کر لی تھی، ان کے سارے نکات اور خوبیوں سے واقف تھے، اور اپنی حیرت انگیز یادداشت کی بدولت وہ ان راگوں کو بڑے سلیقہ اور استادی سے ہمیشہ ادا کرتے تھے، جبکہ ان کے زمانے میں شاید ہی کوئی دوسرا موسیقی کا استاد پچاس سے زائد راگوں کا ماہرانہ دسترس رکھتا ہو۔

بندو خاں نے موسیقی کی ایک کتاب "جوہر موسیقی" بھی تصنیف کی ہے جو اردو اور ہندی زبانوں میں جون ۱۹۳۴ء میں طبع ہوئی۔

وہ ایک بہت سادہ اور فقیر منش انسان تھے۔ جو کچھ کماتے وہ خرچ کر ڈالتے، اور اپنی اماں کے حوالے کر دیتے۔ موسیقی کے دیگر استادوں کے برخلاف انھیں ہر قسم کی لغویات سے سخت نفرت تھی۔ وہ انتہائی خاکسار قسم کے استاد تھے جو دیگر اساتذہ کے خلاف موسیقی کے رازوں سے دوسروں کو فیضیاب کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ وہ وعدے کے بہت پابند تھے۔ اسی لئے کسی محفل میں کبھی تاخیر سے نہیں پہنچتے تھے۔ وہ اتنے منکسر المزاج انسان تھے کہ آنکھ ملا کر کسی سے باتیں نہیں کرتے تھے۔

ریاست اندور میں استاد بندو خاں کی بڑی قدر ہوئی، ۲۷ سال

تک وہ اس دربار سے وابستہ رہے۔ مہاراج جب گدی چھوڑ کر امریکہ چلے گئے تو بندو خاں بھی دہلی مراجعت کر گئے۔ لیکن تاحیات ان کی پنشن جاری رہی اور پاکستان کے قیام کے دوران بھی یہ پنشن انھیں ملتی رہی۔

استاد بندو خاں کی جتنی پذیرائی اور قدر و منزلت ہوئی کم استادوں کی ہوئی ہوگی۔ ہزاروں روپے روزانہ پر کانفرنسوں میں شرکت کرتے تھے۔ نواب رام پور جب انھیں بلاتے تو پانچ سو روپے روزانہ دیتے۔ دہلی کے رئیس اور سیٹھ دو سو چار سو روپے دیتے۔ ہندوستان کے مشہور سیٹھ برلا ان کے بڑے قدردان تھے۔ ہندوستان کے مرد آہن اور وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو بندو خاں سے بڑی عقیدت تھی۔ سردار پٹیل دل کے مریض تھے۔ انھیں بندو خاں کی سارنگی سننے سے بڑا فائدہ ہوا تھا پاکستان جب قائم ہوا اور بندو خاں نے پاکستان جانے کا قصد کیا تو سردار پٹیل نے انھیں ہر طرح کی یقین دہانی کر کے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ انڈیا ریڈیو سے انھیں بارہ سو روپے ماہوار کا انتظام کرانے اور ان کے گھر پر فوجی پہرہ لگوانے اور دیگر مراعات دینے کا وعدہ کیا، لیکن بندو خاں پر تو پاکستان کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ آئے اور لالو کھیت میں مرے۔

استاد بندو خاں ۱۹۴۸ء میں چپکے سے پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصہ لاہور میں قیام رہا، پھر کراچی آ گئے۔ یہاں تنگی ترشی سے بسر ہوتی رہی۔ دال روٹی چلتی رہی۔ ریڈیو پاکستان سے چار پانچ سو روپے ماہوار کا پروگرام انھیں ملتا رہا۔ کراچی میں رہائش مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ ہے۔

استاد بندو خاں کو بھی اس سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ آخر کار لالو کھیت میں تھوڑی سی زمین الاٹ ہو گئی۔ قرض لے کر اس پر انھوں نے ایک کمرہ تعمیر کر لیا۔ پندرہ سولہ افراد کا یہ خاندان اس ایک کمرے میں زندگی کے دن گزارتا رہا۔ بندو خاں کے دونوں لڑکے جب ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہو گئے، تب استاد نے قدرے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن سفینۂ زندگی کنارے آ لگا تھا: سارنگی کا جادوگر نغمے کا جادو جگا کر سو جانا چاہتا تھا۔" آخر کار وہ گھڑی آگئی، جو سب پر آتی ہے، اور آتی رہے گی۔ ستر سال کی عمر میں ایشیا کا یہ عظیم فنکار اور دنیا کا سب سے بڑا سارنگی نواز ۱۳ر جنوری ۱۹۵۵ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ سارنگی جس نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے قلوب میں سوز و گداز پیدا کیا تھا، اب خاموش تھی

میری امّاں

اسلام نے حقوق العباد کے معاملے میں ماں کو سب سے بڑا درجہ دیا ہے۔ ایک مومن کی زندگی میں خدا کے بعد اس کی ماں کا اس پر سب سے زیادہ حق ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کا قول ہے: "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔" قرآن پاک میں بارہ سے زائد مقامات پر والدین کے حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک بار ایک سوال کے جواب میں رسول اکرمؐ نے فرمایا: "تمہارے وسائل پر سب سے پہلا حق تمہاری ماں اور اس کے بعد تمہارے باپ کا ہے۔" آپ نے فرمایا: "ماں کی نافرمانی اسلام کے منافی ہے۔"

یوں تو ہر اولاد کو اپنی ماں سے فطری محبت ہوتی ہے۔ سبھی کو اپنی ماں پیاری ہوتی ہے، لیکن مجھے اپنی ماں سے والہانہ محبت تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے بچوں میں مجھے سب سے عزیز رکھتی تھیں اور اس لئے بھی کہ

ان میں ایسے بہت سے اوصاف حمیدہ تھے۔ جن کی بابت ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا لیکن کسی انسان میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑی خوش اخلاق۔ خدا ترس اور پرہیز گار خاتون تھیں، جو بہت ہر دلعزیز تھیں۔ جن سے بھی وہ ملتی تھیں وہ ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

آج کل کے لحاظ سے میری ماں زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ لیکن پھر بھی انھوں نے قرآن۔ اسلامیات۔ فارسی اور اردو کی تعلیم گھر پر حاصل کی تھی۔ ان کی شادی کافی کمسنی میں ہو گئی تھی۔ اس صدی کے ابتدائی زمانے میں جب وہ فیض آباد یو، پی کے ایک دیہات تاجپور میں بیاہ کر آئیں تو اس دیہات میں تعلیم نسواں کا رواج بالکل نہ تھا۔ عورتیں زیادہ سے زیادہ قرآن پاک کی آیتیں یاد کر کے نماز روزہ سے متعلق اپنا کام چلا لیا کرتی تھیں۔ میری ماں اس لحاظ سے وہاں بڑی تعلیم یافتہ تسلیم کی گئیں۔ وہ تاجپور کے ایک زمیندار گھرانے میں بیاہ کر آئی تھیں۔ جو اس قرب و جوار میں سب سے زیادہ خوش حال تھا۔ لیکن انگریزی تعلیم کا چرچا ابھی تک اس دیہات میں نہیں ہوا تھا۔ میری ماں نے میرے والد کو اس بات کی ترغیب دی کہ وہ اس زمانے کی جدید تعلیم حاصل کریں۔ اور اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے شوہر کو علی گڑھ یونیورسٹی اسکول میں داخلہ لینے پر راغب کیا۔ یہی نہیں بلکہ دو ایک رشتہ داروں کو بھی جو پڑھنے لکھنے میں تیز تھے اور اردو مڈل میں بڑے امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے تھے، انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں ہر قسم کی مالی امداد دے کر

ان کی ہمت افزائی کی۔ ان حضرات نے انگریزی تعلیم سے پوری طرح بہرہ مند ہو کر بڑی کامیاب زندگی بسر کی۔

تاجپور کے دیہات میں تعلیم نسواں کا چرچا بھی میری ماں کی وجہ سے ہوا۔ انھوں نے گاؤں کے شرفاء کی لڑکیوں کو قرآن۔ اردو۔ اور اردو کی مذہبی کتابیں پڑھانے کا ذمہ اپنے سر لیا۔ گاؤں کی لڑکیاں ان کے یہاں روزانہ پڑھنے آتی تھیں، اور رفتہ رفتہ اس گاؤں میں تعلیم نسواں کو بڑا فروغ ہوا۔ خواتین کو اسلام سے متعلق صحیح حقائق سے آگاہی ہوئی اسلامی اخلاق اور اخوت اور خصوصاً اسلام کے برگزیدہ پیغمبرؐ اور ان کے پاکباز صحابہؓ کے اسوۂ حسنہ اور مثالی زندگی سے متعارف ہونے پر گاؤں کی خواتین کی زندگی پر بہت اچھا اثر پڑا۔

میری ماں کی تعلیم اور تربیت نے گاؤں کی خواتین میں اسلام سے متعلق غلط اور مذموم رسومات کو دور کر کے ان میں مذہب اسلام کے صحیح ارکان کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے ہمسایوں کیساتھ سلوک غریبوں سے محبت اور غیروں کے ساتھ رواداری اور اخلاق برتنے میں اپنی مثال سے دیہات کے معاشرے کو صحیح خطوط پر استوار کرنے میں رہنمائی کی۔

وہ بڑی عبادت گزار خاتون تھیں۔ صبح چار بجے خواب سے بیدار ہوتیں، اس وقت سے آٹھ بجے دن تک برابر نماز اور وظائف میں مشغول رہتیں۔ رات دن عبادت کرتیں۔ خدا نے گھر میں سبھی کچھ دے

رکھا تھا۔ نوکر چاکر، مائیں موجود تھیں۔ جب عبادت سے فارغ ہوتیں تو ناشتہ کرنے کے بعد اپنے اور گاؤں کے بچوں کو تعلیم دیا کرتی تھیں۔ وہ اس میں چھوٹے بڑے کا کبھی امتیاز نہیں کرتی تھیں۔ امیر غریب سبھی کے بچے ہمارے ساتھ بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ غریبوں کے بچوں پر وہ زیادہ توجہ دیا کرتی تھیں اور ان کو بڑی محبت اور پیار سے پڑھایا کرتی تھیں۔ ایک بار مجھے یاد ہے کہ دن کا وقت تھا وہ کوئی کپڑا سی رہی تھیں، سوئی جا نماز میں کھونس کر وہ کسی کام سے چلی گئیں۔ واپس آئیں تو انھیں خیال نہ رہا۔ اتفاق سے وہ سوئی گھٹنے میں گھس گئی۔ انھوں نے اس کا دھاگہ پکڑ کر کھینچنے کی کوشش کی تو دھاگہ ٹوٹ گیا اور سوئی کافی اندر گوشت میں پیوست ہوگئی۔ بڑی کوشش کی گئی لیکن وہ کسی طرح باہر نہیں نکلی۔ ڈاکٹر بلانے کے لئے چار میل دور اکبر پور آدمی روانہ کیا گیا، لیکن اس درمیان میں عصر کی نماز کا وقت آگیا تھا۔ وہ مصلّے پر کھڑی ہوگئیں، اور انھوں نے نماز ادا کی۔ نماز ادا کرنے سے سوئی اندر غائب ہوگئی۔ ڈاکٹر آئے انھوں نے دیکھا، کہنے لگے سوئی گوشت سے غالباً شریانوں میں سرک گئی ہے۔ بغیر آپریشن کے نکل نہیں سکے گی۔

یہ غالباً ۱۹۲۳ء کی بات ہے، اس وقت ایکسرے وغیرہ نایاب تھا، اس لئے آپریشن بھی کیسے کیا جاتا اور جسم کے کس حصہ میں کیا جاتا مجبوراً صبر کرنا پڑا۔ اس کے بعد میری ماں چار پانچ سال زندہ رہیں، لیکن جسم میں سوئی کی موجودگی سے انھیں کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔

میری ماں غریبوں کا دل دکھانا سب سے بڑا گناہ سمجھتی تھیں۔ گاؤں کے غریبوں کی وہ ہر طرح کی مالی امداد کیا کرتی تھیں۔ ان کے یہاں شادی بیاہ یا کوئی تقریب ہوتی تو میری ماں زیادہ تر اخراجات اپنے ذمہ لے لیتی تھیں۔ ہمارے گھر میں جب کبھی کوئی کھانے پینے کی چیز یا کھلونے وغیرہ آتے تو گھر میں موجود سارے بچوں کو وہ پہلے تقسیم کرتیں اور سب سے بعد میں ہماری باری آتی تھی۔

میرے ایک رشتے کے نانا قاضی انوار الحق صاحب قریب کی ایک تحصیل میں تحصیلدار مقرر ہوئے۔ شب برات میں جب وہ ہمارے گھر آئے تو بہت سی مٹھائی اور آتشبازی ساتھ لائے۔ ان کو دیکھ کر گاؤں کے سارے بچے میرے گھر میں جمع ہو گئے۔ میری ماں شب برات میں آتشبازی چھوڑنا پسند نہیں کرتی تھیں لیکن چونکہ ان کے ماموں لائے تھے، اس لئے ان کی دل شکنی بھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں انھوں نے ساری مٹھائی اور آتشبازی گاؤں کے تمام بچوں میں تقسیم کر دی۔ ہماری جب باری آئی تو بہت تھوڑی سی آتشبازی باقی رہ گئی تھی۔ میں اپنی ماں کا بڑا لاڈلا تھا، میں نے ضد کی کہ مجھے زیادہ آتشبازی ملنی چاہیئے۔ اس پر میری ماں نے وہ آتشبازی بھی مجھ سے واپس لے لی، جو مجھے ملی تھی۔ اس وقت تو مجھے بڑا دکھ ہوا لیکن بعد میں میری ماں نے مجھے سمجھایا کہ "بیٹے اللہ میاں ان بچوں کو پسند کرتے ہیں جو آتشبازی نہیں چھوڑتے"۔

میری ماں کو غرور بہت ناپسند تھا! اگر کبھی ہم کوئی ایسی باتیں کرتے جس سے ہماری بڑائی کا اظہار ہوتا تو وہ ہم سے توبہ کرایا کرتی تھیں۔ وہ ہمیں کبھی اچھا لباس نہیں پہنایا کرتی تھیں، وہ کہتیں کہ اس سے غریب بچوں کی دل شکنی ہوگی۔

ان میں احساس کمتری اور ہم میں احساس برتری اور غرور پیدا ہوگا۔ انھوں نے کبھی کسی کی دل آزاری گوارا نہیں کی۔ امیر و غریب کے فرق کو انھوں نے اپنے اخلاق اور رواداری سے دور کرنے کی ہمیشہ کوشش کی۔ خدمت خلق اور غریبوں کی دادرسی کو انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا شعار بنایا تھا۔

وہ بڑی خداترس خاتون تھیں۔ وہ ہمہ وقت خدا سے دعا کیا کرتی تھیں کہ وہ انھیں اور ان کے بچوں کو برائیوں سے محفوظ رکھے۔ وہ خدا سے دعا کرتی تھیں کہ خدایا میرے بچوں کو اتنا مال و دولت نہ دینا کہ وہ عیش و عشرت میں پڑکر تجھ سے اور مذہب سے غافل ہو جائیں۔" جب کبھی ہم کوئی غلط بات کرتے وہ ہم کو سرزنش کرتیں "بیٹا۔ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے" اور ہم سے توبہ کراتیں۔ مجھے یاد ہے ایک بار گاؤں کے ایک لڑکے سے جو میرے ساتھ پڑھتا تھا میری لڑائی ہوگئی۔ میں نے اسے ایک چپت رسید کردی۔ میری ماں کو معلوم ہوا تو وہ مجھ سے دن بھر خفا رہیں اور نہیں بولیں۔ شام کو میں جب ڈرتا ڈرتا ان کے پاس گیا تو انھوں نے کہا کہ تم نے اس غریب لڑکے کو تھپڑ مارا ہے۔ وہ خیال کرے گا کہ وہ غریب تھا، اس لئے مار کھا گیا۔ یہ بات خدا کو بہت بری معلوم ہوگی۔ اس لئے تم خدا سے توبہ کرو اور اس لڑکے سے میرے سامنے معافی مانگو۔" میں نے خدا سے توبہ کی اور میری ماں نے اپنے سامنے مجھ سے اس لڑکے سے معافی منگوائی اور مجھے اس کے گلے سے لگادیا۔

میری ماں نوکروں اور خادماؤں پر بہت مہربان رہتی تھیں۔ ان سے برابری کا سلوک کرتی تھیں۔ اور ہر طرح ان کی مالی امداد کیا کرتی تھیں۔ جب

کبھی میرے باپ نوکروں پر غصہ کرتے تو میری ماں انھیں ٹھنڈا کیا کرتی تھیں اور ان کی دلجوئی کرکے باپ کی سختی کا ازالہ کیا کرتی تھیں۔

سارے گاؤں میں میری ماں کا چرچا ہوا کرتا تھا۔ گاؤں والے ان کی بڑی عزت اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے۔ گاؤں کے سارے بچے اور غریب عورتیں ہمارے گھر میں دن رات بھری رہتی تھیں اور میری ماں کو یہ بات کبھی ناگوار نہیں گزرتی تھی۔ وہ اُن سے بہتر سے بہتر سلوک کرتیں اور بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتی تھیں۔ انھیں اسلام سے متعلق ہر قسم کی اچھی باتوں سے آگاہ کرتیں اور اپنی پاکباز زندگی سے اس کی ترجمانی کرتیں۔

ہندوستان میں جب خلافت کانگریس کی تحریک بڑے زور شور سے جاری تھی تو میرے باپ نے بھی اپنی تجارت اور زمینداری سے کنارہ کشی کر کے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کی وجہ سے انھیں بڑی مالی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ساری تجارت ٹھپ ہو گئی۔ برطانوی حکومت سے الگ لفت اٹھانی پڑی۔ روز یہی خدشہ رہتا تھا کہ میرے باپ گرفتار ہونے والے ہیں۔ سارے ضلع کا وہ طوفانی دورہ کرتے اور تقریریں کیا کرتے تھے۔ صوبائی خلافت کمیٹی کے وہ اہم رکن تھے۔ سارے ضلع فیض آباد کے ہندو مسلمان "خلیل میاں کی جے" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

میری ماں نے اس قومی کام میں ہمیشہ میرے باپ کی ہمت افزائی کی۔ انھوں نے مالی مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دیسی کپڑا پہننا شروع کیا۔ مجھے یاد ہے کہ خلافت کانگریس کی برطانوی حکومت سے عدم تعاون اور بدیسی کپڑے کی

بائیکاٹ کی تحریک میں میرے باپ نے گاؤں میں بدیسی کپڑوں کا ایک بڑا الاؤ روشن کیا۔ میری ماں نے بھی اپنے ریشمی کپڑے اس آگ کے نذر کر دیئے۔ خلافت تحریک کے سلسلے میں ترکوں کے لئے سارے ملک میں چندہ کیا گیا تو میری ماں نے اپنے زیور اس نیک مقصد کے لئے دے دیئے۔

میری ماں کی زندگی میں ہمارے گھر میں ایک بڑی تقریب ہوئی۔ ۱۹۲۲ء کی فروری میں میری دونوں بڑی بہنوں کی شادی میرے باپ نے بڑے دھوم دھام سے کی۔ ضلع کے سارے برادر وہ افراد اور ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر نے اس میں شرکت کی۔ قرب وجوار کے کسان بھی بڑی تعداد میں شادی کی تقریبات میں شریک ہوئے۔ سبھی کی بڑی فراخدلی سے تواضع کی گئی۔ میرے والد نے اپنا سارا اندوختہ اس تقریب میں صرف کر دیا۔

شادی کی اس تقریب کو اب تک وہاں کے لوگ یاد کرتے ہیں میری ماں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ لڑکیوں کی شادی ماں باپ کی سب سے بڑی تمنا اور ذمہ داری ہوا کرتی ہے اور اسی لئے انھیں اس کی بڑی فکر ہوا کرتی ہے۔ میری ماں اس بڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہوئی تھیں۔ انھیں بڑا اطمینان ہوا۔ دونوں داماد ان کی انتہائی عزت کرتے تھے، اور وہ بھی ان سے بڑی محبت سے پیش آتی تھیں۔

بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہو کر میری ماں زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر ان کی زندگی کا مشن پورا ہو گیا ہے۔ وہ بیمار رہنے لگیں اور ڈاکٹروں کے مشورے سے میرے باپ

انھیں مسوری لے گئے، جہاں سے وہ کافی تندرست ہوکر واپس ہوئیں۔ ہم لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ دوسرے سال میرے باپ اور دادی نے حج پر جانے کی تیاری کی۔ میری ماں بھی اپنی بیماری کے باوجود حج کرنے کے لئے تیار ہوگئیں۔ ایسے نیک کام کے لئے انھیں کون روک سکتا تھا۔ یہ سنہ ۱۹۲۶ء کی بات ہے گرمیوں کے زمانے میں حج پڑا تھا۔ اس زمانے کا حج بہت سخت ہوا کرتا تھا۔ بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعہ وہ جدہ پہنچیں۔ اسی جہاز سے مولانا محمد علی اور ان کی بیگم بھی حج کرنے تشریف لے گئی تھیں۔ میری ماں سے مولانا کی بیگم کی کافی صحبت رہی اور وہ بھی میری ماں کی اوصاف حمیدہ کی گرویدہ ہوگئیں۔ میرے والدان دونوں کی ملاقاتوں کے بڑے قصے سنایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کا سفر اونٹوں پر ہوتا تھا۔ حجاز کی گرمی اور وہاں کے اونٹ کے سفر کی وجہ سے میری ماں کا مرض عود کر آیا۔ وہ برابر بخار میں مبتلا رہیں۔ لیکن انھوں نے حج کے سارے ارکان بخیر و خوبی پورے کئے۔

حج سے فارغ ہوکر میرے والد کراچی ہوتے ہوئے کانپور پہنچے۔ میری ماں بہت بیمار تھیں۔ کانپور میں وہ علاج کی غرض سے ٹھہر گئیں۔ کانپور کے مشہور ڈاکٹر عبدالصمد صاحب نے مسوری میں میری ماں کا علاج کیا تھا اور ان سے میری ماں کو بڑی عقیدت تھی۔ ڈاکٹر عبدالصمد صاحب میری ماں کو بہن کہا کرتے تھے۔ میرے باپ نے تار دے کر ہم لوگوں کو کانپور بلوایا۔ ہم جب کانپور پہنچے تو میری ماں صاحب فراش تھیں۔ انھیں برابر بخار رہتا تھا۔ بہت کمزور ہوگئی تھیں۔ اس نقاہت کے باوجود ان کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔

نماز اور وظیفہ وہ برابر لیٹے لیٹے ادا کیا کرتی تھیں۔

ڈاکٹر عبد الصمد صاحب تقریباً روزانہ میری ماں کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ۳ ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء کے دن وہ بہت بہتر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب آئے تو وہ میرے والد سے کہنے لگے "آج بہن کی حالت بہت اچھی ہے۔" دن بھر وہ باتیں کرتی رہیں۔ آٹھ بجے رات کا وقت تھا۔ میری ماں کے سرہانے رکھی ہوئی بڑی میز پر بیٹھے میرے والد خاندان والوں کو میری ماں کے افاقہ کی بابت خط لکھ رہے تھے۔ ہم لوگ ملحقہ کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جس کے دروازے اماں کے کمرے میں کھلے ہوئے تھے اماں نے پانی مانگا۔ اشفاق ماموں نے بستر پر بٹھا کر انھیں پانی پلایا۔ میری ماں نے پانی پی کر الحمد اللہ کہا اور اس کے ساتھ ہی ہچکی آئی اور اس فرشتہ خصلت خاتون کی روح اپنے معبود حقیقی سے جا ملی۔ ہم لوگ سکتے میں رہ گئے۔ انھوں نے تو حج سے فارغ ہو کر راستے ہی میں شہادت کی موت پائی۔ لیکن ہم لوگوں کو ہمیشہ کے لئے سوگوار چھوڑ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا اپنے نیک بندوں کو اپنے پاس جلد بلا لیتا ہے مجھے سب سے زیادہ چاہنے والی ماں کی موت نے میری زندگی کو ہمیشہ کے لئے سوگوار بنا دیا، اور بقول شاعر

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

فرید جعفری

پاکستان کی انتہائی افسوسناک اور تیز رفتار زوال پذیری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں با صلاحیت اور ذہین افراد کی بڑی ناقدری ہوئی، اور اس نوزائیدہ مملکت کی تعمیر و ترقی میں انھیں اپنا کردار ادا کرنے کے مواقع فراہم نہیں کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے با صلاحیت افراد غیر ممالک میں اپنی قسمت آزمانے پر مجبور ہوئے جہاں جوہرِ کی قدر کی جاتی ہے، اور جہاں انھیں اہم منصبوں پر فائز کیا گیا۔ اور ان کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ استفادہ حاصل کیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد برصغیر کے مسلم اقلیتی صوبوں کے بہت سے با صلاحیت مسلمان اپنی "خوابوں کی جنت" پاکستان کو بسانے کے لیے یہاں آئے لیکن اِن کی جس طرح یہاں مٹی پلید ہوئی وہ طویل داستان ہے۔ ان میں سے بیشتر تو دل شکستہ

ہو کر یہاں پیوند خاک ہو گئے، اور متعدد افراد غیر ممالک کو مراجعت کر گئے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ پروفیسر الیاس احمد۔ ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی۔ قرۃ العین حیدر۔ مولوی عبد الحق۔ شاہد احمد دہلوی۔ استاد بندو خاں استاد بڑے غلام علی خاں۔ ڈاکٹر عشرت حسین زبیری۔ پروفیسر احمد علی۔ فیضی رحیمن عطیہ بیگم عباس خلیلی ظفر الاحسن۔ محمد شعیب۔ محمد ہاشم۔ جوش ملیح آبادی نیاز فتحپوری۔ ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ وغیرہ۔

پاکستان میں با صلاحیت افراد کی ناقدری کا ایک سبب یہاں کے برسر اقتدار افراد کی احساس کمتری اور مفاد پرستی میں مضمر ہے جو ایسے افراد کی آزاد خیالی اور بے باکی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ با صلاحیت افراد میں عموماً خوشامد پرستی کا مادّہ مفقود ہوتا ہے جو پاکستان کے برسر اقتدار طبقہ کی طبع ثانی بن چکا ہے اس کے علاوہ پاکستان میں کوٹہ سسٹم کے تحت بے صلاحیت اور غیر مستحق افراد کو انتخاب کی ضمانت دے دی گئی ہے۔ اور اس طرح یہاں با صلاحیت افراد کی قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے۔ بقول شخصے دنیا میں یہ تنہا ملک ہے جہاں گدھے اوپر چڑھتے چلے جاتے ہیں، اور گھوڑوں کو ایسی اگاڑی پچھاڑی لگا دی جاتی ہے کہ وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے۔ یہاں کوٹہ سسٹم کے تحت نالائق کو لائق پر بے صلاحیت کو با صلاحیت پر اور نااہل کو اہل پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک با صلاحیت حساس شخص اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ ایک نالائق افسر کے بے تکے احکام کی پابندی کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے آنے والے اور خود پاکستان میں پیدا ہونے والے با صلاحیت اور ذہین افراد زیادہ عرصہ

تک اس ملک خداداد میں ٹک نہ سکے۔ اور غیر ممالک میں قسمت آزمائی پر مجبور ہوئے
اپنے ملک میں ناقدری اور بے اعتنائی کے شکار ہونے والے متعدد افراد نے
غیر ممالک میں پاکستان کے نام کو روشن کیا۔ ڈاکٹر عبدالسلام۔ ڈاکٹر حمید اللہ
استاد بڑے غلام علی خاں۔ ڈاکٹر عترت حسین زبیری۔ قرۃ العین حیدر۔ ان
میں سے چند مثالیں ہیں۔

فرید جعفری کا شمار بھی پاکستان کے ذہین افراد میں ہوتا تھا۔ موصوف
اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے، لیکن قدرت نے انھیں انتہائی پرکشش
شگفتہ شخصیت اور گفتگو کرنے کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ وہ بڑی سے بڑی
شخصیتوں کو متاثر کرسکتے تھے، اور انھیں اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے، اس
لحاظ سے ان کا شمار پاکستان کے تعلقات عامہ کی کامیاب اور اعلیٰ ترین
شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ جس ملک میں وہ جاتے اور پاکستانی سفارت خانوں
کے پریس شعبہ کے سربراہ ہوتے تھے، وہاں کے ملکوں کے سربراہ ان
کے ذاتی دوست بن جاتے تھے۔ ان ممالک میں متعین پاکستانی سفیروں سے
کہیں زیادہ فرید جعفری کی پذیرائی ان ممالک کے اعلیٰ ترین حلقوں میں ہوتی
تھی۔ مصر کے صدر ناصر۔ شام کے سابق صدر اور آسٹریلیا کے سابق وزیراعظم
مینزیز ان کے ذاتی دوست تھے۔

یوں تو فرید جعفری سے میری بہت پرانی یاد اللہ تھی، اور قیام پاکستان
سے قبل بھی میں اُن سے خوب واقف تھا، لیکن ان کو قریب سے دیکھنے بلکہ ان
کے ساتھ کام کرنے کا موقع مجھے سنہ ۱۹۵۱ء میں ملا جب وہ انگریزی کے

روزنامے سول ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر تھے۔ اس زمانے میں پاکستان میں قومی زبان کا مسئلہ بہت شدت اختیار کر چکا تھا۔

مارچ سنہ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ میں قائد اعظم کے واضح ارشاد کے باوجود کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ اور جو لوگ اس کے خلاف سوچتے ہیں وہ پاکستان کے دشمن ہیں۔ قائد اعظم کے جانشینوں نے ان کے انتقال کے بعد زبان کے مسئلہ کو کھٹائی میں ڈال دیا۔ اور قائد اعظم کے ارشاد کو عملی جامہ نہیں پہنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں زبان کا مسئلہ رفتہ رفتہ شدت اختیار کرتا گیا۔ اور آخر کار جب قائد اعظم کے پرخلوص جانشین خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے قائد اعظم کے ارشاد کو عملی جامہ پہنانا چاہا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ زبان کے مسئلہ پر ڈھاکہ میں گولی چلانی پڑی اور انجام کار آگے چل کر پاکستان کی دو قومی زبانیں اردو اور بنگالی کو تسلیم کرنا پڑا۔

قومی زبان کے مسئلہ پر فرید جعفری نے اپنے اخبار میں اردو کی موافقت میں مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اردو کے موافقت میں جہاد کی منصوبہ بندی انھوں نے میرے سپرد کی۔ سول ملٹری گزٹ میں عرصہ دراز تک اردو زبان کی افادیت۔ ہمہ گیری اور تاریخی خدمات سے متعلق مضامین نکلتے رہے، اور ان میں زیادہ تر مضامین میں نے مختلف ناموں سے لکھے۔ سول ملٹری گزٹ کے علاوہ پاکستان کے بیشتر اخبارات نے پاکستان کے حصول میں اردو کی خدمات کو سراہا اور قائد اعظم کے ارشاد کے مطابق اسے پاکستان کی واحد قومی زبان

بنانے کی تلقین کی اور یہاں تک لکھا کہ اسلام کے بعد اردو ہی پاکستان کے مختلف علاقوں کو متحد رکھنے کا ذریعہ ہے، لیکن پاکستان پریس کی اس معاملہ میں چیخ و پکار بھینس کے آگے بین بجاؤ اور بھینس کھڑی جگالی کرتی جانے والی ہندی مثل کے مصداق ہوئی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، اور اس نے اردو کے بارے میں اسی سرد مہری سے کام لیا جس کی وجہ سے بنگالی زبان سے متعلق سورش زور پکڑ گئی۔ اور آخر کار ان کے مطالبہ کو آگے چل کر منظور کرنا پڑا۔

فرید جعفری میں جہاں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں چند کمزوریاں بھی تھیں وہ بڑی سیمابی اور جذباتی طبیعت کے مالک تھے۔ انھوں نے جہاں اپنی پرکشش شخصیت سے متعدد بڑے بڑے منصب حاصل کئے وہاں اپنی جذباتی فطرت کی بدولت ان میں سے بیشتر کو بہت جلد کھو دیا۔ پاکستانی صحافیوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جسے اتنے مواقع حاصل ہوئے ہوں جتنے فرید جعفری کو حاصل ہوئے۔

سول ملٹری گزٹ کراچی کے پریس میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سفارتخانہ کا انگریزی جریدہ پنوراما (PANORAMA) چھپتا تھا جس سے اخبار کو کافی مالی منافع تھا۔ فرید جعفری صاحب کو ایک بار غصہ آیا اور انھوں نے امریکہ کے خلاف ایک بہت سخت اداریہ لکھ مارا۔ جس کی بنا پر امریکی سفارت خانے نے پنوراما کو سول ملٹری گزٹ کے پریس میں چھپانا بند کر دیا۔ اس سے اخبار مالی مشکلات میں مبتلا ہو کر ڈوب گیا۔ اسی درمیان میں فرید جعفری صاحب نے مولویوں کے خلاف اور شراب کے موافقت میں بھی دو ایک اداریئے لکھ دیئے۔ اس زمانے

میں پاکستان اور خصوصاً کراچی میں مولویوں کا بڑا زور تھا۔ جعفری صاحب کو متعدد بار دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے جس کی وجہ سے ان کا باہر نکلنا دشوار ہو گیا اور وہ خانہ نشین ہو گئے۔ ایک دن میں سول ملٹری گزٹ کے دفتر پہنچا تو دیکھا دو پٹھان فرید جعفری کے کمرے کے سامنے پہرہ دے رہے ہیں۔ میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو پٹھانوں نے روکا۔ کہا کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں روز کا آنے والا ہوں۔ ایک پٹھان نے کہا کہ تم اپنا کارڈ دو ہم جعفری صاحب کو دے گا۔ وہ جب بلائے گا تو تم اندر جائے گا۔ میں نے کارڈ دے دیا۔ فوراً اندر بلا لیا گیا۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "فرید بھائی یہ چوکی پہرہ کیسا؟" کہنے لگے کہ "بھائی جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی ہے۔" دو ہفتہ بعد اخبار بند ہو گیا تو جعفری لندن مراجعت کر گئے۔

فرید جعفری کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کبھی وہ کسی ملازمت سے سبکدوش ہوتے تھے تو بیکاری کے ایام لندن میں گزارتے تھے۔ وہاں انہیں سہولت بھی تھی۔ بی بی سی اور اخباری مضامین سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔

اس سے کچھ عرصہ ہی بعد پاکستان کے افق پر نئی تبدیلیوں کے آثار نمایاں ہوئے، گورنر جنرل غلام محمد نے ناظم الدین وزارت کو برطرف کر دیا۔ اور محمد علی بوگرا کو وزارت عظمیٰ کے منصب جلیلہ پر فائز کر دیا۔ محمد علی بوگرا سے فرید جعفری کی ملاقات لندن میں ہوئی تھی۔ بوگرا صاحب نے فرید جعفری کو اپنے افسر تعلقات عامہ کے منصب جلیلہ کی پیش کش کی جسے انھوں نے منظور کر لی۔ فرید جعفری دوبارہ کراچی میں وارد ہوئے اور بڑی کامیابی سے محمد علی بوگرا کے افسر تعلقات عامہ کے فرائض

سرانجام دینے لگے۔ اسی زمانے میں یہ بات محسوس کی گئی کہ مسلم لیگ کا ایک آرگن (اخبار) جاری کیا جائے جو حسین شہید سہروردی اور ان کی پارٹی عوامی لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا مقابلہ کر سکے۔ فرید جعفری کو یہ کام تفویض کیا گیا۔ اور مسلم لیگ کے غالباً چودہ لاکھ روپے کے سرمایہ سے مسلم لیگ کا انگریزی روزنامہ پاکستان اسٹینڈرڈ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ نکالا گیا۔

اس اخبار کے بڑھے ہوئے اخراجات اور اس کی انتظامیہ کی ریشہ دوانیوں اور اصراف بیجا نے ایک ہی سال میں اس کا دیوالیہ نکال دیا اور چودہ لاکھ میں سے تقریباً ساری رقم ایک ہی سال میں خرد برد ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایڈیٹر اور منیجر میں ایسی چلی کہ ایک دن منیجر صاحب نے ایڈیٹر صاحب کو ان کی کرسی سے اٹھوا کر کمرہ کے باہر پھنکوا دیا۔ اخبار بند ہو گیا، اور فرید جعفری نے لندن میں جا کر پناہ لی۔

پاکستان کے سیاسی افق پر تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ سیاسی رسہ کشی تیز سے تیز تر ہو گئی تھی۔ پاکستان کے مفلوج گورنر جنرل غلام محمد صاحب نے پاکستان دستور اسمبلی کو بھی توڑ دیا تھا۔ جس کی بنا پر سپریم کورٹ تک مقدمہ بازی کی نوبت آئی۔ محمد علی بوگرا آخر کار وزارت عظمیٰ سے رخصت کر دئے گئے اور اس کرسی پر چودھری محمد علی براجمان ہوئے جنھوں نے مارچ سنہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کو پہلا دستور دیا۔

فرید جعفری کو دوبارہ اہم سرکاری منصب پر فائز کیا گیا اور مشرق وسطیٰ میں پاکستان کے پبلسٹی ڈائرکٹر بنا کر وہ بیروت میں متعین کیے گئے۔ جلد ہی فرید جعفری

نے شام، عراق، لبنان کے صدر اور خصوصاً مصر کے صدر ناصر سے ذاتی تعلقات قائم کر لئے۔ ان ممالک میں متعین پاکستانی سفراء سے کہیں زیادہ فرید جعفری کی پذیرائی ان ممالک کے اعلیٰ ترین سرکاری حلقوں میں ہوتی تھی۔ ستمبر سنہ ۱۹۵۶ء میں حسین شہید سہروردی پاکستان کی وزارت عظمیٰ پر متمکن ہوئے تھے جو پاکستان کے عظیم ترین سیاست داں تھے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد نہر سوئز کا بحران پیش آیا۔ صدر ناصر نے برطانیہ اور فرانس کو نہر سوئز کے علاقہ سے نکال باہر کیا۔ جس پر ان ممالک نے مصر پر حملہ کر دیا۔ لیکن روس کی مداخلت سے ان دونوں ممالک کو نہر سوئز کے علاقے سے اپنا بوریہ بستر سنبھال کر رخصت ہونا پڑا۔ سہروردی صاحب نے برطانوی نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ لیکن فرید جعفری صاحب نے صدر ناصر کی حمایت میں ایک طویل بیان جاری کر دیا جس کی بنا پر انھیں پاکستان کی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

وہاں سے انھوں نے لندن کا رخ کیا۔ لیکن زیادہ عرصہ تک بیکار نہیں رہے۔ جلد ہی آسٹریلیا میں پاکستان کے پریس اتاچی بنا کر بھیج دیئے گئے۔ ان کے لئے غالباً اس جگہ کو اونچا کر دیا گیا اور اس جگہ کو واشنگٹن میں پریس اتاچی کی جگہ کے برابر کر دیا گیا۔

اکتوبر سنہ ۱۹۵۸ء میں جب پاکستان میں ایوب خاں برسر اقتدار آئے تو جن ممالک میں پریس اتاچی کی جگہ ختم کر دی گئی۔ ان میں آسٹریلیا بھی شامل تھا فرید جعفری کراچی آ گئے۔ ایوب خاں کے ابتدائی دور میں ان کے خود ساختہ انقلاب کے روحِ رواں بریگیڈیر ایف آر خان وزارت اطلاعات اور نشریات کے

سکریٹری تھے۔ فرید جعفری اُن سے ملنے گئے۔ ان سے مل کر واپس آئے تو پریس انفارمیشن ڈپارٹمنٹ ہی میں انھوں نے سکریٹری صاحب سے ملاقات کی روداد سنائی۔ فرید جعفری نے خاں صاحب کو بتایا کہ جب ایوب خاں برسر اقتدار آئے تو انھوں نے ایک پریس کانفرنس طلب کی۔ جس میں آسٹریلیا کے بیشتر اخباروں کے نمائندے شریک ہوئے فرید جعفری نے ایک تقریر کی جس میں پاکستان کی گزشتہ وزارتوں پر کڑی تنقید کی اور ان کی خرابیوں کو بے نقاب کیا اور نئی حکومت کو بہت سراہا۔ جب تقریر ختم ہوئی تو وہاں کے ایک مشہور اخبار کا ایک جہاں دیدہ نمائندہ کھڑا ہوا ان سے پوچھا۔ "جعفری صاحب یہ آپ کی کونسی وزارتی حکومت ہے؟" فرید جعفری نے جواب دیا۔ "آٹھویں۔" نامہ نگار نے اس پر طنزیہ لہجہ میں فرمایا: "جعفری صاحب معاف کیجئے گا، آپ نے جو اس وقت تقریر کی ہے وہی ہم سات بار پہلے سن چکے ہیں، جب آپ کے یہاں کوئی نئی وزارت برسر اقتدار آتی ہے تو آپ پچھلی وزارت کی بہت برائی کرتے اور نئی وزارت سے خواہ مخواہ بڑی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ تو ہم کیسے فرض کر لیں کہ ایوب خاں کی وزارت کو ختم ہو جانے کے بعد آپ اس کو گالی نہیں دیں گے۔" جعفری صاحب کے پاس اس حقیقت افروز بیان کا کوئی جواب نہ تھا۔ جعفری صاحب کی باتیں سُن کر بریگیڈیر ایف آر خاں جو اس وقت ایوب خاں کے نفس ناطقہ تھے قدرے چیں بہ جبیں ہوئے اور انھوں نے ذرا اکڑ کر کہا: (ترش رو لہجے میں) "مسٹر جعفری آپ کراچی میں ذرا نکل کر دیکھیں آپ کو تبدیلی خود نظر آجائے گی۔" ان کا مطلب سڑکوں اور مکانوں کی دیواروں کی صفائی سے تھا جس پر ایوب خاں کے ابتدائی دَور میں سختی سے عمل کرایا گیا تھا۔

اس کے بعد فرید جعفری متعدد اہم منصبوں پر فائز ہوئے۔ ایوب خاں کے وزیر خارجہ منظور قادر نے انھیں عراق میں ایک اہم سفارتی منصب پر فائز کیا۔ یہ ملازمت تین سال کے لئے تھی۔ مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ پھر لندن مراجعت کر گئے۔ ایوب خاں کے آخری دور میں وہ فینسی گروپ کے تعلقات عامہ کے مشیر اور بعد ازاں پاکستان نیشنل آئل میں بھی اسی قسم کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس دوران میں ایک بار تو نائیجریا میں انھیں پاکستان کا ہائی کمشنر بنانے کا اعلان بھی اخبارات میں شائع ہو گیا تھا لیکن خدا جانے کہاں سے یہ بات ٹوٹ گئی۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرید جعفری نے انگلستان میں بنگلادیش کی نشر و اشاعت میں نمایاں حصہ لیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ پاکستان نے فرید جعفری جیسے تعلقات عامہ کے افراد بہت کم پیدا کئے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ آخری عمر میں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے غیروں نے فائدہ اٹھایا۔

آخرکار ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۷۲ء کو شرافت اور شگفتگی کا یہ جیتا جاگتا پیکر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مزاحیہ خاکے

مولانا نامی

الہ آباد یونیورسٹی کے فارغ التحصیل طلباء میں مولانا نامی کے لطیفے زبان زد خاص و عام ہیں۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد کے طلبائے جنھوں نے شاید مولانا نامی کو نہیں دیکھا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی اولڈ بوائز کے اجتماعات میں اپنے پیشروؤں سے مولانا نامی کے لطیفے سن کر ان کی خیالی تصویر اپنے ذہنوں میں مرتب کر لی ہے، اور وہ ان لطیفوں سے اسی حد تک لطف اندوز ہوتے ہیں جتنا کہ ان کے پیشرو محظوظ ہوئے ہیں۔

مولانا نامی کی باتیں تو الگ رہیں، مولانا کی ذات خود ایک انجمن تھی، کوئی شخص جو ان سے ملتا وہ مسکرائے بغیر نہیں رہتا۔ اور مولانا نے اگر کسی لطیفے سے اس کی تواضع کر دی یا کوئی پھبتی اس پر چست کر دی، پھر تو یہ مسکراہٹ قہقہہ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ مولانا کا حلیہ عجیب و غریب تھا۔ چھوٹے قد کے آدمی۔ اس پر گرد اور داڑھی۔ بڑی مہری کا پائجامہ۔ شیروانی اور گول ترکی ٹوپی زیب تن کئے وہ حسرت موہانی معلوم ہوتے

تھے اور جب وہ اپنی ٹم ٹم پر گھوڑے کی لگام تھامے برآمد ہوتے تو مسلم بورڈنگ ہاؤس کے شریر لڑکے کمروں سے نکل آتے اور مولانا لڑکوں پر پھبتیاں کستے اور جملوں کے تیر برساتے روانہ ہو جاتے۔

مولانا نامی الہ آباد یونیورسٹی میں فارسی کے استاد اور یونیورسٹی کی مسلم بورڈنگ ہاؤس کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ہوسٹل سے متصل ایک مکان میں قیام پذیر تھے۔ ان کے مکان میں کوئی اگر باہر سے داخل ہوتا تو سب سے پہلے اُسے مولانا کی ٹم ٹم نظر آتی اور ان کے گھوڑے سے ملاقات ہوتی۔

مولانا بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ وہ اپنی بذلہ سنجی میں چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتے تھے، اور چو طرفہ تیر برساتے تھے۔ کوئی بھی اس کی زد میں آجائے۔ اسی لئے یونیورسٹی اور خصوصاً مسلم بورڈنگ ہاؤس کے طلباء ان سے بڑے بے تکلف ہو گئے تھے۔

مولانا پستہ قد کے بزرگ تھے۔ ان کا حلیہ بڑا مضحکہ خیز تھا۔ وہ جُھک جُھک کرتے ہوئے کبوتر کی طرح پُھدکتے چلتے تھے۔ مولانا لڑکوں کے جوابی جملوں کو برا نہیں مانتے تھے۔

مسلم بورڈنگ میں ایک بھاری بھرکم صاحب بہادر قسم کے طالب علم تھے۔ جن سے مولانا کی اکثر چوٹیں ہوا کرتی تھیں۔ یہ صاحب بہادر سگریٹ ہولڈر لائے اور سگریٹ اس میں لگا کر بڑی شان سے پی رہے تھے۔ اتفاق سے مولانا کا ادھر سے گزر ہوا۔ بھلا اس منظر کو دیکھ کر مولانا کب خاموش رہ سکتے تھے۔ کہنے لگے صاحب بہادر ماؤتھ انیما لے رہے ہیں۔ صاحب بہادر نے مولانا کے اس مضحکہ خیز جملے پر

اتنے زور کا بیساختہ قہقہہ لگایا کہ سگریٹ ہولڈر منہ سے نکل کر دور جا پڑا۔ اس پر مولانا نے پلٹ کر دیکھا اور کہا، اچھا اینما سے فارغ ہو گئے۔

بورڈنگ ہاؤس میں بدایوں کے ایک طالب علم قاضی مجتبیٰ رہا کرتے تھے جو پستہ قد شکل وصورت کے اچھے کلین شیو تھے۔ مولانا نے ازراہ تمسخر ان کا نام پوچھا۔ اور نام معلوم کر کے مسکرا کر کہنے لگے اچھا تو آپ زنانی بھی ہیں اور جانی بھی۔

مولانا ٹم ٹم پر سواری کرتے تھے۔ اور خود ہی اس کو چلایا کرتے تھے۔ ایک طالب علم کی جوان سے کافی بے تکلف تھے۔ مولانا سے مڈبھیڑ اس وقت ہو گئی جب وہ اپنی ٹم ٹم پر سوار ہو کر روانہ ہو رہے تھے۔ صاحبزادے کہنے لگے: "آپ کیا ٹم ٹم پر ٹک ٹک کرتے چلتے ہیں۔ موٹر لیجیے موٹر۔" مولانا نے بیساختہ کہا۔ "میں موٹا کہاں ہوں کہ موٹر پر سواری کروں۔ پتلا دبلا آدمی ہوں میرے لئے تو پتلر ہی ٹھیک ہے۔"

مولانا نامی الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں ریڈر تھے۔ اس شعبہ کی توسیع ہوئی تو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو ڈھاکہ یونیورسٹی سے بلا کر الہ آباد یونیورسٹی میں فارسی عربی شعبہ کا صدر مقرر کیا گیا۔ جب طلباء کو معلوم ہوا تو انھوں نے مولانا سے کہا: "مولانا آپ اتنے دنوں سے ریڈر ہیں۔ آپ کو شعبہ کا صدر بنا دیا جاتا تو کون سی قیامت آجاتی۔" مولانا نے قدرے مغموم لہجے میں جواب دیا: "ڈاکٹر صدیقی لندن پلٹ ہیں اور میں انڈین پلٹ میرا ان کا کیا مقابلہ۔" پھر کہنے لگے "فی الحال تو میں ریڈر ہوں اگر یونیورسٹی کے سربراہان مجھے پرائمر

بنا دیں تو میں ان کا کیا کر لوں گا"۔

مولانا چلتے بازی ہیں چھوٹے بڑے۔ مجلس اور محفل کا لحاظ نہیں کرتے تھے۔ ان کی نوک جھونک کے لئے کسی موقع یا محل کی پابندی نہیں تھی۔ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ شہر کے زعماء۔ طلباء، یونیورسٹی کے پروفیسر سبھی شریک مجلس تھے۔ سر شاہ محمد سلیمان بھی تشریف رکھتے تھے۔ نکاح کا وقت آیا تو مہر کا معاملہ درپیش ہوا۔ مولانا نے مہر کے لئے بڑی رقم مقرر کرانی چاہی۔ دولھا کے والد کہیں چلے گئے تھے۔ دولھا نے کہا انھیں آجانے دیں۔ ان سے میں پوچھ لوں۔ اس پر مولانا نے بلسیاختہ کہا۔ "میاں اب تم بالغ ہو کہاں کہاں اپنے والد سے اجازت لیتے رہوگے"۔ اس پر ساری محفل زعفران زار ہو گئی اور دولھا میاں شرم سے پانی پانی ہو گئے۔

مسلم بورڈنگ ہاؤس میں ایک طالب علم مسٹر کمال تھے جو بعد ازاں پاکستان کے ایک بڑے عہدہ دار ہوئے۔ وہ شکل و صورت کے بہت اچھے تھے۔ اور ڈراموں میں اکثر زنانہ پارٹ کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے طالب علم احمد خاں جن سے مولانا کی کافی نونک جھوک رہتی تھی ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا گیا کہ رات میں ان کے یہاں لڑکیاں آتی ہیں۔ مولانا تک یہ خبر پہنچائی گئی۔ ایک رات لڑکوں کو شرارت سوجھی۔ مسٹر کمال کو عورتوں کا لباس پہنا کر احمد خاں کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ ایک لڑکے نے چپکے سے جا کر مولانا کو خبر کی۔ "مولانا آپ خود چل کر دیکھ لیں۔ احمد خاں کے کمرے میں"۔ مولانا تو اسی تاک میں تھے، فوراً تیار ہو گئے۔ وہ لڑکا انھیں پہلے چھت پر لے گیا اور روشن دان سے مولانا نے احمد خاں کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تو ایک بہت خوب صورت عورت کو

بستر پر دراز پایا۔ کہنے لگے "ہے تو اچھی" احمد خاں کی خبر لینے کے لئے نیچے اترے اور دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کی کنڈی کھول کر احمد خاں دوسرے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مولانا کمرے میں داخل ہوئے تو مسٹر کمال نے گھونگھٹ نکال کر پشت مولانا کی جانب کرلی۔ مولانا کہنے لگے "نیک بخت یہ بورڈنگ ہاؤس ہے، کیوں لڑکوں کو خراب کرتی ہو" اس پر باہر سے قہقہہ کی آواز آئی اور مسٹر کمال بھی اپنی ساڑی پھینک کر مولانا کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ شاید زندگی میں پہلی بار مولانا کو شرمندگی ہوئی۔ وہ چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

مسلم بورڈنگ میں بجلی کے پنکھے نہیں تھے۔ جو طلبا اپنے پنکھے استعمال کرتے تھے، انھیں پانچ روپے ماہوار برقی قوت کا بل ادا کرنا پڑتا تھا۔ اکثر لڑکے پنکھے استعمال کرتے تھے لیکن پانچ روپے ماہوار ادا نہیں کرتے تھے مولانا اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ کون لڑکے چوری چوری برقی پنکھے استعمال کرتے ہیں۔ انھیں طلبا میں سے ایک عثمان صاحب تھے جو بعد از آں ہندوستان میں بریگیڈیر کے عہدے پر فائز ہوئے، وہ چھت پر ایک ایسے کمرے میں رہتے تھے جہاں سے مولانا نامی کا دفتر نظر آتا تھا۔ رات میں جب وہ صحن میں پڑھتے تو پنکھا استعمال کرتے، جب وہ دیکھتے کہ مولانا آرہے ہیں تو پنکھا ایسا چھپا دیتے کہ ڈھونڈھنے پر بھی مولانا کو نہیں ملتا تھا۔ اس پر عثمان صاحب سے مولانا بہت ناراض رہتے تھے۔ اور ان کو عثمان بے ایمان اور شیطان کہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے طالب علم جو شدید تھے اور عثمان صاحب کے پڑوسی تھے، مولانا سے کافی بے تکلف تھے۔ ایک شب کو جب مولانا زینے پر چڑھ

چڑھ رہے تھے اور یہ اتر رہے تھے کہ مٹ بھیڑ ہوگئی، مولانا نے جھٹ کہا، کہ "شیعہ بڑے جھوٹے دغاباز ہوتے ہیں۔" اس پر انھوں نے جواب دیا کہ "آپ بھی تو شیعہ ہیں، اور تبرائی شیعہ ہیں۔" مولانا نے لاحول پڑھا۔ اس پر ان صاحب نے جواب دیا کہ آپ عثمان کے نام کے ساتھ بے ایمان اور شیطان کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تبرا نہیں تو اور کیا ہے؟" مولانا لاجواب ہو گئے۔

الہ آباد میں ایک ریٹائرڈ جج سر عبدالرؤف تھے۔ جو اپنی کنجوسی اور خساست کے لئے سارے شہر میں مشہور تھے۔ وہ کسی کو پانی کے لئے بھی نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ کوئی اگر صبح کو ان کا چہرہ دیکھ لے تو دن بھر اُسے کھانا نصیب نہ ہوگا۔ وہ مولانا نامی کے بڑے دوست تھے۔ جب کبھی مولانا ان کے یہاں دو چار گھنٹے کے لئے جاتے تو اپنا کھانا ناشتہ دان میں ساتھ لے جاتے تھے۔

سر عبدالرؤف کے کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے پاس بڑی دولت ہے۔ ایک بار مولانا سے ایک بے تکلف طالب علم نے پوچھا "مولانا آپ سر عبدالرؤف کے اتنے دلارے ہیں۔ وہ لاولد ہیں، آپ کو گود کیوں نہیں لے لیتے۔" مولانا برجستہ جواب دیا "گود میں لیا تو تھا لیکن میں پھسل گیا۔"

مولانا کے لطیفوں سے ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ان میں سے متعدد لطیفوں میں ابتذال پایا جاتا ہے اس لئے انھیں نقل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مولانا سے ایک طالب علم نے دریافت کیا کہ مولانا آپ کے کتنے

بھائی ہیں۔ مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ "تین"۔ طالب علم نے پوچھا، ان کے کیا نام ہیں۔ مولانا نے جواب دیا۔ "نامی اور گرامی"۔ طالب علم نے پھر سوال کیا۔ "تیسرے کا نام آپ نے نہیں بتایا"۔ مولانا نے بلا جھجک کہا۔ "حرامی سمجھ لیجئے"۔

مولانا نامی طالب علموں کے سچے بہی خواہ اور دوست تھے۔ وہ کبھی کسی طالب علم پر خفا نہیں ہوتے تھے۔ وہ طلباء سے بے تکلف تھے، اور ان پر جملہ بازی کرتے تھے، اور طلباء کے جملوں اور مذاق کو برا نہیں مانتے تھے، اور خندہ پیشانی سے اسے برداشت کرتے تھے۔ وہ ایک قابل اور شفیق استاد تھے، اور طلباء میں بہت مقبول تھے۔

ڈاکٹر حفیظ سیّد

قیام پاکستان سے قبل جب میں الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے فرسٹ ایر کے طالب علم کی حیثیت سے اردو کے کلاس میں داخل ہوا تو میں نے استاد کی کرسی پر ایک "رومن، دانشور" قسم کے آدمی کو جلوہ افروز پایا، جو اپنے کلین شیو، گنجے سر پر عقبی پٹے۔ چیچک رد چہرہ۔ ستواں ناک۔ آنکھوں پر سنہری کمانی کا چشمہ۔ بات کرنے میں کھڑکھڑاتے ہوئے مصنوعی دانت اور فرسٹ کلاس سوٹ کی وجہ سے اردو کے استاد کے بجائے کسی مغربی یونیورسٹی۔ آکسفورڈ یا کیمبرج کے پروفیسر معلوم ہوتے تھے۔

میرے ذہن میں فارسی اردو کے استاد کا تصور بالکل مختلف تھا۔ اس میں شیروانی اور پائجامہ کے ساتھ ساتھ سر پر ٹوپی اور داڑھی بھی شامل تھی۔ حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں جب میں نویں درجہ کا طالب علم تھا تو فارسی کے استاد مولانا حامد حسن قادری مرحوم کی جگہ پر مولوی طاہر فاروقی صاحب کا تقرر ہوا تو اسکول کے اساتذہ اور طلبا، انھیں بڑے تعجب کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ کیونکہ

عام نظریئے کے خلاف وہ ایک ماڈرن مولوی تھے۔ شیروانی اور پائجامہ وہ ضرور پہنتے تھے لیکن ان کی فرنچ داڑھی برائے بیت تھی، اور طلباء کے ساتھ کھیل کود میں بھی وہ حصہ لیتے تھے، بلکہ کرکٹ کافی اچھی کھیلتے تھے۔ طلباء کو مولوی طاہر فاروقی صاحب کی یہ باتیں کچھ عجیب سی لگتی تھیں، اور ہمارے ذہنوں کے روایتی مولوی کے تصور سے یہ بالکل مختلف تھیں۔

ہمارے اردو کے استاد ڈاکٹر حفیظ سید اردو فلسفہ کے ڈبل پی۔ ایچ ڈی (ڈاکٹر) تھے۔ اس زمانے میں فلسفہ کے ڈاکٹر تو بہت تھے لیکن اردو لٹریچر کے ڈاکٹر نایاب تھے۔ مجھے جہاں تک یاد ہے۔ علی گڑھ۔ لکھنؤ، اور الہ آباد یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں میں کوئی بھی ڈاکٹر نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر حفیظ سید احساس برتری کے مرض میں مبتلا تھے اور ہمیشہ اپنے متعلق شیخی بگھارتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ طلباء بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائیں اور اگر کوئی اُن سے اختلاف کرتا تو چڑھ جاتے تھے۔ فلسفہ کی تعلیم نے انھیں سنکی اور تنک مزاج بنا دیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ طلباء پر برس پڑتے تھے اور اردو مڈل کے استادوں کی طرح طلباء کی سرزنش کرتے تھے۔ فلسفہ نے انھیں چڑچڑا بنا دیا تھا۔

ان کی تنک مزاجی کی ایک اور بھی وجہ تھی۔ ان کے شعبہ اردو کے صدر سید ضامن علی تھے جو اردو کے ایم اے بھی نہ تھے۔ فارسی کے سکنڈ کلاس ایم اے تھے۔ لیکن اپنے جوڑ توڑ اور برسر اقتدار خاندان کی چاپلوسی کی وجہ سے وہ اردو کے صدر شعبہ ہو گئے تھے۔ اس بات نے ڈاکٹر حفیظ سید کو اور بھی چراغ پا کر دیا تھا کہ ایک غیر مستحق اور ان سے کہیں کم تعلیم یافتہ شخص اپنی چالاکی اور چاپلوسی سے ان کے شعبہ کا

صدر بن گیا تھا۔ ڈاکٹر حفیظ سید بجا طور پر اسے اپنی حق تلفی تصور کرتے تھے اور یہی وجہ تھی جس نے انھیں ضامن علی صاحب اور ان کے ساتھی اعجاز صاحب کے خلاف صف آرا کر دیا تھا۔

ضامن صاحب بھی پکے "استاد" تھے۔ وہ پڑھاتے وڑھاتے تو خاک نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے اپنے اخلاق اور حکمت عملیوں سے شعبۂ اردو کے طلباء کے بڑے حصہ کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر حفیظ سید کے حمایتوں میں بھی طلباء کا ایک گروہ تھا جو ان کی حق تلفیوں کی وجہ سے ان کا ہمدرد بن گیا تھا۔ اس طرح شعبۂ اردو میں طلباء کے دو گروہ پیدا ہو گئے تھے جس میں بڑے گروہ کے سرپرست ضامن علی اور اعجاز صاحبان تھے۔ اور چھوٹے گروہ کے ممدوح ڈاکٹر حفیظ سید تھے۔

الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی یہ چپقلش ڈاکٹر حفیظ سید کے کلاس میں بہت نمایاں رہتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا زیادہ وقت اپنی برتری اور ضامن اعجاز پارٹی کی کمتری کو ثابت کرنے میں گزرتا تھا۔ اکثر اوقات طلباء میں بحث و تکرار کی نوبت پہنچ جاتی تھی، اور آخر کار ڈاکٹر حفیظ سید بڑی مشکل سے کلاس پر قابو پاتے تھے۔ اس کے لئے وہ اردو مڈل کے اساتذہ کے طریقے استعمال کرتے تھے۔ جس سے سمجھ دار طلباء کبھی کبھی ان سے خفا ہو کر کلاس سے باہر نکل جاتے تھے۔

ڈاکٹر حفیظ سید بہت بھونڈے اور اکھڑ پن سے طلباء کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے، انھیں طلباء کو اپنانا نہیں آتا تھا۔ اس کے برخلاف

ضامن اور اعجاز صاحبان اپنے فن کے ماہر تھے وہ طلباء سے کھلم کھلا ڈاکٹر حفیظ سید کی برائی نہیں کرتے تھے لیکن ایسی باتیں کہہ جاتے جن سے ڈاکٹر صاحب سے متعلق طلباء کے دل میں شکوک پیدا ہو جاتے اور وہ ضامن اور اعجاز صاحبان کو زیادہ ہمدرد اور بہی خواہ تصور کرنے لگتے۔ ڈاکٹر حفیظ سید کی خودستائی اور اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی عادت نے انھیں طلباء میں کافی غیر مقبول بنا دیا تھا۔ ان کی خودستائی اور تنک مزاجی کبھی کبھی طلباء سے تلخ گفتگو کا باعث ہوا کرتی تھی۔

ڈاکٹر حفیظ سید جو ابتدا میں شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور بعد میں سنی ہو گئے تھے درحقیقت تھوسوفسٹ تھے۔ کسی زمانے میں انھوں نے شادی کی تھی۔ لیکن عرصہ دراز سے بیوی سے قطع تعلق ہو گیا تھا۔ اور بھا پھا مئو کے ایک بنگلے میں تنہا زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا گھر ایک عجائب خانہ تھا۔ ان کے بڑے کمرے میں سارے مذاہب کے رہنماؤں اور قائدین گوتم بدھ جین۔ حضرت عیسیٰ۔ مہاتما گاندھی۔ زرتشت۔ گوکھلے۔ اینی بسنت کارل مارکس وغیرہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نجی کتب خانے میں مختلف موضوعات اور ہر مذہب سے متعلق کتابیں موجود تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا اور ان کا کتب خانہ ہر قسم کی جدید کتابوں سے مزین تھا۔ کوئی اچھی کتاب شائع ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے کتب خانے میں ضرور موجود ہوتی۔

ڈاکٹر حفیظ سید گوشت مچھلی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ غالباً انڈے

سے بھی شوق نہیں کرتے تھے۔ ان کا باورچی ایک ہندو لڑکا اور بیرا بھی ہندو تھا۔ وہ زیادہ تر ساگ بھاجی اور ترکاری پھل سے شکم پُری کرتے تھے۔ ان کی ان خصوصیات کی بنا پر ہندو پروفیسروں اور الہ آباد کے معزز ہندو گھرانوں میں ڈاکٹر صاحب کی کافی مان دان تھی۔ لیکن اپنی تنک مزاجی اور ذکی الحسی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو دوست بنانے اور اس سے دوستی نبھانے کا فن نہیں آتا تھا۔ اسی لئے ان کے مداح ان سے گھبراتے تھے اور زیادہ عرصہ تک ان سے منسلک رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اکثر اوقات تو ڈاکٹر صاحب پر جب سنک سوار ہوتی تو اپنے مداحوں اور ہمدردوں کی بھی خوب خبر لیتے اور بُری طرح حجامت بناتے تھے۔ ایسی حالت میں خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ جواب دینے کی صورت میں ڈاکٹر صاحب کا غصہ اور بھی زیادہ تیز ہو جاتا تھا اور پھر وہ سارے آداب مجلس کو بالائے طاق رکھ کر اس پر برس پڑتے تھے، اسی لئے ڈاکٹر صاحب سے ان کے دوست دشمن۔ ان کے حمائتیں اور مخالفین سبھی گھبراتے تھے۔

شعبۂ اردو فارسی کے اساتذہ پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر حفیظ لیڈر اخبار میں انگریزی مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کا موضوع اردو ادب اور فلسفہ ہوا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر حفیظ اردو کے مقابلہ میں انگریزی بہتر لکھتے تھے اور ان کے مضامین جسے وہ بہت تیاری کر کے لکھا کرتے تھے کافی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ ان مضامین کی وجہ سے وہ کافی بڑے حلقہ سے متعارف ہو گئے تھے۔ ان کی اس خصوصیت اور برتری سے شعبہ اردو میں ان کے مخالفین ان سے دبتے تھے لیکن اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے ان کے

پاس کوئی علاج نہیں تھا اور نہ ان میں اتنی اہلیت تھی کہ وہ بھی اسی قسم کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں لکھتے۔

ڈاکٹر حفیظ سید جب کبھی ترنگ میں آتے تو قیام یورپ کے قصے مزے لے لے کر کلاس میں سناتے تھے جس میں قیام پیرس کا ذکر بھی آتا تھا۔ اس میں زیادہ تر مغربی دانشوروں اور فلسفیوں سے ملاقاتوں کے تذکرے ہوا کرتے تھے۔ اور وہاں کی علمی زندگی کی عکاسی ہوا کرتی تھی۔ ایک بار وہ پیرس کی عام معاشرتی زندگی پر روشنی ڈال رہے تھے۔ ایک طالب علم نے جوان سے قدرے بے تکلف تھا ڈرتے ڈرتے ان سے سوال کر بیٹھا: "ڈاکٹر صاحب آپ نے پیرس میں بلیو سینما (BLUE CINEMA) بھی دیکھا ہوگا۔" یہ سننا تھا کہ ڈاکٹر حفیظ علف ہوگئے، اور بری طرح اس طالب علم پر برس پڑے۔ تین دن تک ان کا موڈ خراب رہا۔ کلاس میں آتے تو خاموش بیٹھے رہتے اور خشمگیں نگاہوں سے طلباء کی جانب گھورتے رہتے۔ کسی کو ہمت نہیں ہوتی کہ ان سے کوئی سوال کرے، ورنہ اس کی شامت آجاتی۔ وہ طالب علم تو مہینہ بھر کلاس سے غائب رہا۔

شامت اعمال ایک بار ڈاکٹر حفیظ سید نے ہماری دعوت کردی۔ میرے ماموں جی ایم مرتضیٰ مرحوم جنھوں نے ایک سال قبل اردو میں ایم اے کیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کے خاص شاگرد تھے۔ گورکھپور سے الہ آباد کسی انٹرویو میں شرکت کرنے آئے ہوئے تھے اور میرے ساتھ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں مقیم تھے، انھیں آئے ہوئے ایک ہی دن ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا مسلم بورڈنگ ہاؤس

میں وارد ہوا۔ لائبریری کے قریب ہماری ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میرے ساتھ میرے ماموں جی ایم مرتضیٰ اور میرے ایک ہم جماعت نثار صاحب گورکھپوری بھی تھے۔ علیک سلیک کے بعد ڈاکٹر حفیظ نے چھوٹتے ہی پوچھا "مرتضیٰ تم کب آئے۔" انھوں نے جواب دیا "کل شام ہی کو آیا ہوں۔ آج شام کو حاضرِ خدمت ہونا" ڈاکٹر صاحب اچھے موڈ میں تھے کہنے لگے "۔ اچھا کل اتوار ہے تم تینوں آدمی دوپہر کو ڈیڑھ بجے کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔" ہم لوگوں نے شکریہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی دعوت قبول کر لی۔

ہم لوگوں کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر صاحب وقت کے بہت پابند ہیں۔ اور اس معاملے میں کسی کو معاف نہیں کرتے اس لئے ہم لوگ ایک بجے ان کے درِ دولت پر پہنچ گئے۔ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب تیوری چڑھائے بڑے غصے میں کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی برس پڑے۔ "مرتضیٰ صاحب آپ ایم اے پاس کر چکے ہیں اور آپ دونوں جمیل اور نثار صاحبان بی اے کے طالب علم ہیں۔ لیکن آپ لوگوں میں ذمہ داری مطلق نہیں پائی جاتی ہے۔ آخر آپ دنیا میں کیا کریں گے؟" وغیرہ وغیرہ۔

جب ڈاکٹر صاحب اپنی تقریر ختم کر چکے تو مرتضیٰ صاحب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "ڈاکٹر صاحب ہم سے کیا خطا ہوئی ہے۔" اس پر ڈاکٹر صاحب تنک کر بولے۔ "آپ لوگوں کو وقت کی پابندی کا بھی خیال نہیں رہتا ہے کیا یہ غیر ذمہ داری کی علامت نہیں ہے۔ آپ لوگوں کی وجہ سے میرا کافی وقت خراب ہوا۔ میں نے آپ لوگوں کو ساڑھے بارہ بجے کھانے پر بلایا تھا اور آپ

ایک بجے آئے ہیں۔" اس پر ہم لوگوں نے یک زباں ہو کر کہا: "ڈاکٹر صاحب آپ نے ڈیڑھ بجے کا وقت دیا تھا اور ہم لوگ تو احتیاطاً آدھ گھنٹے پہلے آگئے ہیں۔" لیکن ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کی بات کسی حالت میں ماننے کو تیار نہیں تھے کہنے لگے: "یہ کیسے ہو سکتا ہے میں روزانہ ساڑھے بارہ بجے لنچ کھاتا ہوں، پھر تم لوگوں کو ڈیڑھ بجے کیسے مدعو کر سکتا ہوں۔ اب تو کھانا ختم ہو گیا ہے۔ سب میں نے نوکروں کو دے دیا۔"

ہم لوگوں نے قسمیں کھائیں۔ ہر طرح سے یقین دہانی کرائی لیکن ڈاکٹر صاحب کسی طرح اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں ہوئے۔ انھوں نے غالباً سنک میں ڈیڑھ بجے دن کا وقت ہم لوگوں کو دیا تھا، یا دعوت دے کر بھول گئے تھے اور اپنی غلطی کو اس طرح چھپا رہے تھے۔ آخر کار جب یقین دہانی کرتے کرتے ہم لوگ تنگ آگئے تو ہم نے عاجز ہو کر کہا: "ڈاکٹر صاحب ہماری خطا معاف کریں، اور ہم لوگوں کو اب اجازت دیں۔"

ہماری اجازت طلبی پر ڈاکٹر حفیظ چونکے اور ان کا موڈ یک بیک تبدیل ہو گیا۔ کہنے لگے۔ "اچھا اب تو تم لوگ آگئے ہو۔ بغیر کھانا کھلائے میں نہیں جانے دوں گا۔"

ہم لوگوں کو اپنے کتب خانے میں لے گئے۔ تصویروں کے متعدد البم نکال کر ہم لوگوں کو دیا اور متعدد میگزین بھی دیں۔ کہنے لگے: "تم لوگ اس سے دل بہلاؤ اور ایک گھنٹہ میں کھانا تیار کراتا ہوں۔" ہم لوگوں نے بڑی منت سماجت کی اور اس زحمت سے انھیں باز رہنے کی کوشش کی لیکن ڈاکٹر صاحب

کسی طرح ہم لوگوں کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ مجبوراً طوعاً و کرہاً ایک گھنٹہ بڑی مشکل سے گزارا۔ لیکن ڈاکٹر حفیظ کا موڈ بہتر ہو چکا تھا اور وہ تلخ کے بجائے شیریں گفتگو کرتے رہے، اس لئے ہم لوگ زیادہ بور نہیں ہوئے، لیکن ڈرتے رہے کہ خدا جانے کب کوئی بات ناگوار خاطر ہو جائے اور ہم لوگوں کی شامت آجائے۔

خدا خدا کرکے ایک گھنٹہ بعد ہم لوگوں کو کھانے کی میز پر بلایا گیا۔ پہنچے تو دیکھا طرح طرح کی ترکاریاں قابوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ہم لوگوں کی خاطر کے لئے شوربے دار انڈے کا سالن بھی پکوایا تھا۔ اور بنگالی مٹھائی بازار سے منگوالی تھی۔ ان کے دونوں ہندو ملازم کھانا کھلانے پر مامور تھے۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور ڈاکٹر صاحب سے رخصت ہوکر مسلم بورڈنگ واپس آگئے۔

قیام پاکستان کے کافی عرصہ بعد ڈاکٹر حفیظ کا الہ آباد میں انتقال ہو گیا۔

جمعدار ماما

خدا کی قدرت کا احساس اور خدائی بانٹ کا اندازہ جتنا پاکستان میں آکر ہوتا ہے دنیا کے شاید ہی کسی دوسرے خطے میں ہوتا ہو گا۔ مثل مشہور ہے کہ "خدا گدھے کو خشکہ کھلاتا ہے"۔ اس کا نظارہ اگر کسی کو کرنا ہے تو وہ پاکستان آئے۔ جو لوگ قیام پاکستان سے قبل کلرک ہونے کے بھی قابل نہیں تھے، آج بڑی بڑی کرسیوں پر براجمان اور بڑے بڑے اداروں کے سربراہ بنے بیٹھے ہیں۔ جو گدھا گاڑی چلایا کرتے وہ اب بڑی بڑی کاروں میں اڑے پھرتے ہیں۔ بھلا دنیا میں کون ملک ایسا نظر آتا ہے جہاں مقابلہ کے امتحان میں تیسرے اور چوتھے نمبر پر کامیاب ہونے والا شخص منتخب نہ کیا جائے اور ۲۱۲ پوزیشن حاصل کرنے والا شخص منتخب ہو جائے۔ ایسا ملک خاک ترقی کرے گا جہاں نااہلیت کو اہلیت پر ترجیح دی جائے۔ کوٹا سسٹم نے جتنا اس ملک کو نقصان پہنچایا ہے اس کے نتائج ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ لیکن اِس کا

اندازہ ابھی ہمیں پوری طور سے نہیں ہوا ہے اور اس کا خمیازہ آنے والی نسلیں بھگتیں گی جو ہماری کوتاہ اندیشی پر ماتم کریں گی۔ پاکستان میں علاقائی اور صوبائی عصبیت کا ذمہ دار بھی یہی کوٹا سسٹم ہے۔ جس نے پاکستان سے قابلیت اور کارکردگی کو ختم کر دیا ہے اور کوٹا سسٹم کے تحت منتخب ہو کر غیر ممالک میں جانے والے حکام اپنی کارکردگی کا بہت بھونڈا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ کوٹہ سسٹم کی آڑ میں مفاد پرستی کو بھی اس ملک میں پھلنے پھولنے کا موقع ملا ہے، جو چور دروازے سے داخل ہو کر اپنا الو سیدھا کرتی رہی ہے۔

جمعدار ماما بھی کوٹا سسٹم کی "نعمت غیر مترقبہ" سے فیضیاب ہو کر غیر منقسم ہندوستان کے ایک کلرک سے ترقی کر کے پاکستان میں ایک اہم نیم سرکاری ادارے کے سربراہ بن گئے تھے۔ برصغیر کی تقسیم نہ ہوتی تو جمعدار ماما زیادہ سے زیادہ اسسٹنٹ یا اکاؤنٹنٹ سے ریٹائر ہو گئے ہوتے لیکن اس نوزائیدہ ملک میں کوٹا سسٹم کے نفاذ نے ان کی تقدیر کے سارے پٹ کھول دئے۔ اور ایسی جگہ پر انھیں پہنچا دیا جس کا انھوں نے شاید کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا جو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوگی۔

ان حضرت کو "جمعدار ماما" کا نام میں نے ایک خاص مناسبت سے دیا ہے بچپن میں میرے گھر پر ایک ملازم تھے، جو انتہائی مکروہ شکل و صورت رکھتے تھے جن کے کولتار کی طرح سیاہ رنگ۔ چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں، تنگ پیشانی اور ٹھگنے قد کی وجہ سے ان پر کسی حبشی کا شبہ ہوتا تھا۔ ان کو ہم لوگ جمعدار ماما کہتے تھے۔ اس نیم سرکاری ادارے کے بڑے صاحب ہمارے "جمعدار ماما" سے بہت مشابہ

تھے اور انھیں دیکھ کر مجھے اپنے جمعدار ماما یاد آجاتے تھے، اسی لئے نجی گفتگو میں میں نے انھیں جمعدار ماما کہنا شروع کر دیا تھا۔

پاکستانی جمعدار ماما اکثر کالا سوٹ زیب تن کیا کرتے تھے جو ان کے چمکدار سیاہ رنگ سے بالکل میچ کرتا تھا، اور اندھیرے میں پہچاننا مشکل ہو جاتا تھا کہ ان کا ہاتھ کہاں ہے اور چہرہ کہاں ہے۔ کپڑا اور جسم مل کر ایک رنگ ہو جاتے تھے، صرف چمکنے والی لال لال آنکھوں سے ان کی موجودگی کا اندازہ ہوتا تھا۔

جمعدار ماما احساس کمتری اور اس کے ردعمل کی طور پر احساس برتری دونوں کے شکار تھے۔ بہت چھوٹی جگہ سے یکدم بہت اوپر آجانے کی وجہ سے ان کا دماغی توازن قائم نہیں رہ سکا تھا اور نئے معاشرہ میں ابھی تک وہ اپنے کو فٹ نہیں کر سکے تھے۔ ماتحتوں سے وہ بہت زیادہ فاصلہ رکھتے تھے اور ان کے لئے کالے صاحب بن گئے تھے۔ لیکن اپنے ہم رتبہ اور بلند مرتبہ لوگوں کے سامنے وہ بھیگی بلی بن جاتے تھے۔ موصوف جب اپنی متعلقہ وزارت میں جاتے تو سیکشن افسر کو سلام دعا کر کے چلے آتے تھے۔ حکام بالا ڈپٹی سکریٹری، جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری سے انھیں ملنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی حالانکہ ان کے ہم پلہ دوسرے اداروں کے سربراہ سکریٹری اور وزیروں سے کم حیثیت اشخاص سے نہیں ملتے تھے۔

ایک بار ان کے ادارہ کے ڈائرکٹروں کو متعلقہ مرکزی وزیر نے گفتگو کرنے کے لئے بلایا۔ بیچارے کالے صاحب ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گئے اور

وزیر کے پی اے کے پاس بیٹھ کر اسے بور کرتے رہے۔ گفتگو ختم ہونے کے بعد یہ پی اے اسی ادارہ کے ایک افسر سے کہنے لگا: "تمھارے بڑے صاحب کیسے ہیں کہ میرے پاس ایک گھنٹہ بیٹھ کر انھوں نے مجھے بور کیا، آج تک ان کے علاوہ کوئی سربراہ میرے پاس نہیں آیا۔ اور آتا بھی کیسے میرے اور ان کے مرتبہ میں بڑا فرق جو ہے۔"

ماتحتوں کے لئے کالے صاحب بڑے سخت گیر واقع ہوئے تھے اور کسی ماتحت کو کبھی "لفٹ" نہیں دیتے تھے، بلکہ اپنے اور ان کے درمیان بڑا فاصلہ رکھنے کے عادی تھے۔ کوئی ماتحت سلام کرتا تو عموماً ٹال جاتے یا زیادہ سے زیادہ گردن کو ذرا سا جھٹکا دے دیتے۔ کالے صاحب کی گردن اتنی اکڑی رہتی تھی کہ کسی ماتحت کی جانب کوئی التفات کرے کو مڑ ہی نہیں سکتی تھی۔

جب کبھی غیر ممالک کے وفود ان کے ادارے میں گفتگو کرنے آتے تو کالے صاحب اپنا سارا زور اس پر صرف کر دیتے اور اتنی بکواس کرتے کہ وفد کے ارکان انتہائی بور ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتے کہ کسی طرح ان کی بکواس بند ہو۔ کالے صاحب کو تقریر کرنے کا بڑا شوق تھا، انتہائی غلط سلط انگریزی بولتے اور اس میں کام کی بات کوئی نہیں ہوتی۔ غیر متعلق باتوں کی بھرمار جس سے سننے والا تنگ آجاتا ان کی گفتگو سن کر غالب کا وہ شعر آجاتا تھا:

بک رہے ہیں جنوں میں کیا کیا کچھ
نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ان کے بولنے کا لہجہ اور تلفظ اتنا خراب تھا کہ غیر ملکیوں کے تو بڑی مشکل سے سمجھ میں آتا تھا۔ ان کے دفتر کے لوگ بھی آسانی سے نہیں سمجھ سکتے تھے غالباً یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں یہ اپنے ادارے کے ترجمان بن کر جاتے تھے کام خراب کر کے آجاتے تھے، اور فیصلہ زیادہ تر ان کے ادارے کے خلاف ہوتا تھا۔ لیکن کالے صاحب کو یہ مغالطہ ہمیشہ رہا کہ ان سے بہتر بولنے والا پورے پاکستان میں نہیں ہے۔

کالے صاحب صحافیوں سے ایسے بھاگتے تھے جیسے لاحول ولاقوہ سے شیطان بھاگتا ہے۔ انھوں نے کسی صحافی کا کبھی سامنا نہیں کیا۔ کئی صحافیوں نے اسبات کی کوشش کی کہ کالے صاحب کا درشن ہوجائے اور ان کی شیریں گفتار سے لطف اندوز ہونے کا کوئی موقع مل جائے، لیکن کالے صاحب انھیں کسی نہ کسی بہانے ٹال جاتے۔ ایک بار اپنے افسر سے کہنے لگے کہ صحافی بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ میں ان کے سامنے سوال جواب کے کٹھرے میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا۔ کوئی اینڈا بینڈا سوال کردیا تو کیا جواب دوں گا۔" ایک بار کالے صاحب غیر ملکی دورے سے آئے، ایک اخبار کے نمائندے کو اس کا علم ہوگیا اس نے ایرپورٹ پر کالے صاحب کو دھر لیا، اور دھڑ سے دو ایک سوال داغ دئے۔ کالے صاحب بہت ناگواری کی خوب صورت بنا کر اِدھر اُدھر دیکھتے رہے آخر کار کہنے لگے ابھی ٹوائلٹ سے میں آیا۔ اب جو پائخانہ میں گئے تو نکلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ بیچارہ صحافی پائخانہ کے دروازے پر پہرہ دیتے دیتے اکتا گیا۔ خیال کیا کہ شاید کالے صاحب کو سخت قسم کا

تبض ہو گیا ہے اُسے کہیں اور بھی جانا تھا، وہ چلتا ہوا۔ خُدا خُدا کر کے بلا ٹلی۔

کالے صاحب اپنے آپ کو بڑا دیندار اور پرہیزگار ظاہر کرتے تھے، لیکن ان کی یہ پرہیزگاری محض ظاہری روزہ نماز تک محدود تھی۔ شاید کسی نے انہیں ایسے شخص کے لئے کہا ہے کہ سر سجدے میں اور دل دغابازی میں آجکل کے زمانہ ساز مولویوں کی طرح نماز روزے کے پردے میں وہ ہر قسم کی لغویات اور بے ایمانیوں کو جائز رکھتے تھے۔ اور وہی مثل مشہور ہے۔ ٹٹی کی آڑ میں شکار کھیلتے تھے۔ شاید یہ خیال تھا کہ ان کی نماز روزہ ان کی بے ایمانیوں اور حقوق العباد کی خلاف ورزی کا کفارہ ادا کر دے گی۔ ماتحتوں کے معاملہ میں بڑے سخت گیر واقع ہوئے تھے ایک پیسہ کی چھوٹ یا رعایت انہیں دینے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ لیکن اپنے کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے۔ اور ہر قسم کی مالی فضول خرچیوں اور بدعنوانیوں کو اپنے اور اپنے خاندان والوں اور دوستوں کے لئے جائز سمجھتے تھے۔ ایک بار ان کے سکریٹری نے کہا کہ فلاں "اسپرے" جو آپ استعمال کرتے ہیں اور ادارہ اس کی قیمت ادا کرتا ہے بڑی مہنگی ہو گئی ہے اور پاکستان میں نہیں ملتی۔ کہنے لگے: "سربراہ کے لئے قیمت کوئی چیز نہیں ہے۔ جہاں سے بھی ممکن ہو اور جتنی قیمت پر ملے منگوائی جائے۔"

بعض لوگ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی تلافی مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ جمعدار ماما عرف کالے صاحب کی شکل و صورت کے معاملے میں قدرت نے بڑی بخیلی سے کام لیا تھا۔ اس لئے کالے صاحب اپنی ظاہری شان و شوکت۔ اکڑی ہوئی گردن۔ رعونت اور فرعونیت نیز دفتر اور مکان کی

آرائش وزیبائش سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ پھر ان کی گرہ سے بھی کیا جاتا تھا۔ سارے اخراجات تو ادارہ برداشت کرتا تھا خوشبو کا ایسا وافر استعمال کیا جاتا تھا کہ ان کے بیت الخلاء میں بھی بدبُو کے بجائے خوشبو بسی رہتی تھی۔ ماتحتوں پر اپنی فضیلت اور برتری جتانے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔

مولوی افغانی

گورنمنٹ کالج فیض آباد میں شعبۂ فارسی میں جب میں داخل ہوا تو استاد کی کرسی پر ایک ایسے شخص کو جلوہ افروز پایا جو شکل وصورت لباس اور اطوار میں عام اساتذہ سے بالکل مختلف تھا۔

تیمور لنگ کی شکل وصورت کے یہ صاحب اپنی پگڑی بھاری بھرکم جسم۔ گول بھرا ہوا چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ٹھڈی سے لہرائی ہوئی پتلی داڑھی۔ افغانی واسکٹ اور ٹخنوں تک لٹکنے والے چوغے نما کرتے کے ساتھ کوئی ترکستانی باشندے معلوم ہوتے تھے۔

ہم لوگوں نے ایف اے فرسٹ ایر میں فارسی کا اختیاری مضمون لے رکھا تھا۔ ہمارے ساتھ چودہ پندرہ طلبا رہے تھے۔ ہم لوگ جب کلاس میں داخل ہوئے تو مولوی افغانی نے بہت غور سے ہم لوگوں کو دیکھا جیسے قصائی بکروں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ہم لوگوں نے ان کی شکل وصورت کا کوئی آدمی زندگی میں

کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی عجیب وغریب ہیئت دیکھ کر ہمیں ہنسی آرہی تھی۔ ہم میں سے ایک لڑکا ذرا مسکرا دیا۔ پھر کیا تھا آفت آگئی۔ مولوی افغانی اس پر برس پڑے "تم بڑا بدتمیز ہے۔ ہمارے اوپر ہنستا ہے۔ کیدر (کدھر) کا رہنے والا ہے، ہم کوئی چڑیا گھر کا جانور ہے جو ہماری جانب دیکھ کر ہنستا ہے۔ آئندہ ہنسے گا تو ہم تمھاری خبر لے گا۔ اچھی طرح سے"!

مولوی افغانی نے گربہ کشتن روزِ اول پر عمل کرتے ہوئے پورے کلاس کی سرزنش کی۔ ہم طالب علموں کے لئے مولوی افغانی کی ہیئت گزائی اور لٹھ مار قسم کی اکھڑ گفتگو بالکل نئی چیز تھی۔ اس دن تو خاموش رہے اور خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے رہے۔ لیکن کالج کے لڑکے ان گیدڑ بھبکیوں سے کب خائف ہونے والے تھے۔ اور وہ بھی جب بلا کسی سبب کے ہو۔ ہم لوگوں نے بھی طے کر لیا کہ مولوی افغانی کو نچلے نہ بیٹھنے دیں گے۔

مولوی افغانی نے جو نئے نئے کالج میں وارد ہوئے تھے۔ خدا جانے کیسے کالج کو مکتب سمجھ لیا تھا۔ جہاں طلباء سے استاد چلم بھروایا اور پیر دبوایا کرتے تھے، اور ہر طرح کی سرزنش کرنے کے باوجود کوئی طالب علم اُف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن کالج کی فضا تو یکسر بدلی ہوئی ہوتی تھی۔ یہاں کے تعلیمی نظام کے مطابق تعلیمی اداروں میں ہر قسم کی سرزنش کو ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ اور کالج کے طلباء کو تو استاد اپنے برابر سمجھتے تھے اور ان سے اسی طرح کا برتاؤ کرتے تھے۔ آپ اور جناب سے مخاطب کرتے تھے۔ ایسے اساتذہ کی طلباء بھی بڑی عزت کرتے تھے۔ کالج میں

طلباء استاد کی صرف دو باتوں سے مرعوب ہوتے تھے اور ان کی وجہ سے ان کی عزت کرنے پر مجبور بلکہ دل سے آمادہ ہوتے تھے۔ استاد کا علم اور اس کا اخلاق۔ یہ دونوں باتیں جس استاد میں ہوتی تھیں اس کی کالج اور یونیورسٹی میں بڑی تعظیم اور تکریم ہوتی تھی اور یہ تعظیم کسی جبر سے نہیں بلکہ دل سے کی جاتی تھی۔

مولوی افغانی اچھے اساتذہ کی ان دونوں صفات سے یکسر عاری تھے۔ لڑکوں کو چند دن میں معلوم ہو گیا کہ اور باتوں کے علاوہ مولوی افغانی شور سے بہت چڑھتے ہیں، پھر کیا تھا لڑکوں نے شور کرنے کی طرح طرح کی اسکیمیں تیار کیں۔ کلاس کے باہر تاڑ کے بڑے بڑے گملے رکھے ہوئے تھے۔ کوئی لڑکا تھوکنے، ناک صاف کرنے، یا کسی کام کے بہانے کلاس کے باہر جاتا تو تاڑ کے پتے پر دو انگلیاں دبا کر تیزی سے کھینچتا تو اس سے سیٹی کی سی آواز نکلتی۔ آواز کے ساتھ مولوی افغانی خونخوار بھینسے کی طرح تیزی سے باہر آتے۔ اتنے میں وہ لڑکا دوسرے دروازے سے کلاس میں داخل ہو جاتا۔ غرضیکہ ۴۵ منٹ کے گھنٹے میں یہی مشغلہ رہتا۔ پڑھائی وڑھائی تو خاک ہوتی تھی اور فارسی زبان میں پڑھنا بھی کیا تھا۔ گھر پر مطالعہ کر لیا کرتے تھے، لیکن پورا وقت اسی قسم کے ہنگامے اور مولوی افغانی کی سرزنش میں گزر جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولوی افغانی کو پرنسپل نے بتا دیا تھا کہ کالج کے طلباء کو سزا نہیں دی جاتی ورنہ وہ شاید اپنے موٹے سونٹے سے لڑکوں کا سر توڑ دیتے۔ بعض وقت بڑے غصہ اور جوش میں آتے تو لڑکوں کو کھڑا کر دیتے تھے۔ ان کی گرجدار آواز گونجتی "کھڑا ہو جا آغا۔ کھڑا ہو جا۔" آغا جو ایک بہت شریر لڑکا تھا، اور

مولوی افغانی کو بہت پریشان کرتا تھا کھڑا ہو جاتا۔

مولوی افغانی کی آواز بڑی گرجدار تھی اور مسلسل شور و غوغا کی وجہ سے دوسرے کلاسوں کے طلباء گھبرا کر اپنے کلاسوں سے نکل پڑتے اور تماشہ دیکھنے کے لئے آجاتے۔ اس پر مولوی افغانی اور بھی غضبناک ہوتے تھے۔ "تم لوگ یہاں کیوں آیا ہے۔ کیوں کھڑا ہے۔ کوئی بندر کا ناچ ہو رہا ہے" اس پر لڑکے قہقہہ مار کر ہنس دیتے پھر کیا تھا۔ مولوی افغانی بپھرے ہوئے شیر کی طرح ان پر جھپٹتے اور دور تک انھیں بھگاتے ہوئے لے جاتے۔ ایک بار تو غصہ میں وہ اتنے تیز بھاگے کہ ان کا لمبا کرتہ ان کے پاؤں میں پھنس کر تار تار ہو گیا اور وہ بھدر سے زمین پر گر پڑے۔ غرضکہ کالج کے اس حصے میں جہاں فارسی کا شعبہ واقع تھا دوسرے اساتذہ کے لئے تدریس کا کام مشکل ہو گیا۔ آخر کار پرنسپل تک یہ بات پہنچی، پرنسپل ایک پہاڑی جوشی تھے۔ انھوں نے غالباً مولوی افغانی کو سختی کے ساتھ متنبہ کیا کہ اپنے کلاس کی ڈسپلن ٹھیک کریں۔ دو تین دن تک تو مولوی افغانی منہ لٹکائے کلاس میں بیٹھے رہے طلباء بھی حیرت سے اپنے استاد میں اس عجیب و غریب انقلاب کو دیکھتے رہے۔

مولوی افغانی کی یہ غیر فطری کیفیت دو تین دن سے زیادہ قائم نہیں رہی۔ غالباً چوتھا دن تھا لڑکے حسب معمول کلاس میں بیٹھے تھے۔ ایک لڑکے کو ذرا زور کی چھینک آئی۔ پھر کیا تھا جیسے مولوی افغانی خواب سے بیدار ہو گئے ہوں۔ گرجے۔ "سلطان نکل جا کلاس سے، مردود کہیں کا" اس پر کلاس

میں ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ سبھی لڑکے ہنس رہے تھے۔ افغانی کے غصہ کا پارہ اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ انھوں نے جی بھر کے لڑکوں کی سرزنش کی۔ ڈانٹا پھٹکارا۔ گالیاں دیں۔ کھڑا رہنے کا حکم دیا۔ کلاس سے باہر نکال دیا۔ صرف مارا پیٹا نہیں۔ ایف اے کے لڑکوں کو مارتے کیسے۔ مارتے تو کالج میں ہنگامہ ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولوی افغانی اپنی تین دن کی خاموشی کی کمی پوری کرنے پر اتر آئے ہیں۔ دوسرے کلاسوں کے لڑکے نکل آئے اور ہمارے کمرے کے سامنے جمع ہو گئے۔ شعبۂ اقتصادیات کے استاد بھی وہاں آ گئے، انھوں نے بڑی مشکل سے مولوی افغانی کو ٹھنڈا کیا۔

پھر تو روزانہ کا معمول بن گیا۔ لڑکوں نے بھی مولوی افغانی کا چیلنج قبول کر لیا۔ پرنسپل تک پھر بات پہنچی لیکن گورنمنٹ کالج تھا اس لئے وہ بھی لڑکوں اور مولوی افغانی کو سمجھانے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔

لڑکوں نے مولوی افغانی کو تنگ کرنے کے نئے نئے ہتھکنڈے اختیار کئے اس زمانے میں غبارہ نما ایک پھکنی نئی نئی بازار میں چلی تھی۔ جس میں پھونک بھر دی جاتی تو آہستہ آہستہ پیں پیں کی آواز تھوڑی دیر تک نکلتی رہتی۔ ایک لڑکا وہ بازار سے لے آیا اور اس میں ہوا بھر کے پتلون کی جیب میں رکھ لی۔ اب اس میں سے پیں پیں کی آواز نکلنی شروع ہوئی۔ یہ آواز سن کر مولوی افغانی اچھل پڑے اور ڈانٹ کر کہا: "کون بدتمیز ہے شرم نہیں آتی"۔ اس پر ایک لڑکا بول اٹھا: "یہ تو فطری بات ہے اس پر کسی کو کیا اختیار؟" لیکن مولوی افغانی بھلا کب ماننے والے تھے۔ اس لڑکے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے، جہاں سے پیں پیں کی آواز نکل رہی تھی

اس سے منت کرنے لگے۔ "آغا بند کر اسے آغا بند کر" اس پر لڑکوں نے قہقہہ لگایا اور مولوی افغانی ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح مجبوراً اپنی کرسی پر دھڑام سے بیٹھ گئے جوان کا ناگہانی بوجھ نہ سنبھال سکی اور چرچرا کے بیٹھ گئی۔ مولوی افغانی بھڑاک سے نیچے آ رہے۔ لڑکوں نے بڑھ کر انھیں اٹھایا۔

غرضکہ لڑکوں اور مولوی افغانی کی چپقلش روز بروز بڑھتی گئی اور کوئی بھی اس میں ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ رفتہ رفتہ لڑکوں کا پلہ بھاری ہوتا گیا۔ اور ایک زمانہ آیا جب کلاس میں واقعتاً آنکھ مچولی کھیلی جانے لگی۔ کوئی لڑکا باہر جاتا اور تاڑ کے پتے کو انگلیوں سے رگڑ کر سیٹی کی آواز پیدا کرتا، مولوی افغانی تیزی سے کلاس کے باہر جاتے اور وہ لڑکا دوسرے دروازے سے اندر آ کر آہستہ سے اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا۔

مولوی افغانی کے پاس ایک بہت مضبوط دقیانوسی سائیکل تھی جس پر وہ کالج آیا کرتے تھے۔ سائیکل پر پیڈل کے ذریعہ سوار ہونے کے بجائے وہ کھونٹی پر ایک پیر رکھ کر اُچکتے ہوئے سائیکل کو دوڑا کر سوار ہوتے تھے۔ سائیکل پر سوار ہونے سے قبل وہ اپنے لمبے کرتے کو سمیٹ کر اس پر لنگوٹ نما کوئی چیز باندھا کرتے تھے جس سے ان کی عجیب و غریب ہیئت ہو جاتی تھی۔ ایک بار وہ اپنی سائیکل پر سوار ہونے جا رہے تھے کہ آغا وہاں پہنچ گیا۔ مولوی صاحب نے لنگوٹ باندھ رکھا تھا۔ کھونٹی پر پیر رکھ کر اچکنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد گدی پر بیٹھ گئے۔ آغا کو شرارت سوجھی، اس نے پیچھے سے مولوی صاحب کی سائیکل کا کیریر پکڑ لیا۔ مولوی صاحب سائیکل آگے بڑھانے کا زور لگا رہے

تھے، لیکن وہ بڑھ نہیں رہی تھی۔ آخر مولوی افغانی چلائے! "آغا چھوڑ۔ خدا کے لئے چھوڑ۔ میں گرا۔" یہ کہہ کر ایک ہاتھ سے اپنا سونٹا گھمایا، اگر آغا جھک نہ جاتا تو اس کا سر پاش پاش ہو جاتا۔ ایک ہاتھ چھوڑنے سے سائیکل ڈگمگائی، جلدی سے پھر دونوں ہاتھ سے سائیکل سنبھالی۔ جب سائیکل کا توازن خراب ہونے لگتا تو آغا اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتا۔ اور مولوی افغانی ذرا تیزی دکھلاتے تو پھر کیریر مضبوطی سے پکڑ لیتا۔ یہ ڈرامہ کافی دور تک ہوتا رہا۔ آخر کار مولوی افغانی کی سائیکل کا توازن اتنا بگڑا کہ وہ زمین پر آ رہے۔ یہ دیکھتے ہی آغا وہاں سے سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔

کرڑے خاں

گورا چٹا رنگ۔ چوڑا چکلا سینہ۔ کھڑی کھڑی مونچھیں۔ آنکھوں میں سُرمہ لگا ہوا۔ دو کچھی دھوتی اور چھینٹ کا شلوکا زیب تن کئے۔ سر پر ایک بڑا سا پگڑ باندھے پانچ گز کا موٹا لٹھ جس میں جا بجا پیتل اور لوہا جڑا ہوا ہوتا تھا، کاندھے پر رکھے اور چمروڈھا جوتا جس میں روزانہ آدھ پاؤ کڑوا تیل پلایا جاتا تھا، پہنے جب کرڑے خاں باہر نکلتے تو دور ہی سے چرر چرر کی آواز سنائی دیتی۔ قدم زمین پر ایسے پڑتے جیسے زمین ان کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہو۔ لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ خان صاحب آ رہے ہیں۔ چھوٹی ذات کے لوگ مودب کھڑے ہو جاتے، اور گاؤں کے شرفا، اپنے گھروں کے اندر چلے جاتے تھے۔

خان صاحب کی عمر اب ڈھلنے لگی تھی، کوئی پچاس سال اوپر کے پیٹے میں پہنچ گئے تھے۔ لیکن آن بان اور تاؤ بھاؤ میں ابھی مطلق فرق نہیں آیا تھا۔ وہی رعب داب، وہی کڑک دار آواز جس کو ڈانٹ دیں اس کا پیشاب خطا ہو جائے۔ گاؤں

ہیں کوئی ان سے زبان درازی تو کیا آنکھ ملانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ شرفاء کو اپنی عزت و آبرو اور شرافت کا پاس تھا اور چھوٹی ذات والوں کو اپنی حجامت بن جانے کا خدشہ۔

کہتے ہیں جوانی میں خاں صاحب بڑے چھیل چھبیلے، اور کڑیل جوان تھے۔ جالی دار بنیائن پر ململ کا کرتہ پہن، گلے میں پھولوں کی مالا ڈال اور پٹیا سنوار کے جب کبھی وہ گاؤں کی چوپال سے نکل جاتے تھے تو چمارن لڑکیاں دور دور تک انھیں گھورتی رہتی تھیں۔ لیکن خاں صاحب لنگوٹ کے بہت پکے اور پابند واقع ہوئے تھے۔ دور دور تک ان کا نام تھا اور اکھاڑے کے تو وہ شیر تھے۔ بڑے بڑے پہلوان مقابلہ میں آئے لیکن خاں صاحب نے منٹوں میں انھیں ڈھیر کر دیا۔ ایک بار ضلع میں پنجاب کے ایک مشہور پہلوان سے ان کا مقابلہ ہوا۔ جو قد، بدن میں ان کا ڈیوڑھا تھا۔ اکھاڑے کے چاروں طرف تماشائیوں کا ٹھٹ لگا ہوا تھا۔ لوگ دعائیں کر رہے تھے کہ خدایا آج ہمارے خاں صاحب کی لاج رکھیو۔ خاں صاحب کپڑا اتار دو چار ڈنڈ پیل کر یا علی مدد کہتے ہوئے جب اکھاڑے میں اترے تو تماشائیوں نے تالیاں بجائیں۔ پنجابی پہلوان نے خاں صاحب سے دو ہاتھ ملا کر جھٹکا دیا۔ خاں صاحب پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ایک خونخوار بھینسے کی طرح بجلی سی تیزی کے ساتھ حریف پر جھپٹے اور اس کی کمر کو پکڑ کر ایسی لنگی ماری کہ پنجابی پہلوان چاروں خانے چت گرا اور خاں صاحب اس کی چھاتی پر سوار ہو گئے۔ تماشائیوں نے خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ کشتی ختم ہونے کے بعد ان کے داحوں نے خاں صاحب کو پھولوں سے لاد دیا اور سارے شہر میں گشت کرایا۔

خاں صاحب کے رعب داب اور بہادری کے بیسیوں قصے اس اطراف میں مشہور ہیں۔ خاں صاحب ایک دن جمبروٹی سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ ایک چمار جو شاید دوسرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ چارپائی پر بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ خاں صاحب کو دیکھا تو اوروں کے ساتھ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن چلم اس کے منہ سے لگی رہی خانصاحب بھلا کب یہ برداشت کرنے والے تھے کہ ایک چمار ان کے سامنے چلم پی رہا ہو۔ انھوں نے اپنی گرجدار آواز میں اسے گھڑکی دی۔ بیچارے چمار کے ہاتھ سے چلم چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور اس کا پیشاب خطا ہو گیا وہ خاں صاحب کی دھائی مانگتے ہوئے ان کے قدموں پر گر پڑا اور جب تک خاں صاحب نے معاف نہیں کر دیا سر نہیں اٹھایا۔

۲۲-۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا۔ کانگریس اور خلافت تحریک زوروں پر تھی۔ عوام میں بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ اسی لئے بدامنی کے واقعات بھی روز بروز بڑھتے جا رہے تھے۔ ایسی فضا میں لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کو بھی فروغ ہوتا ہے۔ جا بجا ڈاکہ پڑنے کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ لیکن اس زمانہ کے ڈاکو آتشیں آلات سے مسلح نہیں ہوتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے پاس تلواریں۔ گنڈاسا اور بلم ہوتے تھے۔ زیادہ تر شب کی تاریکی میں ڈاکہ ڈالتے تھے۔ مختلف دیہاتوں میں وہاں کے باشندوں نے ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے جوانوں کی پارٹیاں بنا رکھی تھیں۔ رات میں انھیں لاٹھی، تلوار اور بلم چلانے کی تربیت دی جاتی تھی۔ اور ان میں سے دو دو جوان ہر رات کو گاؤں کا پہرہ دیا کرتے تھے۔ خاں صاحب اپنے گاؤں میں مدافعتی جماعت کے سربراہ تھے۔

ایک رات کو پہرہ دینے والے ایک نوجوان نے خبر دی کہ ڈاکو ہمارے

گاؤں کی جانب آرہے ہیں وہ دس بیس اور پالکی میں سوار ہیں تاکہ لوگوں کو ان پر شک نہ گزرے۔ گاؤں والوں کو جب اس کی خبر ہوئی تو سب ہی اپنے اپنے گھروں میں دروازہ بند کرکے چھپ گئے۔ کسی کو باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن خانصاحب کے لئے تو یہ ایک چیلنج اور امتحان کا موقع تھا۔ وہ شخص جس نے کبھی پیٹھ نہیں دکھائی تھی بھلا آزمائش کے اس موقع پر پیٹھ کیسے دکھا سکتا تھا۔ تن تنہا وہ مارنے اور مرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کا واحد ہتھیار ان کا وہ لٹھ تھا جو ہمیشہ ان کے کاندھے کی زینت بنا رہتا تھا۔

خاں صاحب گاؤں کے پاس اُس چھوٹے میدان میں جاکر کھڑے ہوگئے جہاں سے گاؤں میں جانے کا راستہ گزرتا تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ڈاکوؤں کا قافلہ آتا ہوا نظر آیا۔ اس کی قیادت ایک بہت خوفناک شکل کا دیوہیکل ڈاکو کر رہا تھا جس کے ہاتھ میں ایک برچھا تھا جس کی انی چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ خاں صاحب میدان میں ایک درخت کی آڑ میں ہو گئے۔ جب ڈاکوؤں کا قافلہ درخت کے قریب آیا تو خانصاحب نے انھیں مقابلہ کے لئے للکارا وہ چھپ کر ڈاکوؤں پر حملہ کر سکتے تھے۔ انھیں کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ لیکن چھپ کر دشمن پر حملہ کرنا ان کے مذہب میں جائز نہ تھا۔ خاں صاحب کی للکار سن کر دو تین ڈاکو ان پر جھپٹے۔ ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے بلم سے خاں صاحب پر حملہ کیا۔ دوسرا ڈاکو تلوار سونت کر حملہ آور ہوا۔ تیسرا اپنا گرز گھماتا ہوا آگے بڑھا، لیکن خاں صاحب نے پینترا بدل کر بجلی سی تیزی کے ساتھ اپنی لٹھ کو گھمایا اور ایک ہی وار میں ڈاکوؤں کے سردار کا بلم اور دوسرے ڈاکو کی

تلوار ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ دوسرے وار میں خاں صاحب نے تیسرے ڈاکو کو بھی نہتا کر دیا۔ اور بعد ازاں ایک ایک لاٹھی انھیں رسید کی وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ قافلہ کے دوسرے ڈاکوؤں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو پالکی والکی وہیں چھوڑ وہ سرپٹ بھاگے۔ خاں صاحب نے ایک میل تک ان کا پیچھا کیا لیکن بھاری بھرکم خاں صاحب کے مقابلہ میں ڈاکو زیادہ تیز رفتار تھے۔ جان بچانے کے لئے ایک ایکھ کے کھیت میں وہ گھس گئے۔

خاں صاحب کی جرأت اور بہادری کا ایک اور حیرت انگیز واقعہ گاؤں کے قرب و جوار میں مشہور ہے۔ گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کا ایک بھینسا ایک دن مست ہو گیا۔ گرمی کی وجہ سے اس کا ماتھا گرم ہو گیا تھا۔ دو تین مویشیوں کو اس نے سخت زخمی کر دیا۔ ایک چمار پر وہ لپکا تو مارے ڈر کے وہ درخت پر چڑھ گیا اور اس طرح اس نے اپنی جان بچائی۔ سارے گاؤں میں یہ خبر بجلی سی تیزی سے پھیل گئی، اور سارے لوگ اپنے گھروں میں دروازہ بند کر کے قلعہ بند ہو گئے۔ جن کے دو منزلہ مکان تھے وہ اپنی چھت سے بھینسے کی خونخواری کا تماشا دیکھنے کے منتظر تھے۔ خاں صاحب کو جب معلوم ہوا تو کاچھا کس کر اور اپنی لٹھ لے کر بھینسے سے مقابلہ کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ زمیندار کی باغ کی طرف گئے تو بھینسا انھیں نظر آیا۔ ایک سایہ دار درخت کے نیچے کھڑا تھا۔ خاں صاحب کو اپنی طرف آتا دیکھا تو گولی سی تیزی سے اُن پر حملہ آور ہوا۔ اس کے منہ سے پھین (کف) جاری تھا۔ خاں صاحب لٹھ لئے تیار کھڑے تھے۔ بھینسا قریب آیا تو وہ ذرا سا ایک جانب کھسک

گئے۔ بھینسا تیزی میں دور تک نکل گیا۔ واپس مڑا اور پھر اسی تیزی سے خاں صاحب پر حملہ آور ہوا۔ خاں صاحب نے دوبارہ اسے کاوا دیا۔ خاں صاحب پندرہ بیس منٹ تک اسی طرح بھینسے سے کھیلتے اور تھکاتے رہے۔ آخر کار جب وہ کافی ہلکان ہو گیا تو انھوں نے ایک لٹھ اس کی ٹانگوں پر لگائی اور وہ زمین پر آ رہا۔ بعد ازاں وہ اس کی گردن پر بیٹھ گئے اور لوگوں کو آواز دی کہ رسی لے آؤ بھینسا قابو میں آ گیا ہے۔ لیکن ڈر کے مارے کوئی باہر نکلنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ مجبوراً خاں صاحب نے اپنی پگڑی اتاری اور بھینسے کی گردن باندھ کر گھسیٹتے ہوئے اسے زمیندار کے قریبی بردوری میں لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔

خاں صاحب ایک ماہر پیراک تھے۔ گاؤں کے مختلف کنوؤں میں کوئی پیتل کے گگرے۔ بالٹی یا جانور گر جاتے تو خاں صاحب کو زحمت دی جاتی اور خوشی سے وہ اسے نکالنے پر تیار ہو جاتے۔ لیکن رسی کے ذریعہ کنوئیں میں اترنے کے وہ قائل نہ تھے اور کنوئیں کی جگت پر کھڑے ہو کر یا علی کا نعرہ بلند کر کے دھڑام سے کنوئیں میں کودتے اور ایک ہی ڈبکی میں مطلوبہ شے نکال اوپر آ جاتے۔ کنوئیں سے باہر نکلنے کے واسطے ان کے لئے ایک کے بجائے دو رسّے درکار ہوتے تھے۔ جنھیں عموماً درخت سے باندھ دیا جاتا تھا۔

مسٹر امین بنکار

(بنکاروں سے معذرت کے ساتھ)

ایک بہت بڑے بنکار کا قول ہے کہ بنکاری اور انسانیت دو متضاد چیزیں ہیں۔ بنکاری کے ہتھکنڈے بنکار کو انسانیت سے دور سے دور تر کر دیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ وہ ایسی مادہ پرست اور کاروباری ذہنیت کا حامل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے انسانیت کے اوصاف حمیدہ اس کا ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں۔ اس میں کافی بڑی حد تک مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ انہیں بڑے بنکار کا قول ہے کہ:

"مجھ میں جو تھوڑی بہت انسانیت اور ادبی ذوق پایا جاتا ہے وہ صرف اس لئے کہ میں اپنے آپ کو روزانہ صرف ڈھائی گھنٹہ کے لئے بنکار تصور کرتا ہوں اور باقیماندہ وقت روزانہ دانشوروں اور ادیبوں میں گزارتا ہوں۔"

مسٹر امین کا بھی شمار گاندھی گارڈن کے باسیوں میں ہونے لگا تھا۔ درحقیقت وہ بنکاری میں اتنا ڈوب چکے تھے کہ اب کوئی راہ فرار باقی نہیں رہ گئی تھی اور اب ان کا راستہ گاندھی گارڈن اور صرف گاندھی گارڈن کی طرف جاتا تھا۔ رات دن سوتے جاگتے۔ وہ پیسہ۔ ہائے پیسہ۔ سود اور منافع خوری کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ کس طرح وہ لوگوں کو پھانس کر ان کی ساری رقم اپنے بنک کے حوالے کر دیں۔ رات کو خواب میں انھیں روپے کے لین دین کے مناظر دکھائی دیتے تھے۔ اکثر وہ خواب میں بڑبڑاتے:

"ہاں بھیا کتنا روپیہ ہمیں دے رہے ہو۔ کتنا سود لوگے ——
سرکار اتنا سود تو مت مانگو۔ کچھ تو کم کرو۔ ہمارے لئے بھی تو کچھ چھوڑ دو
ہمیں بھی اپنے افسروں کو منہ دکھانا ہے۔ کچھ ہمارے لئے چھوڑ دو۔"

غرضکہ صبح ہوئی امین صاحب دفتر آئے۔ جلدی جلدی انھوں نے دو آنے پیالی والی چائے غٹاغٹ چڑھائی۔ بنک میں آنے والے اخبارات کی مفت ورق گردانی کی۔ اور پھر ٹیلیفون رلیسیور اپنے کان میں لگا کر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ بھیا کون صاحب۔ اچھا سرکار آپ ہیں۔ حضور آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔ آپ نے کئی بار وعدہ کیا کہ آپ ہمارے بنک میں پچاس لاکھ روپے جمع کرائیں گے۔ اچھا۔ خوب۔ آپ دے رہے ہیں۔ پچاس لاکھ؟ کیا فرمایا حضور۔ پچاس لاکھ؟ ہاہاہا۔ سرکار کی بندہ نوازی۔ سود سات فیصدی۔ نہیں حضور یہ تو بہت زیادہ ہے۔ ہمارے لئے بھی دال روٹی کے لئے کچھ چھوڑیئے۔ کیا فرمایا سرکار نے؟ ساڑھے چھ فیصدی؟ بندہ نواز یہ بھی زیادہ ہے۔ ہم مر جائیں گے۔ کہاں سے لائیں گے۔ چھ

رکھئے چھ۔ کیا فرمایا حضور نے۔ آپ چھ فیصدی پر راضی ہیں۔ خدا سرکار کا بھلا کرے۔ دنیا میں آپ کی کمپنی کا بول بالا ہو۔ چیک فوراً بھجوا دیجئے۔ ہاں آپ کی مراعات۔ میں آپ کا خادم دولت خانہ پر پہنچا دے گا۔" امین صاحب نے پچاس لاکھ کا سودا کر کے ٹیلیفون کا رسیور رکھ دیا۔ پھر ایک دوسرے بنک کو ڈائل کیا:

"کون صاحب ہیں؟ اچھا آپ ہیں سرکار۔ بندہ اداب عرض کرتا ہے۔ حضور آپ نے ایک بار ہم سے روپیہ طلب کیا تھا پچاس لاکھ روپے ہم دے سکتے ہیں۔ ابھی آج حضور۔ لیکن سود نو فیصد ہی ہوگا۔ بندہ نواز اس سے ایک پائی کم نہیں ہو سکتا مارکیٹ میں تو پندرہ فیصد تک سود مل جاتا ہے۔ اگر آپ کو ضرورت نہیں ہے تو کسی اور سے سودا کر لیتا ہوں۔ لیکن مجھے آدھ گھنٹے میں بتا دیں ورنہ پھر رقم کسی دوسرے کو مل جائے گی۔ اچھا اچھا۔ آپ راضی ہیں۔ خوب۔ تو حضور کسی کو بھیج دیجئے، چیک دے جائے۔ رضامندی کا خط اور رسیدیں بھی ساتھ لایئے۔"

امین صاحب کو دن رات یہی کام تھا۔ ایک بار وہ دفتر میں اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے عالم خواب میں پہنچ گئے اور خراٹے بھرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد عالم خواب میں لگے بڑبڑانے۔

"حضور کتنا روپیہ جمع کرا رہے ہیں۔ سرکار آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اس ماہ پانچ لاکھ جمع کرائیں گے۔ بندہ نواز پندرہ تاریخ ہوگئی ہے۔

ابھی تک آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ مائی باپ ہم پر رحم کھائیں۔
ہماری نوکری خطرے میں ہے۔ افسر نے کہا ہے اتنا پیسہ لاؤ ورنہ گھر
جاؤ۔"

امین صاحب خواب میں سودا طے کر رہے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی وہ چونک کر بیدار ہو گئے۔ دیکھا کہ ایک جنٹلمین سامنے کھڑے ہیں۔ ہڑبڑا کے کھڑے ہو گئے۔

"آیئے سرکار تشریف لایئے۔ کہیئے سیٹھ صاحب کیا حکم ہے؟ کارخانے
کے پیسے جمع کرانا ہے۔ کتنا ہے۔ دس بیس لاکھ تو آپ کے لئے کوئی
بات نہیں ہے۔"

سیٹھ صاحب خاموشی اور حیرت سے امین صاحب کو تکتے رہے۔ آخر کار ان کی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ بولے: امین صاحب آپ دن رات پیسے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ بھائی آج کل مندی ہے۔ پیسہ کہاں سے لاؤں۔ کارخانہ بند پڑا ہے۔ میں تو آپ کے بنک سے اپنے بیس لاکھ نکالنے آیا ہوں۔"

اب کاٹو تو امین صاحب کے جسم میں خون نہیں ہے۔ سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ اور روندھی آواز میں منمناتے ہوئے بولے:

سرکار یہ آپ کیا غضب کر رہے ہیں۔ ہم تو مر جائیں گے۔ آج
ہی ہمارے افسر نے کہا ہے کہ اتنا اکاؤنٹ لے آؤ ورنہ اپنے گھر
جاؤ۔ مائی باپ۔ ہمارے بال بچوں پر رحم فرمائیں۔ ورنہ ہم تو
لٹ جائیں گے۔"

غرضکہ امین صاحب نے خوشامد اور مکھن بازی کے سارے ہتھیار سیٹھ صاحب پر

آزمائے۔ لیکن محاذ سر نہ ہو سکا۔ اور ہوتا بھی کیسے۔ سیٹھ صاحب کو ضرورت جو تھی۔

امین صاحب نے یہ سارے گُر دوسرے بنک میں سیکھے تھے۔ جہاں انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا، اور اس بنک میں ان کا استاد ایک ایسا شخص تھا جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھا اور جس نے خوشامد اور دلالت کے ہتھکنڈوں میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ جس کی بدولت وہ چپراسی کی جگہ سے ترقی کر کے جنرل منیجر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ امین صاحب کے آئیڈیل یہی حضرات تھے جنھوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں سر انجام دیئے تھے۔ اور بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ یوں تو ان حضرات کے بہتیرے کارنامے بنکاری کے حلقوں میں مشہور ہیں۔ لیکن ایک واقعہ یہاں بیان کرنا مناسب ہوگا۔ مسٹر امین کے استاد اپنے بنک میں ایک زمانہ میں محکمہ انتظامیہ کے منیجر تھے۔ اور جنرل منیجر کے ناک کے بال تھے۔ جنرل منیجر صاحب کا ہر قسم کا کام گھر کا گٹر صاف کرانے سے لے کر روغن کرانے۔ ہر قسم کے بل ادا کرنے۔ بچوں کو اسکول پہنچانے۔ بیگم صاحبہ کا سودا سلف لانے، اعلیٰ سرکاری افسروں کو ڈالی پہنچانے اور ملاقات کا وقت مقرر کرنے کا کام یہی حضرت سر انجام دیا کرتے تھے۔ ایک بار جنرل منیجر کو ایک بہت بڑے سرکاری افسر سے ملنے کی ضرورت ہوئی جو اپنی بد دماغی کے لئے مشہور تھا۔ اور کسی کو آسانی سے ملاقات کا وقت نہیں دیتا تھا۔ جنرل منیجر نے امین صاحب کے استاد سے کہا:

"دیکھو جی مجھے فلاں بڑے سرکاری افسر سے بہت ضروری کام ہے وقت مقرر کر دو۔ تمھاری کارکردگی کا یہ امتحان ہے۔"

امین صاحب کے استاد نے کہا: "حضور آپ کل شام کو تشریف لے چلیں میں وقت مقرر کر لوں گا۔" جنرل منیجر کو سخت تعجب ہوا لیکن امین صاحب کے استاد نے یہ کہہ کر انھیں مطمئن کر دیا کہ "بڑے صاحب کی بیگم صاحبہ اور ان کے بچوں کی میں نے بڑی خدمت کی ہے۔" ـــــ گھنٹہ بھر بعد امین صاحب کے استاد نے اپنے جنرل منیجر کو خوشخبری سنائی کہ بڑے صاحب نے کل ساڑھے سات بجے شام کا وقت دیا ہے۔"

دوسرے دن شام کو جنرل منیجر صاحب امین صاحب کے استاد کو لے کر بڑے صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ استاد نے جنرل منیجر صاحب کو انتظار گاہ میں بٹھا دیا اور عرض کیا کہ "حضور یہاں تشریف رکھیں، میں جا کر بڑے صاحب کو مطلع کرتا ہوں" امین صاحب کے استاد کافی چھوٹے قد کے آدمی تھے۔ بلکہ بونے تھے۔ تھوڑی دیر بندروں کی طرح اِدھر اُدھر تاڑتے رہے۔ پھر دربان کی نظر بچاتے ہوئے کوٹھی کی دوسری جانب لان کی طرف سرپٹ بھاگے جہاں بڑے صاحب تشریف فرما تھے۔ دربان نے جو بھاگنے کی آواز سنی تو وہ بھی پیچھے پیچھے بھاگا۔ بڑے صاحب کے سامنے پہنچ کر امین صاحب کے استاد ان کے قدموں پر گر پڑے۔ بھونکار مار کے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا: "دہائی بڑے سرکار کی۔ دہائی حضور کی۔" بڑے صاحب نے ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہکّا بکّا رہ گئے۔ کہنے لگے: "کیا بات ہے"۔ استاد نے روتے اور سسکتے ہوئے کہا: "دہائی حضور کی۔ مائی باپ میری نوکری جاتی ہے۔ میری بیوی بچے مر جائیں گے۔" بڑے صاحب کو اور بھی اچنبھا ہوا۔ پوچھا: "آخر ماجرا کیا ہے۔" استاد نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "مائی باپ میرے بڑے افسر جو فلاں بنک کے جنرل منیجر ہیں آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں انھیں لے آیا ہوں،

انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ اگر آپ انھیں دو منٹ دے دیں تو میری نوکری بحال رہے گی۔ میری بیوی بچے حضور کو دعا دیں گے۔" بڑے صاحب نے یہ منظر اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی دیکھا تھا۔ طوعاً و کرہاً انھوں نے جنرل منیجر کو بلوا لیا اور کہا: "تم نے یہ چالاک بونا خوب پالا ہے یہ تو اپنے فن کا استاد ہے۔"

امین صاحب اپنے استاد کے صحیح معنوں میں شاگرد تھے۔ انھوں نے یہ ہتھکنڈے انھیں سے سیکھے تھے اور اس لئے وہ بھی ترقی کے زینے پر چڑھتے رہے۔ ان کے ایک افسر نے انھیں ایک بار پٹخنی دینی چاہی، لیکن امین صاحب اپنے خوشامدی ہتھکنڈے سے کام لے کر اوران سے بھی بڑے افسر کی خدمت اور مکھن پالش کر کے اس شکنجے سے صاف نکل گئے بلکہ ایک زینہ اوپر چڑھ گئے۔

لیکن جیسا کہ ایسے لوگوں کی خصلت ہوتی ہے وہ احساسِ کمتری اور برتری دونوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ماتحت کے لئے تو وہ شیر ہو جاتے ہیں، لیکن افسر کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ جی حضور۔ جی سرکار۔ بہت خوب بندہ نواز۔ جیسا حکم ہو۔ مائی باپ۔ ان کا تکیہ کلام ہوتا ہے۔ امین صاحب ان ساری خصوصیات کے حامل تھے۔

ایک دن امین صاحب اپنے کمرے میں ٹیلیفون کر رہے تھے کہ منیجنگ ڈائرکٹر صاحب یکایک کمرے میں وارد ہو گئے۔ امین صاحب کی نظر جو بڑے صاحب پر پڑی تو ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے۔ دائیں ہاتھ میں ٹیلیفون کا ریسیور تھا، انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ گھبراہٹ میں ہاتھ سے ریسیور چھوڑ کر جھٹ سے

سیلوٹ جھاڑ دیا۔ ریسیور پٹاخ سے میز پر گرا اور میز کا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ مینجنگ ڈائرکٹر صاحب جو ضرورت سے زیادہ سنجیدہ واقع ہوئے تھے، بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ڈاکٹر رحمٰن

قدرت نے مختلف افراد کو مختلف قسم کی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں۔ تاکہ وہ ان سے کام لیں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ اکثر وبیشتر افراد ان خداداد صلاحیتوں سے کام لینے کے بجائے اپنی فطری طبائع سے مختلف اور متضاد پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی افراد میں ڈاکٹر رحمٰن کا بھی شمار ہوتا تھا۔ جنہیں قدرت نے تھانیدار بنانا چاہا تھا لیکن وہ میڈیکل ڈاکٹر بن گئے تھے۔

ڈاکٹر رحمٰن میں ایک تھانیدار کی ساری خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ وہی گرجدار آواز اور رعب داب، وہی رعونت اور اکھڑپن جو تھانیدار کی صفات ہوتی ہیں ڈاکٹر رحمٰن میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ مریضوں کو وہ ایسا گھڑکتے تھے جیسے تھانیدار جرائم پیشہ افراد کی ڈانٹ پھٹکار مچایا کرتے ہیں جس طرح تھانیدار اپنے افسروں کے سامنے بھیگی بلی بن جایا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی متعلقہ بڑے

افسروں اور بڑے لوگوں کے سامنے رشیہ خمتی ہوجایا کرتے تھے۔ کوئی مریض اگر ڈاکٹر صاحب سے کوئی سوال کر لیتا پھر تو اس کی شامت آجاتی۔ اسے ایسا گھڑکتے اور اس پر ایسا گرجتے کہ اس پر لرزہ طاری ہوجاتا۔ مریض کہتا: "پیٹ میں درد ہے دوا دے دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب اس پر گرجتے: "کھاتے وقت پیٹ میں ٹھونستے چلے جاتے ہو، پیٹ میں درد نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔ اس کی کوئی دوا نہیں ہے جاؤ (گرجدار آواز سے)۔ جاؤ۔ نہیں دیتے دوا۔ کرنا ہو جو کچھ کر لو۔"

تھانیدار کی خصوصیات کے باوجود ڈاکٹر رحمٰن مختلف سرکاری اداروں کے میڈیکل افسر بن گئے تھے۔ جن سے ان کی اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی لیکن بڑے افسروں سے ان کا برتاؤ بالکل مختلف بلکہ انتہائی خوشامدانہ ہوتا تھا۔ پولیس والوں کی طرح وہ احساسِ کمتری اور اس کے ردِعمل احساسِ برتری دونوں کے شکار تھے۔ چھوٹوں پر سختی اور ڈانٹ پھٹکار۔ لیکن بڑوں کے ساتھ نرمی اور خوشامد کے فارمولے پر وہ سختی سے کاربند تھے۔ اس لئے ان کا کوئی بگاڑ نہیں سکتا تھا۔ اور مختلف سرکاری اداروں میں ان کی میڈیکل افسری کی گاڑی کسی رکاوٹ کے بغیر چل رہی تھی۔ اس سلسلے میں ایک پولیس مین کا واقعہ یاد آیا، جو میرے ایک دوست نے جو سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے مجھ سے بیان کیا تھا۔ میرے دوست یو، پی کے ضلع گونڈہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے، وہ اپنی کار پر جا رہے تھے۔ تاریکی پھیل گئی تھی لیکن انھوں نے گاڑی کی بتی نہیں جلائی تھی۔ ایک ٹریفک کانسٹبل نے جس کے داہنے ہاتھ میں لالٹین تھی ان کی گاڑی روکی۔ اور ڈانٹ کر کہا: "بتی کیوں نہیں جلاتا ہے، نیچے اترو۔" یہ کہتا ہوا وہ گاڑی کے قریب آیا۔

گاڑی میں جب سپرنٹنڈنٹ صاحب کو دیکھا، اس نے داہنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی لالٹین چھوڑ دی اور جھٹ سے سیلوٹ جھاڑ دیا۔ لالٹین سڑک پر دھڑاک سے گری، اور چکنا چور ہوگئی۔ میرے دوست نے جو ایس پی تھے ہنستے ہوئے پولیس والوں کی احساس کمتری کے سلسلے میں یہ واقعہ سنایا تھا۔

پولیس والوں کی طرح ڈاکٹر رحمٰن صاحب کو بھی اپنے احساس برتری کے مظاہرہ کے مواقع بہت ملتے تھے، لیکن احساس کمتری کا اظہار کبھی کبھی کرنے کی نوبت آتی تھی۔ جب کسی بڑے افسر سے مڈبھیڑ ہوتی تھی پھر تو ڈاکٹر صاحب بالکل ریشہ خطمی ہو جاتے تھے۔

"ہاں صاحب! رات کو نیند نہیں آتی ہے۔ بلڈ پریشر ذرا آپ کا چیک کر لوں۔ اجابت کیسی ہوتی ہے۔ ہاں جناب آپ کو یہ یہ دوائیں لکھے دیتا ہوں۔ اور یہ بھی دوائیں احتیاطاً رکھ لیں کہیئے تو اپنے آدمی سے منگا دوں۔ رکھ لیجیے۔ اگر اس دوا سے افاقہ نہ ہو۔ نیند نہ آئے تو دوسری دوا جو دے رہا ہوں استعمال کریں۔ لسٹرین دے رہا ہوں اس سے روزانہ غرارہ کر لیا کریں۔ زکام نہیں ہوگا۔ گلا خراب نہیں ہوگا۔ گلے کی خرابی سے آج کل ساری بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ معدے کے لئے اس کا سیلزر۔ اینو فروٹ سالٹ۔ کروشین سالٹ۔ انٹیسٹو پان اور ریاح کے لئے بھی گولیاں دے دی ہیں، جو موافق آئے استعمال کریں۔ جاڑے کا زمانہ آگیا ہے۔ بیگم صاحب کے لئے واٹربری کمپاؤنڈ

دے رہا ہوں اس کا ایک ایک چمچہ اور پچے اسٹرا لیٹ کا ایک ایک چمچہ صبح شام استعمال کریں۔ کوئی شکایت ہوا کرے تو ٹیلیفون کر دیا کریں بندہ حاضر ہو جایا کرے گا، آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

کوئی باہری مریض تو ڈاکٹر رحمٰن صاحب کے یہاں کبھی دیکھا نہیں گیا۔ کون ان کی گھڑکیوں کو برداشت کرتا۔ کوئی شامتِ اعمال کا مارا اگر پھنس جاتا تو ڈاکٹر رحمٰن صاحب اس کی ایسی درگت بناتے کہ وہ لاحول پڑھتا ہوا کبھی اس طرف رُخ نہ کرنے کی قسم کھاتا۔ سرکاری اداروں کے کم تنخواہ پانے والے ملازم البتہ ڈاکٹر صاحب کے تختۂ مشق بنتے تھے وہ جاتے بھی کہاں۔ ادارہ کی طرف سے مفت دوا ملتی تھی، اور ڈاکٹر صاحب اس کے کرتا دھرتا تھے۔ درگاہ کے مجاور کی طرح اپنے دواخانہ میں درگاہ لگائے سرکاری اداروں کے غریب ملازموں کو گھڑکیاں دیا کرتے۔ سلواتیں سناتے اور الٹی سیدھی دوائیں دیتے رہتے تھے۔ یہ غریب ملازم کسی اور ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکتے تھے وہاں پلّے سے پیسے خرچ کرنے پڑتے تھے۔

ہاں ان سرکاری اداروں کے بڑے افسران ڈاکٹر رحمٰن کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ وہ شہر کے اسپشلسٹ ڈاکٹروں کا علاج کرتے۔ انھیں سے دوائیں لکھاتے اور نسخہ ڈاکٹر رحمٰن صاحب کے پاس دستخط کے لئے بھجوا کر دوا منگا لیتے۔ اس طرح وہ ڈاکٹر رحمٰن کا تختۂ مشق بننے سے بچے رہتے تھے۔ ڈاکٹر رحمٰن بھی اس بات سے خوش رہتے تھے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ ورنہ کسی بڑے افسر کو پیچش کی وجہ سے سردی

لگ کر بخار آجاتا اور ڈاکٹر رحمٰن اسے کونین کا مکسچر پلا دیتے۔ تولینے کے دینے پڑجاتے اور ان کی نوکری خطرے میں پڑجاتی۔ اس لئے انھوں نے خیریت اسی میں دیکھی کہ بڑے افسروں کے علاج سے دور ہی رہیں اور یہ بلا اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کے سر ٹالنے میں اپنے لئے مفر خیال کرتے تھے۔

خیریت یہ ہے کہ کسی دل کے مریض کا ڈاکٹر صاحب سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ورنہ ان کی گھڑکی سُن کر اس کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ قدرت کی یہ بھی ستم ظریفی ہے کہ دل کا مریض زیادہ تر بڑے افسروں اور امیر طبقوں میں پایا جاتا ہے اور ایسے لوگ ڈاکٹر رحمٰن کے دسترس سے باہر تھے۔ وہ باہر ہی باہر ہارٹ اسپیشلسٹ ماہران قلب سے علاج کراتے تھے اور ان کی فیس اور دواؤں کے بل ڈاکٹر رحمٰن کے پاس دستخط کے لئے بھجوا دیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بخوشی اس کام کو انجام دیتے اور خدا کا شکر ادا کرتے کہ جان بچی لاکھوں پائے۔

خواتین اور بچے تو ڈاکٹر صاحب سے ایسا ڈرتے اور اس طرح دور بھاگتے تھے جیسے لاحول سے شیطان بھاگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی گھڑکی سے تو بچوں کا پیشاب خطا ہو جاتا تھا اور خواتین کو لرزہ چڑھ جاتا تھا۔ ایک بڑے سرکاری ادارہ کے ایک بڑے افسر دورے پر گئے ہوئے تھے، ان کی بیگم کو پیچش ہو گئی شامتِ اعمال وہ ڈاکٹر صاحب کے دواخانے پہنچ گئیں۔ بیچاری سیدھی سادھی نیک قسم کی خاتون واقع ہوئی تھیں۔ گھنٹہ بھر زنانہ کمرے میں انتظار کرتی رہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ سمجھے ایسی ویسی کسی کلرک کی بیوی ہے گھڑکی دی: "رات دن ٹھونستی چلی جاتی ہو۔ جو کچھ ملا۔ عمر عیار کی زنبیل کی طرح پیٹ میں

ڈال لیا۔ پیچش نہیں ہوگی تو کیا ہوگا۔ جاؤ چار دن کھانا بند اور مکسچر اوپر جاکر بنوالو اُسے پیو۔"

وہ بیچاری وہاں سے چلتی بنی۔ میاں آئے تو شکایت کی کہ "تمھارا ڈاکٹر بڑا بدتمیز ہے۔ خواتین سے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔" اور پورا واقعہ سنایا میاں صاحب کو بھی بڑا غصہ آیا۔ فی الفور ڈاکٹر صاحب کو فون کیا اور خوب جی بھر کے صلواتیں سنائیں۔ ڈاکٹر صاحب دوڑے ہوئے ان کے بنگلے پر پہنچے اور بڑی منت سماجت کی۔ کہنے لگے۔ "بیگم صاحبہ نے یہ کیوں نہیں بتادیا کہ آپ کی بیگم ہیں۔ بھلا مجھ سے ایسی بدتمیزی کبھی سرزد ہوسکتی تھی۔" بڑی معافی تلافی کی پھر جاکر افسر کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔

ڈاکٹر رحمن صاحب کبھی کسی مریض کی تشخیص کرنے کی زحمت گوارا نہ کرتے تھے۔ نہ وہ نبض دیکھتے، نہ تھرمامیٹر لگاتے۔ نہ اسٹراسکوپ لگاتے اور بلڈ پریشر دیکھنے کی نوبت تو شاید مہینہ میں کبھی آتی ہو۔ مریض کا حال بھی اچھی طرح نہیں سنتے تھے۔ شکل دیکھ کر دوا لکھ دیتے تھے۔ کسی مریض کو لرزہ آرہا ہے تو فوراً کونین مکسچر اور روسوچین کی گولیاں لکھ دیتے۔ خواہ وہ لرزہ پیچش ہی کی وجہ سے آرہا ہو۔ کسی کا رنگ قدرے زرد ہے تو یرقان کی دوا عطا کرتے۔ اکثر بیشتر ان کی دواؤں سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا تھا۔ اور بیچارے غریب کلرکوں کو تو الٹی سیدھی دوا پلاکر ان کی جان نکال لیتے تھے۔ اگر بیچارے کو ہلکا سا بخار شروع ہوا تو ڈاکٹر رحمن کی دوا سے میعادی بخار میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ دوا پیتے پیتے مریض ہلکان ہوجاتا تھا۔

کسی کو معمولی کھانسی آ رہی ہے، اور اس نے ڈاکٹر صاحب سے دوا لی تو یہ کم ہونے کے بجائے کالی کھانسی میں بدل جاتی تھی، اور وہ بیچارا کھانستے کھانستے پاگل ہو جاتا۔۔۔ غرض کہ بڑے سخت جان لوگ تھے جو ڈاکٹر صاحب کی دواؤں کو جھیل جاتے تھے۔ ورنہ کبھی کبھی تو ڈاکٹر صاحب ایسی کارگر دوا تجویز کرتے تھے کہ نہ مرض رہے نہ مریض۔

اُمراؤ دادا

لانبا قد۔ چھریرا بدن۔ ڈھلتا ہوا سانولا رنگ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ باریک مونچھیں اور ٹھڈی پر داڑھی کے چند بال خواجہ امراؤ حسین رشتے میں ہمارے دادا ہوتے تھے۔ اس لئے ہم انھیں امراؤ دادا کہہ کر پکارتے تھے۔

امراؤ دادا کی چند ایسی خصوصیات تھیں جو اُن کو دوسرے عام آدمیوں سے ممتاز اور ممیز کرتی تھیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ اصول پرست اور تکلیف دہ حد تک محتاط واقع ہوئے تھے۔ روزمرہ زندگی کے انھوں نے جو اصول بنائے تھے اس میں وہ کبھی ترمیم یا تنسیخ کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ اور بقول کسے: "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔"

ہمارا گاؤں تاجپور اکبر پور کے قصبہ سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔

ایک میل کچی سڑک طے کرنے کے بعد ٹانڈہ اکبرپور کی پختہ سڑک ملتی تھی اور اس پر تین میل کی مسافت طے کرکے اکبرپور آتا تھا۔ جو لوگ گاؤں سے پیدل جاتے تھے وہ شارٹ کٹ سے تین میل مسافت طے کرکے اکبرپور پہنچ جاتے تھے۔

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا امراؤ دادا کو اکبرپور کے مڈل اسکول میں مدرسی کرتے دیکھا۔ ابتدا میں وہ گاؤں سے صبح کے وقت پیدل اکبرپور جاتے اور شام کو واپس آجاتے۔ گاؤں کے طلبار زیادہ تر پیدل اکبرپور روزانہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ ہم فیض آباد کے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ چھٹیوں میں گھر آئے تو معلوم ہوا کہ امراؤ دادا نے پندرہ روپے میں ایک سکنڈ ہینڈ سائیکل خریدی ہے۔ اور اس پر اسکول آجاتے ہیں۔ لیکن سائیکل کی سواری کا بھی ان کا انداز نرالا تھا وہ پیڈل پر پیر رکھ کر سائیکل پر سوار نہیں ہو سکتے تھے بلکہ انھوں نے سائیکل کے پچھلے پہیے میں ایک کھونٹی لگوا رکھی تھی اور اس پر داہنا پیر رکھ کر کافی دور تک اچھلتے ہوئے گھوڑے کی طرح اچک کر اس پر سوار ہوتے تھے۔ محتاط اس قدر تھے کہ ایک میل کی کچی سڑک پر سائیکل پر سوار نہیں ہوتے تھے بلکہ اس وقت سائیکل ان پر سوار ہوتی تھی، اور وہ سائیکل کو ہاتھ میں لئے ہوئے اور کبھی ہاتھوں سے اوپر اٹھا کر مینڈ اور نالیوں کو کداتے ہوئے پختہ سڑک پر لے پہنچاتے تھے۔ اس قدر احتیاط کرتے تھے کہ کہیں سائیکل کو جھٹکا نہ لگ جائے کہ مبادا اس کا فری وہیل وغیرہ خراب ہو جائے۔ پختہ سڑک پر آتے تو کھونٹی سے اچکتے ہوئے اس پر سوار ہوتے اور بہت خراماں خراماں اس پر چلتے اگر دوسری جانب سے کوئی یکہ یا گاڑی آتی ہوئی دیکھ لیتے تو فوراً سائیکل سے اتر جاتے اور جب تک وہ گاڑی گزر نہیں جاتی

وہ سائیکل ہاتھ میں لے کر چلتے کہ مبادا کہیں گھوڑا یا بیل بگڑ جائے اور ان کی سائیکل سے ٹکرا جائے۔ اس طرح تاجپور سے اکبرپور کا چار میل کا راستہ دو ڈھائی گھنٹے میں وہ طے کرتے۔ اکثر یہ ہوتا کہ جو طلبا چھٹی کے بعد پیدل ان کے ساتھ اکبرپور سے نکلے وہ ان سے پہلے تاجپور پہنچ گئے۔

امراؤ دادا اکبرپور مڈل اسکول میں تاریخ کے استاد تھے ہم نے توفیض آباد میں تعلیم پائی اس لئے ہمیں ان سے براہِ راست پڑھنے کا کبھی شرف حاصل نہیں ہوا۔ لیکن داستان گوئی میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ قرونِ اولیٰ کا قصہ جب وہ بیان کرتے تو سماں باندھ دیتے اور اتنی تفصیل سے اس کی جزئیات بیان کرتے کہ وہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ میں نے جب ہائی اسکول پاس کر لیا تو ایک دن ڈرتے ڈرتے امراؤ دادا سے آلہا اودل کی داستان سنانے کی فرمائش کر دی۔ انھوں نے ہماری درخواست قبول کر لی لیکن کہا کہ رات میں سناؤں گا سو نہ جانا۔ ہم کئی لڑکے ان کے گھر پہنچے۔ سرِ شام سے انھوں نے یہ داستان سنانا شروع کی۔ ہمیں بڑا مزا آیا۔ دو گھنٹے ہو گئے ہم جمائیاں لینے لگے تو امراؤ دادا بولے کہ "تم لوگوں کو نیند آ رہی ہے اس لئے باقی کل سناؤں گا۔" اس طرح وہ داستان کئی راتوں میں جا کر تمام ہوئی۔

امراؤ دادا کے سپرد اگر کوئی کام کر دیا جائے تو اسے بڑی توجہ اور دلچسپی سے کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا نرمی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کام کرانے والا یہ سمجھ لیتا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے امراؤ میاں کام پورا ہی کر کے دم لیں گے، وہ اپنی دھن کے پکے ہیں اور اپنے اصول میں کسی رو رعایت

سے کام نہ لیں گے۔

پاکستان کے سیاسی لیڈر سیاست سے دولت کماتے ہیں اور اس میں داخل ہو کر پرمٹوں۔ لائسنسوں اور الاٹمنٹوں سے اپنی جیبیں بھرتے ہیں، لیکن غیر منقسم ہندوستان میں کانگریسی اور مسلم لیگی سیاسی لیڈر اپنی دولت لٹایا کرتے تھے۔ سی آر داس اپنی ساری دولت لٹا کر کانگریس میں داخل ہوئے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے اپنی لاکھوں روپئے کی کوٹھی کانگریس کو دے دی۔ مولانا محمد علی نے جاورہ کی وزارت عظمیٰ کو لات مار کر اخبار کی ایڈیٹری قبول کر لی اور زندگی بھر عسرت کی زندگی بسر کی۔ مولانا حسرت موہانی جو علی گڑھ یونیورسٹی میں اوّل آئے تھے اور بڑی سے بڑی ملازمت حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے سیاست میں غریبی اور مشقت کی زندگی کو ترجیح دی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے ہزاروں روپے ماہوار کی سرکاری ملازمتوں کو بار بار ٹھکرا کر جامعہ ملیہ دہلی کی پچاس روپے ماہوار کی ملازمت کو ترجیح دی۔ میرے والد خواجہ خلیل احمد نے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ تجارت کو ملازمت پر ترجیح دی۔ ابتدا میں ان کی تجارت خوب چمکی۔ جب خلافت تحریک شروع ہوئی تو وہ تجارت سے بے پرواہ ہو کر اس میں شامل ہو گئے، اور اپنا لاکھوں روپئے کا کاروبار اس پر نچھاور کر دیا۔ میرے مکان پر کانگریسی اور خلافتی والنٹیروں اور کارکنوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی جن کے کھانے پینے کے سارے اخراجات میرے والد برداشت کرتے تھے۔ اس طرح سے اگر قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو ختم ہو جاتا۔ میرے والد کی کمائی ہوئی ساری دولت کانگریس اور خلافت

کے نذر ہوگئی۔ احمد آباد میں جب کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں مولانا حسرت موہانی نے آزادئ ہند کی شہرۂ آفاق قرارداد پیش کی میرے والد اس کے خاص نمائندوں میں تھے اور پانچ ہزار والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ بعد ازاں جب نہرو رپورٹ کے بعد سارے بڑے بڑے مسلمان لیڈر کانگریس سے علیحدہ ہو گئے۔ میرے والد بھی مسلم لیگ کے ایک سرگرم کارکن ہو گئے۔ اور انھوں نے تحریک پاکستان میں نمایاں اور پرجوش حصہ لیا۔

فروری ۱۹۲۵ء میں میری دونوں بڑی بہنوں کی شادی تھی۔ میرے والد کا پیسہ بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ لیکن جو باقی تھا وہ انھوں نے اس شادی پر لگا دیا شادی بڑے دھوم دھام سے کی۔ تاجپور کا دیہات شہر معلوم ہوتا تھا۔ سارے قرب و جوار کے کانگریسی خلافتی لیڈر اور کارکن شادی میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے ہزاروں کا مجمع تھا لیکن سب کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا بہت معقول انتظام کیا گیا تھا سستی کا زمانہ تھا۔ اشیائے خوردنی کے گودام (مودی خانے) کا چارج امراؤ دادا ایسے سخت گیر اور با اصول آدمی کے سپرد تھا۔ کیا مجال تھی کہ بغیر اجازت ایک دانہ بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے اور کوئی شخص بیقاعدگی سے دیا سلائی کی ایک ڈبیہ بھی حاصل کرلے۔ امراؤ دادا مودی خانے کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے حقہ گڑگڑایا کرتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ جب تک کوئی شخص خلیل میاں کی دستخط کردہ پرچی نہ لائے کوئی چیز اسے نہ دی جائے۔ باورچیخانہ قریب ہی تھا وہاں بڑے پیمانے پر بارات کا ہر قسم کا کھانا پک رہا تھا۔ لکھنؤ اور جونپور سے باورچی بلوائے گئے تھے۔ ایک بار ایک باورچی دوڑا دوڑا آیا، تا وُ خراب

ہو رہا تھا کہنے لگا امراؤ میاں تھوڑا سا گھی چاہیئے شاہی ٹکڑے میں گھٹ گیا ہے امراؤ دادا نے کہا کہ "خلیل میاں کی پرچی لائے ہو"۔ کہنے لگا "نہیں"۔ امراؤ دادا نے گھی دینے سے انکار کر دیا۔ باورچی کے آدمی میرے والد کی تلاش میں دوڑے وہ زنان خانے میں گئے ہوئے تھے۔ بہ مشکل انہیں اطلاع کرائی گئی، جب انھوں نے پرچی لکھ کر دی تو امراؤ دادا نے باورچی کو گھی دیا۔

امراؤ دادا نے اس شادی میں مودی خانے کا اتنا معقول انتظام کیا کہ ایک رتی بھر چیز بھی خلیل میاں کی اجازت کے بغیر ادھر سے اُدھر نہیں ہوئی۔ ان کے سپرد زعفران۔ خشک میوہ۔ ہر قسم کے مصالحہ جات۔ اجناس گھی۔ تیل۔ مکھن، بسکٹ، ڈبل روٹی وغیرہ سبھی کچھ مودی خانہ میں اسٹور کیا ہوا تھا۔ لیکن اس میں سے پستہ بادام کا ایک دانہ بھی ان کے لئے حرام تھا۔ ایسے موقعوں پر تعینات حضرات تو خود بھی خوب جی بھر کے شکم سیری کرتے ہیں، اور اپنے دوستوں کی اس سے تواضع بھی کرتے ہیں، اور اگر موقع ملتا ہے تو کچھ مال مصالحہ گھر بھی پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن امراؤ دادا ایسے با اصول اور محتاط آدمی کے لئے یہ بات بعید از قیاس تصور کی جاتی تھی۔ اس لئے لوگ ان کی اصول پرستی کی عزت کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد امراؤ دادا کے بچے بھی پاکستان ہجرت کر کے آگئے، اور پاکستان کے ابتدائی زمانے میں امراؤ دادا کا کراچی میں انتقال ہوا۔

بھائی نظام الدین

بھائی نظام الدین کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بلیا کے رہنے والے نہیں ہیں۔ ان کا پستہ قد۔ قدرے بھاری بھرکم جسم۔ تنگ پیشانی۔ چپٹی ناک۔ جلدی جلدی بات کرنے کی عادت اور چہرہ کی بدحواسی ان کے "بلیاٹک" ہونے کی غمازی کرتی ہے۔ تقریباً چھتیس سال ہوئے ہم دونوں الہ آباد یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ میں بی اے کا اور وہ بی ایس سی کے طالب علم تھے۔ ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں ہم رہتے تھے۔ لیکن وہ جیسے پہلے ہو لو خبطو تھے ویسے ہی آج ۱۹۷۴ء میں بھی ہیں۔ جبکہ وہ ایک بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہیں۔ زمانہ کے نشیب و فراز اور عمر کی پختگی کا ان پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ درحقیقت ایسا "زمانہ پروف" شخص ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا۔

بھائی نظام الدین بلیا کے ایک سربرآوردہ خاندان کے فرزند ہیں۔ ان کے

والد نذیر الدین صاحب بلیا کے چوٹی کے وکیل اور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ بدحواسی میں وہ طاق تھے اور اسی لئے احباب نے ان کے نام کے ساتھ "جھپٹ" کا اضافہ کر دیا تھا۔ مخیر ایسے کہ ابھی کوئی قیمتی چیز بازار سے لائے کسی دوست نے تعریف کر دی اور فوراً اسے بطور تحفہ پیش کر دی۔ اسی لئے اکثر بدحال رہتے تھے اور دوست ان کی اس صفت سے کافی فائدہ اٹھاتے تھے۔

بھائی نظام الدین کو یہ بدحواسی ورثہ میں ملی ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں انھیں چائے پینے کا خبط تھا اور چائے بھی پیالیوں کے حساب سے نہیں بلکہ کیتلیوں کے حساب سے پیا کرتے تھے۔ دودھ شکر سے بے نیاز صرف چائے کا گرم پانی پیتے تھے۔ انجام کار کثرت پیشاب کے مرض میں مبتلا رہتے تھے۔ پیشاب خانہ کا راستہ میرے کمرے کے قریب سے گزرتا تھا۔ جب دیکھو بھائی نظام الدین میرے کمرے کے سامنے برآمدے میں سلیپر سر سڑاتے ہوئے پیشاب خانے کو جا رہے ہیں۔ گرمیوں کے ایام میں جب طلبا زیادہ تر برآمدے میں سوتے تھے۔ بھائی نظام الدین کی یہ سڑسڑاہٹ بہت تکلیف دہ معلوم ہوتی تھی، اور اکثر احباب انھیں ٹوک دیا کرتے تھے کہ بھائی اپنے کمرے میں کوئی پاٹ وغیرہ رکھ لو کیوں ہم لوگوں کو سونے نہیں دیتے۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

بی ایس سی کرنے کے بعد بھائی نظام الدین نے ایم ایس سی میں ریاضی کا مضمون لیا۔ قدرت نے انھیں غیر معمولی ذہن عطا کیا تھا اور اس طرح اپنی بہت سی کم بختیوں کا ازالہ کر دیا تھا۔ بھائی نظام الدین کو اپنے کمرے میں

پڑھتے ہوئے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا۔ اسی لئے ہر سال ان کا شمار فیل ہونے والے طلبار میں کیا جاتا تھا لیکن جب نتیجہ برآمد ہوتا تو یہ اندازہ غلط ثابت ہوتا اور بھائی نظام الدین بہت اچھے ڈویژن میں کامیاب ہوتے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے اندر جہاں ہیں اور بھائی نظام الدین اقامت پذیر تھے۔ ٹینس کے دو تین کورٹ واقع تھے۔ جہاں موسم سرما میں سارے دن ٹینس کھیلی جایا کرتی ہے۔ ابھی ایک "پیر" (PAIR) کھیل سے فارغ ہوا تو دوسرا اس کی جگہ لینے کے لئے موجود ہوتا۔ غرضکہ یہ مشغلہ دن بھر جاری رہتا۔ بھائی نظام الدین کا شمار کھیلنے والوں میں نہیں بلکہ تماشائیوں میں ہوتا تھا۔ وہ ٹینس کورٹ کے ایک سرے پر کرسی ڈالے کھیل کا لطف اٹھایا کرتے تھے، اور اچھے اسٹروک پر واہ واہ کے نعرے لگاتے۔ کبھی کبھی ان کے ہاتھ میں کورس کی کتاب بھی ہوتی تھی، جس پر وہ دزدیدہ نظر ڈال لیا کرتے تھے۔ کیونکہ سالانہ امتحانات قریب ہوتے تھے۔ ریاضی ایسے تجریاتی مضمون جس میں بڑے مشق کی ضرورت ہوتی ہے اس کے سوالوں کو کاغذ پنسل کے بغیر دماغ سے زبانی حل کرنا یہ بھائی نظام الدین ایسے ذہین طالب علم کا کام تھا۔ ہم نے کسی ریاضی داں کو اس طرح سوالات حل کرتے نہیں دیکھا۔ جس سال وہ ایم ایس سی فائنل میں تھے انھوں نے زیادہ تر وقت ٹینس کورٹ پر گزارا۔ طلبار کو اندیشہ تھا کہ امسال وہ ضرور فیل ہوں گے۔ لیکن جب نتیجہ برآمد ہوا تو سب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے اور ساتھ ساتھ پوزیشن بھی حاصل کی۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔ اس پر کتنی بھی پالش کر دی جائے اندر سے وہ پیدائشی صفات کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ماحول کا اثر اس کے ظاہری

ٹیپ ٹاپ میں تبدیلی پیدا کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ طلباء دنیاوی زندگی کے لیے بہت موزوں پائے جاتے ہیں۔ اور اس میں بہت کامیاب رہتے ہیں۔ وہاں بدھو سے بدھو طالب علم پر ایسا روغن قازملا جاتا ہے کہ وہ بھی چاق چوبند ہو جاتا ہے اور گونگے سے گونگے طلباء کو ایسا پڑھایا جاتا ہے کہ وہ بھی بولنے لگتے ہیں۔ لیکن میں ایک ایسے علیگ کو بھی جانتا ہوں کہ جو وہاں چار سال زیرتعلیم رہنے کے باوجود جھینپو ہی رہے اور اپنے افسروں سے اس طرح بھاگتے ہیں جیسے گائے قصائی سے اور ان سے نظر ملانے سے بھی کتراتے ہیں۔

یہ پرانا مقولہ ہے کہ "جینیس سنکی ہوتی ہے"۔ دانشوروں اور فلاسفروں میں یہ صفت اکثر دیکھنے اور سننے میں آتی ہے۔ ڈیو جانس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دن بھر اپنے ٹب میں بیٹھا رہتا تھا۔

شہرۂ آفاق ریاضی داں ڈاکٹر ضیاء الدین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے کھوئے رہتے تھے کہ تن بدن کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ چار اشخاص کی دعوت کا اہتمام کرتے تو چار درجن حضرات کو دعوت دے دیتے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو بستر پر دراز ہوتے تو چھڑی کو گوشہ میں کھڑی کر دیتے۔ ایک بار خیال میں ایسے مست تھے کہ چھڑی کو تو بستر پر دراز کر دیا اور خود گوشہ میں اس کی جگہ جا کھڑے ہوئے اتفاق سے گھر والی کا وہاں گزر ہوا تو اس نے یہ ماجرا دیکھا اور ڈاکٹر صاحب کو پکڑ کر بستر پر دراز کیا۔ پروفیسر رانا ڈے کی سنک تو راقم الحروف نے بچشم خود ملاحظہ کی ہے۔ وہ اپنی وضع قطع اور لباس سے نارمل انسان نہیں معلوم ہوتے تھے۔ لیکن جب بولتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ علم کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ایسے حضرات پر

جو جینیس ہوتے ہیں زمانے کی چھاپ مشکل سے پڑتی ہے۔ اور ماحول کا اثر وہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے اس لئے وہ عام دنیاوی زندگی کے لئے موزوں نہیں ہوتے اور اپنی خصوصیات کو وہ ہر طرح اور ہر حالت میں برقرار رکھتے ہیں۔ بھائی نظام الدین کی بدحواسی اور ہولوپن کچھ اسی قسم کی ہے۔ ان کے لئے یونیورسٹی کی پروفیسری یا سائنس کی تجربہ گاہ زیادہ موزوں جگہ تھی جہاں ان کی یہ بدحواسی زیادہ بدنما نہ معلوم ہوتی بلکہ بعض اوقات تو یہ اچھی صفت تصور کی جاتی، لیکن عام ملازمتوں میں بدحواسی بہت مہلک بیماری سمجھی جاتی ہے۔ جو بسا اوقات بیمار کو لے ڈوبتی ہے۔

پاکستان میں بحیثیت انفارمیشن افسر مجھے ایک ایسے سیول سرونٹ سے سابقہ پڑ چکا ہے جو حد درجہ سنکی تھے۔ اور اس کے باوجود وہ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے اس کے آخری زینے تک پہنچ گئے۔ اس ترقی میں ان کی سنک سے زیادہ ان کے مزاج کی درشتی اور ذاتی تعلقات کا دخل تھا۔ ان کے ماتحت ان سے ایسے کانپتے تھے جیسے قصائی سے گائے کانپتی ہے، اور ان کے حکام بالا بھی ان کی گرم مزاجی سے ڈرتے تھے کہ خدا جانے کس وقت ہاتھا پائی کی نوبت آجائے، اس لئے اس بلا کو دور ہی رکھو اور اسے ناراض نہ کرو۔ ورنہ اپنی عزت خاک میں مل جانے کا خطرہ ہے۔ جس طرح شرفاء غنڈوں کو منہ نہیں لگاتے اور ان سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح ان صاحب بہادر کے افسران ان کی گرم مزاجی سے خوف کھاتے تھے۔ یہ حضرت انتہائی سنکی واقع ہوئے تھے۔ ان میں قوتِ فیصلہ کی بھی بڑی کمزوری تھی، اس لئے اسٹنوگرافر سے اپنے خطوط چار چار بار ٹائپ کرایا کرتے تھے۔ ایک بار خط اسٹنوگرافر کو لکھا دیا۔ وہ ٹائپ کر کے لایا

تو دوبارہ اس کی تصحیح کی اور جو کچھ لکھایا تھا۔ اس میں ترمیم اور تنسیخ کردی۔ اس طرح کبھی کبھی وہ ایک خط سات سات آٹھ آٹھ بار ٹائپ کراتے تھے ان کے متعدد اسٹینو گرافر تھے جو اپنے کام میں بہت ماہر تھے اور شاذ و نادر ہی کبھی غلط ٹائپ کرتے تھے لیکن ان سے سخت تنگ رہتے اور بیحد گھبراتے تھے۔ ان کے سکریٹری کا تو یہ حال تھا کہ جب کبھی اس کی طلبی کی گھنٹی بجتی تو ایسے محسوس ہوتا کہ ملک الموت کا پروانہ آگیا ہے۔ صاحب بہادر کے کمرے میں اجازت لے کر پہنچتا تو کھڑا کھڑا ڈانٹ سنتا رہتا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی خلاف فطرت یہ صاحب بہادر مجھ سے بہت خوش رہتے تھے۔ وہ پبلسٹی کے بڑے بھوکے تھے شاید ان کی توقع سے زیادہ میں ان کی پبلسٹی کر دیا کرتا تھا۔ خلافِ معمول وہ مجھے کمرے سے باہر چھوڑنے آتے تھے۔ جو خدمت انھوں نے شاید گورنر جنرل کی بھی سرانجام نہیں دی ہوگی۔

بھائی نظام الدین جو مزاج کے بہت نرم اور ٹھنڈے واقع ہوئے ہیں اس زمرے میں نہیں آتے ہیں۔ ان کی بدحواسی اور سنک ان کی بیوقوفی کی علامت سمجھی جاتی ہے اور ان کے ماتحت اسے ان کی کمزوری سمجھ کر اس سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان سے ڈرنے کے بجائے ان کی باتوں پر مسکراتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں قوت فیصلہ کی کمی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کسی معاملے میں یا فائل پر تبادلۂ خیال کرتے یا نوٹ لکھاتے ہوئے بھائی نظام الدین بجائے اس کے کہ اپنے ماتحتوں کی رہبری کرتے ان کے ماتحت افسران فیصلہ کن انداز میں انھیں مشورہ دیتے۔ اور اس طرح اختلاف رائے کرتے جیسے ایک افسر اپنے ماتحت کی رائے سے اختلاف کرتا بلکہ حکم دیتا ہو۔

ترقی پذیر ممالک اور خصوصاً پاکستان میں ایک یہ خرابی پائی جاتی ہے کہ یہاں افراد کے طبعی رجحان۔ قابلیت اور اہلیت کا خیال نہ کرتے ہوئے انہیں روزگار فراہم کیا جاتا ہے اور اکثر لوہار کا کام بڑھئی سے اور بڑھئی کا لوہار سے لیا جاتا ہے۔ اور مملکت خداداد پاکستان میں تو کوٹہ سسٹم نے اور بھی بیڑا غرق کر دیا ہے، اور اکثر و بیشتر غیر مستحقوں کو مستحقوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں کے سرکاری ملازمتوں میں نااہلی اور غیر موزونیت کے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں کہ بعض وقت غصہ کے ساتھ ہنسی آجاتی ہے کہ اونچی کرسی پر بیٹھنے والا اپنے فرائض کی اے بی سی ڈی سے بھی واقف نہیں ہے۔

مُمتاز حسن صاحب

دنیائے اسلام نے ایسی درجنوں شخصیتیں پیدا کی ہیں جنھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں علوم و فنون کی سرپرستی کی اور ان کی ترویج اور ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ ان میں خلیفہ عباسی مامون الرشید۔ اسپین کا اموی خلیفہ الحکم ثانی مصر کا فاطمی خلیفہ الحکیم بالامر اللہ سلطان محمود غزنوی۔ سلطان نوح بن منصور اور سلجوقی وزیر اعظم نظام الملک، طوسی سرِفہرست ہیں. اسلامی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں مسلمان حکمراں حکومت سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے اپنا زیادہ تر وقت علماء۔ فضلاء، سائنسدانوں اور مفکروں کی صحبت میں گزارا کرتے تھے اور ان کے علمی مباحث میں انتہائی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ الحکم ثانی نے اپنے نادر کتب خانہ کی چار لاکھ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، اور ان پر حواشی لکھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ وسطیٰ میں دنیائے اسلام نے مختلف علوم و فنون میں عظیم ترین شخصیتیں پیدا کی ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں سلطنت مغلیہ اور اودھ کے حکمرانوں نیز جونپور کے شرقی خاندان اور دکن کے بہمنی خاندان کے حکمرانوں نے علوم وفنون کی بڑی سرپرستی کی بانگریزوں کے عہد حکومت میں حیدرآباد۔ رامپور اور بھوپال کے درباروں نے بھی اسی سرپرستی کو قائم رکھا۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی درسگاہیں مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ دہلی۔ اور تصنیف وتالیف کے عظیم مرکز دارالمصنفین اعظم گڑھ اور دارالترجمہ حیدرآباد، قیام پاکستان کے بعد ہندوستان میں رہ گئے۔

پاکستانی علاقوں میں علوم وفنون کی خاطر خواہ ترقی نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں ان کی سرپرستی مفقود تھی۔ ان کی ترویج اور ترقی پر سرکاری سطح پر مطلق توجہ نہیں کی گئی۔ قیام پاکستان کے وقت ایک لاہور علوم وفنون کا اہم مرکز تھا جو ہمارے حصے میں آیا۔

پاکستان میں علوم وفنون کی سرپرستی زیادہ تر نجی کوششوں تک محدود رہی اور ان افراد میں ممتاز حسن صاحب کا نام سرفہرست ہے۔ ممتاز صاحب سے میرا غائبانہ تعارف تو قیام پاکستان کے بعد ہی سے تھا۔ ادبی اور ثقافتی انجمنوں سے ان کی وابستگی اور دلچسپی کے چرچے میں برابر سنتا رہتا تھا لیکن ان سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۶۷ء میں ہوئی جب وہ نیشنل بنک آف پاکستان کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔ اسی زمانے میں میں پاکستان اور بیرون پاکستان کے متعدد جرائد اور اخبارات میں اسلامی موضوعات پر مضامین لکھا کرتا تھا۔ مسلمان سائنس دانوں سے متعلق میرے سلسلہ وار مضامین پاکستان اسٹینڈرڈ کراچی۔ پاکستان ٹائمز لاہور۔ ڈان کراچی اور مارننگ نیوز

کراچی، ڈھاکہ میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے تھے۔ اسی زمانے میں میں ٹائمز آف انڈیا ہوم لائبریری کی کتاب "سو عظیم سوانح حیات" کے طرز پر انگریزی زبان میں اپنی کتاب "سو عظیم مسلمان" مرتب کر رہا تھا جسے خدا کے فضل سے ۱۹۷۱ء میں فیروز سنز لاہور نے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ اور برطانیہ کے شہرۂ آفاق مورخ اور صحافی پروفیسر رشبرک ولیمز نے اس کا پیش لفظ لکھا۔ اس زمانے میں ممتاز حسن صاحب سے کسی نجی محفل میں میری مٹ بھیڑ ہو گئی۔ انھوں نے سائنسدانوں سے متعلق میرے مضامین اخبارات میں پڑھے تھے۔ اس کی انھوں نے بڑی تعریف کی کہنے لگے:

"آپ بہت مفید کام کر رہے ہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ اس زمانے میں ہمارے نوجوانوں کو ادب اور شاعری۔ ناول اور افسانے سے کہیں زیادہ اپنے اسلاف کے سائنسی کارناموں سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔"

انھوں نے مشورہ دیا کہ میں مسلمان سائنسدانوں سے متعلق اپنے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کروں اور تاکید کی کہ یہ کتاب مختلف زبانوں میں شائع کی جائے۔

انگریزی زبان میں "سو عظیم مسلمان" کی ضخیم کتاب جو میں نے تصنیف کی تھی اس میں مسلمان سائنسدانوں سے متعلق بھی ایک باب تھا۔ اردو زبان میں اس باب کو ایک علیحدہ کتابی شکل میں "مشہور مسلمان سائنسداں" کے نام سے بعد ازاں اردو اکیڈمی نے شائع کیا۔ پاکستان کے نامور سائنس داں ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی ایف۔ آر۔ ایس (F.R.S) نے اس کا پیش لفظ لکھا اور ممتاز حسن صاحب نے اس کا تعارف لکھا جو بہت جامع تھا۔ ممتاز صاحب کو

اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر تعارف لکھنے میں کافی وقت لگا۔ میں نے ایک دن ان سے یونہی شکایتاً کہا: "ممتاز صاحب آپ تو روزانہ ریڈیو۔ اخبارات اور مختلف علمی اور فنی اداروں کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ آپ کے لئے تو چار یا پانچ صفحے کا تعارف لکھنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ گھنٹہ بھر لگے گا۔" کہنے لگے: "بھائی اس قسم کے مضامین لکھنے میں آپ ہی لوگوں سے مشورہ لیتا ہوں۔ آپ ہی لکھ لیں میں دستخط کردوں گا۔" میں نے جواب دیا: "اپنے منہ سے میں میاں مٹھو بننا نہیں چاہتا۔ یہ کام تو آپ ہی سرانجام دیں۔" چنانچہ کوئی چھ سات ماہ بعد انھوں نے مجھے خوش خبری سنائی کہ تعارف تیار ہوگیا ہے اور اس کی ایک نقل مجھے دیدی۔ اور کہنے لگے کہ اس میں مسلمان سائنسدانوں کے بارے میں جو دعوے کئے گئے مغربی مصنفین کی تحریروں سے اس کی تصدیق کرادیں۔ ممتاز صاحب نے اس میں ایک جگہ لکھا تھا، کہ ابن نفیس نے ہاردے سے تین صدی قبل دوران خون کا اصول دریافت کرلیا تھا اور الہیثم کی نوریات" کی خوشہ چینی لیونارڈو ونچی اور راجر بیکن نے کی تھی۔ میں نے اس کی تصدیق جارج سارٹن اور فلیپ کے ہٹی کی تصانیف سے کرادی۔

ممتاز حسن صاحب بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ وہ اپنے بڑے ہونے کے باوجود بہت منکسر المزاج تھے۔ چھوٹے آدمیوں سے وہ بہت جھک کر ملتے تھے، اور انھیں اس بات کا مطلق احساس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کسی بڑے آدمی سے مل رہے ہیں، ایک بار شام کا وقت تھا میں ان کے ساتھ لان پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے بنک کا ایک جمعدار (مہتر) اپنے بیٹے کے ہمراہ ان سے ملنے آیا۔

ممتاز صاحب اسے پہچانتے نہ تھے۔ اس نے سلام کر کے اپنا تعارف کرایا۔ ممتاز صاحب نے فوراً کھڑے ہو کر اس سے مصافحہ کیا۔ اُسے اور اس کے بیٹے کو کرسی پیش کی۔ آنے کا مدعا پوچھا۔ جمعدار نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے سیکنڈ ڈویژن میں ہائی اسکول امتحان پاس کیا ہے۔ اسے نوکری چاہیئے۔ ممتاز صاحب بہت خوش ہوئے اس کی پیٹھ ٹھونکی، کہنے لگے "دو سال اسے اور پڑھاؤ۔ انٹر کر لینے دو۔ اگر سیکنڈ ڈویژن میں اس نے انٹر کر لیا تو بنک میں اسے افسر بنا دوں گا۔ میرا وعدہ ہے" جمعدار کی خاطر و مدارات کر کے انھوں نے خوش خوش اسے رخصت کیا۔

ممتاز صاحب کو علوم وفنون سے دلی لگاؤ تھا۔ ان کا دولت کدہ مختلف علوم وفنون کے پرستاروں اور ماہروں کی جولانگاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ممتاز حسن صاحب دانشور زیادہ اور ماہر مالیات اور بنکار کم تھے۔ وہ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ انھیں دانشوروں کی صحبت کے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ ایک بار کہنے لگے:

"بھائی۔ میں اپنے آپ کو بنکار صرف تین گھنٹے کے لئے سمجھتا ہوں۔ دس بجے دن کو بنک جاتا ہوں اور ایک ڈیڑھ بجے واپس آجاتا ہوں۔ وہاں عجیب عجیب دنیا سازوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن دن کا زیادہ تر باقیماندہ وقت ادیبوں اور دانشوروں کی صحبت میں صرف کرتا ہوں۔ آپ جو مجھ میں تھوڑی بہت انسانیت دیکھتے ہیں وہ انھیں کے فیض کا نتیجہ ہے"۔ علمی مشاغل سے انھیں دلی لگاؤ تھا

ممتاز حسن صاحب گھر پر اکثر بے تکلف غیر رسمی لباس میں رہتے تھے۔ ایک بار وہ اپنے برآمدے میں لنگی اور بنیائن پہنے بیٹھے تھے۔ احباب کی محفل گرم تھی۔ اس میں ایک بریگیڈیر صاحب تھے۔ ایک مشہور شاعرہ اور ان کے شوہر

تھے اور دو تین حضرات تھے جن کو میں نہیں جانتا تھا۔ شاعرہ کہنے لگیں: "ممتاز صاحب آپ اقبال کے پرستار ہیں۔ آپ نے ان کا گھریلو لباس بھی اختیار کر لیا ہے صرف ایک حقّے کی کسر ہے۔" ممتاز صاحب اور حاضرین نے اس پر قہقہہ لگایا۔

ممتاز صاحب بڑے علم دوست انسان تھے۔ وہ پاکستان میں علوم و فنون کے سب سے بڑے سرپرست ہوئے ہیں۔ پاکستان کی مختلف ادبی، علمی اور فنّی انجمنوں کے وہ روح رواں تھے۔ انجمن ترقی اردو۔ اردو ترقی بورڈ۔ اقبال اکیڈمی۔ ادارہ آثار قدیمہ پاکستان کی ترویج اور ترقی میں ممتاز حسن صاحب کی انمٹ چھاپ پائی جاتی ہے۔ انھوں نے معلوم نہیں کتنے ادیبوں اور فنکاروں کی سرپرستی کی اور انھیں روزگار فراہم کیا۔ علامہ نیاز فتحپوری کو انھیں نے پاکستان عجائب گھر کے کتب خانہ کی فہرست تیار کرنے پر مامور کیا اور انھیں ایک ہزار روپے ماہوار کی خطیر رقم کی پیش کش کی۔

ممتاز صاحب صحیح معنوں میں ایک شریف آدمی تھے کارڈینل نیومین (CARDINAL NEWMAN) نے شریف آدمی کی تعریف کی ہے کہ

"وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتا۔"

ممتاز صاحب اس لحاظ سے واقعی شریف انسان تھے۔ دل آزاری کو وہ گناہ سمجھتے تھے۔ اور دوسروں کی خوشی کو اپنی خوشی تصور کرتے تھے۔ وہ وضعداری اور اخلاق کا پیکر تھے۔ اور اسلاف کی انھیں خوبیوں پر وہ فخر کیا کرتے تھے۔

عرصہ دراز تک پاکستان کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود ممتاز صاحب نے کوئی بنک بیلنس نہیں چھوڑا بس ایک ذاتی مکان ہے، سنا ہے وہ بھی زیر بار ہے اس مملکت خداداد کے گندے معاشرے میں یہ کتنی انوکھی مثال ہے۔

ممتاز صاحب بیسویں صدی کی سائنسی اور فنی ترقی سے بہت متاثر تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ زمانہ وسطیٰ میں سائنس اور فنون کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اور افسوس کرتے تھے کہ اب یہ دوسروں کے ہاتھ میں چلی گئی اور مسلمان عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کتنی بار اس کی خواہش ظاہر کی:

"میں اکیسویں صدی کو طلوع ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ دیکھ سکوں کہ سائنس نے دنیا کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے"۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور ۲۸ ؍ اکتوبر ۱۹۷۴ء کو وہ اس دار فانی سے عالم جاودانی کی جانب کوچ کر گئے۔

ممتاز صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ ایسی پہلو دار شخصیت دیکھیے اب پاکستان میں کب پیدا ہوتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

طُفیل احمد جمالؔی

دنیا میں ایسی شخصیتیں کم ہوں گی جو بھلانے سے بھی بھلائی نہیں جا سکتی ہیں۔ طفیل احمد جمالی بھی انھیں میں سے ایک تھے۔ ایسا باغ و بہار بذلہ سنج اور آزاد منش انسان میری نظر سے نہیں گزرا۔ قدرت نے اُسے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن زمانہ نے اس کی قدر نہ کی اور اس کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔

جمالی کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ الہ آباد یونیورسٹی کے ایک ہونہار طالب علم تھے اور روشن باغ میں سکونت پذیر تھے۔ میں بھی وہیں رہتا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے اور کئی عزیزوں کے ہم جماعت تھے۔ اکثر ان کی صحبتوں میں جمالی کو دیکھتا تو ہندی کی وہ مثل یاد آجاتی۔ ”ہونہر بروا کے چکنے چکنے پات“۔ ان کی ذہانت اور ذکاوت اس وقت بھی ان کے چہرہ سے عیاں تھی۔ اس زمانے میں وہ

اپنی پُرتاثیر شاعری اور اشعار کو پڑھنے کے اچھوتے انداز کی وجہ سے طلبا کی محفلوں میں بہت مقبول تھے۔

قیام پاکستان سے کچھ ہی پہلے کا ذکر ہے۔ میں مسلم ہائی اسکول فتحپور میں معلم تھا۔ اس اسکول میں سالانہ مشاعرہ بڑے دھوم دھام سے منعقد کیا جاتا تھا۔ اس میں ملک کے نامور شعرا شرکت کیا کرتے تھے۔ اس میں جگر مرادآبادی۔ حفیظ جالندھری روش صدیقی۔ خمار بارہ بنکوی ایسے شہرہ آفاق شعرائے نے شرکت کی تھی۔ الہ آباد لکھنؤ اور کانپور کے شعراء تو خصوصی طور پر شرکت کیا کرتے تھے۔ غالباً ۱۹۴۰ء کا سال تھا مجھے الہ آباد کے شعرائے کرام کو فتحپور لانے کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ ابھی تک مشاعروں میں ٹکٹ لگانے کی بدعت شروع نہیں ہوئی تھی۔ مشاعرے عموماً چندے سے ہوا کرتے تھے اور شعرائے کرام عموماً ریل کے تیسرے درجے میں سفر کرتے تھے میں بھی الہ آباد سے تین چار شعراء کو اپنے ساتھ فتحپور لایا۔ ان میں سے ایک طفیل احمد جمالی بھی تھے۔ ہم لوگ ٹرین کے تیسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ اتفاقاً میرے ایک دوست انٹر کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ایک اسٹیشن پر ان سے مٹ بھیڑ ہو گئی اور میں ان کے ساتھ گپ شپ کرنے کے لئے ان کے درجے میں چلا گیا۔

مشاعرہ اسی رات دس بجے شروع ہو گیا۔ اس میں متعدد نامور شعراء نے شرکت کی تھی۔ جگر صاحب بھی تشریف لائے تھے لیکن طفیل احمد جمالی نے سماں باندھ دیا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انھوں نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ انھوں نے میرے انٹر کلاس میں سفر کرنے اور شعرائے کرام کو تھرڈ کلاس میں لانے پر ایک

دلچسپ قطعہ کہہ دیا جو کافی جاندار تھا۔ مجھے اس وقت وہ یاد نہیں ہے۔ اس قطعہ کو سن کر محفل زعفران زار بن گئی۔

پاکستان بنا۔ ہم لوگ سب پاکستان آ گئے۔ طفیل احمد جمالی امروز لاہور سے منسلک ہو گئے۔ اور کوہ کن کے قلمی نام سے اپنا شہرہ آفاق فکاہیہ کالم "گر تو برا نہ مانے" لکھا کرتے تھے جو علمی اور ادبی حلقوں میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا اور سرکاری حلقوں میں اکثر اس سے ہلچل مچ جاتی تھی۔ پاکستان کے صاحبان اقتدار کی لغزشوں پر ایسا بے لاگ تبصرہ کسی دوسری جگہ دستیاب ہونا محال ہے۔ اس میں بڑی جاندار چوٹیں ہوتی تھیں۔ افسوس ہے کہ جمالی نے اپنے فکاہیہ کالم "گر تو برا نہ مانے" اور اپنے دل پذیر اور دلکش اشعار کو کتابی شکل میں شائع کرنے پر کبھی توجہ نہ دی۔ اب یہ پاکستان رائٹرز گلڈ کا فرض ہے کہ وہ اس کو کتابی شکل دے۔ میں نے ایک بار ان سے شکایت کے طور پر کہا کہ "تم نہ اب مشاعروں میں شریک ہوتے ہو نہ اپنے اشعار کو کتابی شکل میں شائع کرتے ہو کہ لوگ اس سے محظوظ ہوں"۔ انھوں نے اس کو ہنس کر ٹال دیا۔

جمالی بڑی سیمابی طبیعت کے مالک تھے۔ شعرا اور ادبا کی ایک یہ بھی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ کہیں جمتے نہیں ہیں، اور کہیں جم کر کام نہیں کر سکتے۔ جمالی میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی تھی۔ امروز سے سبکدوش ہونے کے بعد معلوم نہیں وہ کہاں کہاں رہے اور کیا کیا کرتے رہے۔ ایک دن مجھے پتہ چلا کہ وہ پاکستان نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ میں افسر تعلقات عامہ ہو گئے ہیں اس وقت اس کا دفتر

شاہراہ اتاترک پر تھا۔ جس کے سامنے اب انکم ٹیکس کا مرکزی دفتر ہے۔ ایک دن ان کے کمرے میں پہنچا تو محفل احباب گرم تھی۔ قہوے کے دور میں گپ شپ جاری تھی۔ لیکن طفیل احمد جمالی ایسا آزاد منش انسان بھلا سرکاری دفتروں کی پابندیوں کو کہاں اور کب تک برداشت کرسکتا تھا۔ غالباً سال ڈیڑھ سال بعد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے۔ اب پھر وہی جمالی تھے اور صحرائے صحافت کی بادیہ پیمائی۔

جون ۱۹۶۲ء میں برطانوی محکمہ اطلاعات سے میں بحیثیت پریس افسر منسلک ہوگیا تھا۔ میرے فرائض میں ایک اہم فریضہ یہ بھی تھا کہ میں ایڈیٹروں سے مل کر برطانوی اطلاعات سے جاری کردہ چیزیں۔ مضامین۔ فیچر اور تصاویر وغیرہ کو پاکستانی اخبارات اور جرائد میں جگہ دلانے کی کوشش کروں۔ اس سلسلے میں تقریباً روزانہ میں پاکستانی ایڈیٹروں سے ملنے جایا کرتا تھا۔

ایک دن خبر ملی کہ طفیل احمد جمالی روزنامہ انجام کے ایڈیٹر مقرر ہوئے ہیں۔ دو تین دن بعد میں ان سے ملنے انجام کے دفتر گیا۔ رسمی مبارک باد کے بعد میں نے انھیں بتایا کہ میں اب برطانوی محکمہ اطلاعات سے منسلک ہوگیا ہوں۔ انھیں اس پر بڑا تعجب ہوا۔ کہ میں نے حکومت پاکستان کی ملازمت کو چھوڑ کر حکومت برطانیہ کی ملازمت اختیار کرلی ہے۔ ایک دن جب میں نے برطانوی مضامین کو انجام میں استعمال کرنے کے لئے ان سے کہا تو وہ بیساختہ بولے "نہیں بھائی یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ نے اگر ملکہ کی غلامی دوبارہ اختیار کرلی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں بھی ان کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں پہن لوں۔ میں نے تو بہت پہلے اس کو اتار پھینکا ہے۔" میں جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ

سے برطانوی سامراج کے سخت مخالفوں میں رہے ہیں۔ اس دن میری ان سے کافی بحث رہی۔ میں نے انھیں بتایا کہ جہاں تک برطانوی سامراج کا تعلق ہے میں اس کا اتنا ہی مخالف ہوں جتنا کہ خود جمالی ہے اور میں نے برطانوی حکومت اور سامراج کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن میں نے ان سے کہا کہ شاید تمھیں یاد نہ ہو قیام پاکستان سے قبل گاندھی جی نے ایک بار بیان دیا تھا کہ کانگریسی وزارتوں کو حضرت عمر فاروق کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اسی زمانے میں ایک مسلم لیگی لیڈر سے میری ملاقات ہوئی جو اس بیان پر سخت چراغ پا تھے کہنے لگے کہ گاندھی جی کو حضرت عمر کی بات کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے، ہم نہیں ملنتے اس کی بات" میں نے کہا کہ گاندھی اگر کہے کہ سچ بولو۔ نماز پڑھو تو آپ سچ بولنا اور نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے"۔ اس پر وہ لاجواب ہو گئے۔ میں نے جمالی سے کہا کہ تمھیں تو معلوم ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کرنے کے ساتھ مغربی علوم و فنون کا بھی کافی عرصہ تک بائیکاٹ کیا جس کی وجہ سے وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔ سر سید احمد خاں نے جب مسلمانوں کو مغربی علوم و فنون کے حصول کی تلقین کی تو انھیں نیچری، اور کافر گردانا گیا۔" جمالی خاموش ہو گئے۔ میں نے ان سے مزید براں کہا کہ بھائی غیر مسلموں نے مسلمانوں کی اچھی باتیں اختیار کر لیں اور ہم نے انھیں چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے برگزیدہ پیغمبرؐ کا تو ارشاد ہے کہ "علم حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ دستیاب ہو۔" اگر کسی قوم میں کچھ اچھی باتیں ہیں تو ہم کیوں نہ انھیں اختیار کریں۔" اس پر جمالی لاجواب ہو گئے۔ بولے اچھا دکھاؤ کیا لائے ہو، ہمارے

اخبار کے لئے۔ میں نے انھیں برطانیہ میں سائنس کی ترقی۔ بچوں کی تعلیم۔ معذور لوگوں کی دیکھ بھال سے متعلق چند باتصویر تعلیمی اور سائنسی فیچر دکھائے۔ جنھیں انھوں نے سرسری نظر سے دیکھا اور جگہ جگہ سے پڑھا وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ ایسی معلومات کی تو پاکستانیوں کو سخت ضرورت ہے۔" اس کے بعد سے روزنامہ انجام برطانوی فیچر سلسلہ وار شائع کرتا رہا۔ اسی زمانے میں قاہرہ میں پی آئی اے کے بوئنگ ۷۰۷ کی افتتاحی پرواز کا حادثہ پیش آیا جس میں پاکستان کے بہت سے نامور صحافی خدا کو پیارے ہو گئے۔ جمالی کا بھی جانے والوں کی فہرست میں نام تھا لیکن غالباً وہ کراچی ایرپورٹ دیر سے پہنچے۔ خدا نے خیر کیا ورنہ ان کا نام بھی مرحومین میں ہوتا۔

انجام میں بھی جمالی زیادہ عرصہ تک ٹک نہ سکے۔ بعد ازاں ان کی جگہ شوکت صدیقی نے لے لی۔ اور جمالی پاکستانی صحافت کی بادیہ پیمائی میں لگ گئے۔ ایک دن پتہ چلا کہ چین روانہ ہو گئے ہیں۔ وہاں کے کسی اخبار میں جگہ مل گئی ہے۔ سوچا کہ چلو اب تو کچھ عرصہ تک انھیں ذہنی سکون ملے گا۔ اور دعا کی کہ خدا انھیں استقلال عطا کرے۔ اپنے لئے نہیں تو اپنے بیوی بچوں ہی کے لئے۔ ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اور اس بندھن کے بعد بڑے سے بڑا سیلانی بھی اپنی ذمہ داری محسوس کرنے لگتا ہے اور بردبار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے شادی کو بیل کے جوا ٹھ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ لیکن جمالی صاحب چین میں زیادہ عرصہ ٹک نہ سکے۔ اور غالباً تین سال بعد کراچی میں براجمان ہو گئے۔ ایوب خاں حکومت کے آخری دور اور اس کے بعد کے زمانے میں آزاد صحافت کی فضا پاکستان میں بہت

خراب ہو چکی تھی۔ نیز کاغذ کی گرانی نے اخباروں کے حجم کو بہت گھٹا دیا تھا۔ اور چھوٹے موٹے اخبار تو دم توڑ چکے تھے۔ ایسے ماحول میں جمالی کے لئے صحافت کا میدان بہت تنگ ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اور ذرائع تلاش کرنے پڑے۔ دو ڈھائی سال ہوئے ان کے ایک مداح گورنر نے انھیں ایک ہاؤسنگ کوآپریٹو سوسائٹی کا دفتر کھلوا دیا۔ لیکن وہی مثل ہے کہ "پڑھیں فارسی بیچیں تیل"۔ جمالی ایسے آزاد طبع اور سیلانی انسان سے بھلا کہاں امید کی جا سکتی تھی کہ وہ رہائشی پلاٹ فروخت کر سکے گا۔ بہر حال وہ اس اسکیم میں بری طرح ناکام رہے۔ مالی اعتبار سے یہ ان کا سب سے زیادہ پریشان کن زمانہ تھا۔ وہ اب ادبی اور ثقافتی مجلسوں میں بھی شرکت سے گریز کرتے تھے۔ کبھی کبھی بہت اصرار کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے اولڈ بوائز کی مجلسوں میں شرکت کرتے تو محفل میں جان پڑ جاتی اور ان کی باغ و بہار شخصیت ساری مجلس پر چھا جاتی اور ان کے چبھتے ہوئے جملے محفل کو زعفران زار بنا دیتے۔

میری ان سے آخری ملاقات غالباً ۱۹۷۴ء میں صدر میں کیپٹل سینما والی گلی میں ہوئی۔ وہ ایک شناسا کی کپڑے کی دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ انھوں نے مجھے آواز دی۔ ان کے ایک ہم عصر صحافی بھی آ ملے۔ ہم لوگ دو گھنٹے تک گپ شپ کرتے رہے۔ پریشانیوں کے باوجود جمالی کی گفتگو میں اب بھی وہی شگفتگی اور بذلہ سنجی پائی جاتی تھی۔ پاکستانی صحافت سے وہ بہت شاکی نظر آتے تھے لیکن برنی صاحب کے (OUTLOOK) اوٹ لک کے بڑے مداح تھے۔ کہنے لگے: "آج کل اخبار نہیں پڑھتا آؤٹ لک

البتہ شروع سے آخر تک پڑھتا ہوں۔"

ایک بہت پرانی مثل ہے کہ خدا گدھے کو بھی خشکہ کھلاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس کے جلوے بہت نظر آتے ہیں۔ ورنہ جمالی ایسا باصلاحیت اور مرنجاں مرنج انسان جو بات میں بات پیدا کرنے اور جدّت طرازی کی صفات سے متصف تھا در در کی ٹھوکریں نہ کھاتا۔ ان کے ایک ہم عصر مزاحیہ نگار ابن انشا نے انھیں ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے:

"جمالی ہی کو لے لیجئے۔ طفیل احمد جمالی کو۔ ظرافت اور بذلہ سنجی کا بہتا دریا۔ اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی۔ اس کی ہر بات میں تھی اک اک بات۔ اس شخص نے ساری عمر آزادگی اور وارستگی میں گزار دی۔ کبھی زندگی کے ساز و برگ کی پروا نہ کی۔ کبھی گھر نہ بنایا۔ مدتوں اس کی اپنی ذات ہی اس کا تنہا اثاثہ رہا۔ درویشی۔ سیاحی۔ شاعری۔ اخبار نویسی۔ سبھی منزلوں سے خوش باش گزرا۔ ہائے یہ شخص خوش گلو۔ خوش آواز۔ خوش فکر۔

؎ پرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے"

ملک فیصل بن عبدالعزیز

جنوری ۱۹۷۴ء کے دوسرے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی۔ دن کے دس بجے ہوں گے میں جدہ کے قصر الحمرا کے بڑے دروازہ پر کھڑا تھا۔ میں نے دربان سے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا جو میں نے ایک کاغذ پر عربی زبان میں لکھ رکھا تھا۔ اس نے دروازہ پر نصب فون سے شاہ فیصل کے سکریٹری کو مطلع کیا جنھوں نے فوراً مجھے اندر اپنے کمرہ میں بلا لیا۔ تین دن قبل میں ان سے مل چکا تھا اور شاہ فیصل سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان کے سکریٹری منصور الخرجی صاحب نے مجھ سے کہا کہ تین دن بعد آپ ۱۰ بجے تشریف لائیں اس درمیان میں وہ شاہ فیصل سے اجازت حاصل کرلیں گے۔ شاہ فیصل مجھ سے پہلے سے واقف تھے۔ میں نے انھیں اپنی انگریزی کی تصنیف "سو عظیم مسلمان" بطور ہدیہ بھیجی تھی جس پر انھوں نے مجھے گرانقدر انعام مرحمت فرمایا تھا۔

قصر الحمرا کے ایک کمرے میں منصور الخرجی صاحب نے میرا بڑی گرمجوشی سے

استقبال کیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ مجھے ایک شاندار کمرے میں لے گئے جو غالباً انتظار کا کمرہ تھا جس میں پانچ اور صاحبان بھی پہلے سے انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے دو غالباً بڑے امریکی اور برطانوی افسر اور تین سربرآوردہ عرب تھے۔ آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد کمرہ سے متصل گیلری میں سرسراہٹ پیدا ہوئی اور گیلری میں بچھے ہوئے دبیز قالین پر بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پردے کے پیچھے سے میں نے دیکھا کہ شاہ فیصل اور ان کے ساتھ پندرہ بیس باوردی افراد چلے جا رہے ہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد ہم لوگوں کی طلبی ہوئی۔ منصور صاحب تشریف لائے اور ہم لوگوں کو ایک بہت بڑے عالی شان کمرے میں لے گئے جس کے وسط میں شاہ فیصل کھڑے ہوئے تھے۔ باری باری ہم چھ آدمیوں کو ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے بڑی گرمجوشی سے ہم سے مصافحہ کیا۔ اور خوش آمدید کے الفاظ اور عربی میں کچھ اور الفاظ ادا کئے جو میری سمجھ میں نہیں آئے۔ میں نے اپنی دو تین تصانیف انھیں پیش کیں جو انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کرلیں۔ بعدازاں اس بڑے کمرے کے ایک جانب ہم چھ ملاقاتیوں کو بٹھایا گیا۔ شاہ فیصل درمیان میں اور ہم تین غیر ملکی ان کے دائیں جانب اور عرب حضرات بائیں جانب بیٹھے۔ باوردی افراد جن میں زیادہ تر باڈی گارڈ تھے۔ سامنے کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خوشبودار مشروب سے ہماری تواضع کی گئی۔ اس وقفہ کے درمیان شاہ فیصل عربی میں گفتگو کرتے رہے۔ وہ بڑے کم سخن انسان تھے۔ ایک بار ان سے اس بات کی شکایت کی گئی کہ آپ عرب سربراہوں کی مجالس میں بھی بہت کم تقریر کرتے ہیں تو شاہ فیصل نے جواب دیا۔ "خدا نے ہمیں ایک زبان اور دو کان دئے ہیں جس کے معنی ہیں سنو

زیادہ بولو کم"۔

مشروبات سے فارغ ہونے کے بعد منصور صاحب نے شاہ فیصل سے ہر ایک ملاقاتی کا تعارف کرایا۔ شاہ فیصل اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور ایک ایک ملاقاتی ان سے ملتا اور گفتگو کرتا رہا۔ پہلے سربرآوردہ عربوں کی باری آئی۔ ان کے بعد مجھے طلب کیا گیا۔ میں نے شاہ فیصل سے مصافحہ کیا اور انگریزی زبان میں اپنا تعارف کرایا۔ اور کتابوں کے متعلق گفتگو کی۔ شاہ فیصل خاموشی سے اسے سنتے رہے۔ انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بعد ازاں ان کے سکریٹری نے ان سے عربی میں گفتگو کی اور مجھے انگریزی میں جواب دیا کہ شاہ فیصل آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور آپ کے کام کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ آپ کو بعد ازاں جواب روانہ کریں گے۔ ہم سب ملاقاتی ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں فارغ ہو گئے۔

دنیا کے دیگر بڑے آدمیوں کے متعلق میں نے بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ ان کے برخلاف میں نے شاہ فیصل کو بہت زیادہ متواضع اور خوش اخلاق پایا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کورنش کو ناپسند کرتے ہیں اور ایک سچے مسلمان کے مطابق سجدہ۔ کورنش اور اس قسم کی دوسری تعظیم اور تکریم کو وہ صرف خدا کے لئے مخصوص کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہر قسم کے بیجا تکلفات اور القاب و آداب مثلاً یور مجسٹی۔ جلالۃ الملک سے مخاطب ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ ملک فیصل یا برادر فیصل کے الفاظ سے مخاطب کیا جانا پسند کرتے ہیں۔

سعودی عرب کے معمار ملک عبدالعزیز ابن سعود کے بیٹوں میں ملک فیصل سب سے زیادہ ہوشمند۔ دیندار اور باصلاحیت تھے۔ درحقیقت وہ اپنے باپ کے

دست راست تھے۔ اگرچہ وہ ولی عہد نہیں تھے لیکن ملک عبدالعزیز کے عہد حکومت میں وہ سعودی افواج کے کمانڈر انچیف اور بعدازاں اس ملک کے وزیر خارجہ تھے۔ انھوں نے یمن کے خلاف جنگ میں نمایاں فتح حاصل کی تھی اور مختلف عالمی مجالس اور کانفرنسوں میں اپنے ملک کی بڑی کامیابی اور ہوشمندی کے ساتھ نمائندگی کی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ تخت نشین ہوئے۔

ملک فیصل کے عہد حکومت میں سعودی عرب نے جس سرعت کے ساتھ ترقی کی ہے، اس نے ساری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اس حیرت انگیز ترقی کا سبب سعودی عرب میں تیل کی دریافت ہے جس نے اسے دنیا کا دولت مند ترین ملک بنا دیا۔ نیز اس کے فعال۔ دور اندیش اور ہر دلعزیز حکمراں امیر فیصل کی بےمثال قیادت ہے جنھوں نے مشرق وسطیٰ کے تیل پیدا کرنے والے ملکوں کو متحد کر کے مغربی استحصال پسندوں کے خلاف ایک کامیاب حربہ کے طور پر اسے استعمال کر کے انھیں جھکنے پر مجبور کر دیا۔

اس صدی میں ملک فیصل دنیائے اسلام کے اتحاد کے سب سے بڑے علمبردار تھے انھوں نے اسلامی اتحاد سے متعلق جمال الدین افغانی کے نظریہ کو بڑی حد تک عملی جامہ پہنایا۔ دنیائے اسلام کو متحد کرنے میں نمایاں کردار ادا کر کے انھوں نے افغانی کے خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔

ان کا دل دنیائے اسلام کی خوشیوں اور کامیابیوں پر خوش ہوتا اور اس کی مصیبتوں اور ناکامیوں پر روتا تھا۔ وہ مسلمانوں کے دلوں پر حکومت کرتے اور اسلامی اتحاد کی زندہ علامت تھے۔ وہ انتہائی با اصول انسان تھے۔ کسی لالچ یا خوف کی

وجہ سے وہ اصولوں پر سمجھوتہ کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ انتہائی بے داغ کردار کے مالک تھے اور ان کی نجی زندگی ہر قسم کی آلائشوں سے پاک تھی۔

شاہ فیصل نے عربوں کو متحد کرکے تیل کے حربے کو انتہائی موثر طریقہ اور ذہانت سے استعمال کیا۔ سیاست میں وہ انتہائی تدبر سے کام لیتے تھے۔ وہ ایک عظیم انسان اور اس صدی میں امن کے سب سے بڑے داعی تھے۔ تیل برآمد کرنے والے ممالک کے ادارہ نے شاہ فیصل کی قیادت میں اس بات کو محسوس کیا کہ تیل کی پیداوار کا معتد بہ منافع مغربی کمپنیوں کی جیب میں چلا جاتا ہے انھوں نے ان استحصال پسند کمپنیوں سے تیل برآمد کرنے والے ممالک کو نجات دلانے کا منصوبہ تیار کیا ان کی قیادت میں تیل برآمد کرنے والے ممالک کے بے مثال اتحاد نے ان ممالک کو بہت فائدہ پہنچایا۔

۱۹۴۴ء میں ایک بیرل تیل کی قیمت ایک ڈالر سے بڑھا کر ۱۹۷۴ء میں دس ڈالر کر دی گئی۔ اس سے مغربی ممالک کی اقتصادیات کو سخت نقصان پہنچا۔ دولت اور سیاست کا توازن اب مغربی ممالک سے مشرق وسطیٰ اور خاص کر سعودی عرب کی جانب جھک گیا۔ امریکہ اور ان کے حواریوں نے عربوں میں پھوٹ ڈالنے کی بڑی کوشش کی۔ لیکن شاہ فیصل کی مستقل مزاجی۔ اعلیٰ قیادت اور کردار نے اسے کارگر ہونے نہیں دیا اور توقع کے خلاف اس کا الٹا اثر ہوا۔ ترقی یافتہ ممالک کے ٹولے میں خود ہی پھوٹ پڑ گئی۔ جاپان۔ فرانس اور مغربی جرمنی نے امریکی حکمت عملی کے خلاف سعودی عرب سے علیحدہ علیحدہ ساز باز بلکہ خوشامد شروع کر دی اور سعودی عرب کو ہر قسم کی مراعات دینے کو تیار

ہو گئے۔

۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد شاہ فیصل نے اسرائیل کے دوست نواز ممالک کے بارے میں سخت رویہ اختیار کیا، اور مشرق وسطیٰ میں تیل برآمد کرنے والے ممالک نے شاہ فیصل کی قیادت میں تیل کو ان ممالک کے خلاف حربے کے طور پر استعمال کیا۔ جس نے مغربی ممالک اور جاپان کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا، اور متعدد مغربی ممالک، خصوصاً فرانس، جرمنی، اور جاپان کو بھی عربوں کی حمایت میں اسرائیل کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنا پڑا۔ دنیا کے بیشتر ممالک اسرائیل کے خلاف شاہ فیصل کے پیچھے صف آرا ہو گئے۔

شاہ فیصل کی قیادت میں عربوں کا استحکام اور دنیائے اسلام کا اتحاد درحقیقت تیسری دنیا کے لئے ایک فال نیک ثابت ہوا۔ ۱۹۷۴ء میں اسرائیل کے خلاف اور فلسطینی مسلمانوں کی موافقت میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ۹۵ پچانوے فیصدی اقوام کا فیصلہ اسی قیادت کا ایک مظہر تھا۔ شاہ فیصل بڑے صاحب کردار اور متقی پرہیزگار بڑے دور اندیش اور آہنی ارادہ کے مالک تھے۔ دوست دشمن سبھی ان کی عزت کرتے تھے۔ بیت المقدس کے حصول کے لئے ان کے دلیرانہ عزم نے عربوں کو ایک آہنی دیوار بنا دیا۔ اور انھیں اسرائیل کے خلاف اپنا سب کچھ داؤں پر لگانے پر آمادہ کر دیا۔

خلفائے راشدین اور سلطان صلاح الدین کے زمانے کے بعد عربوں اور دنیائے اسلام میں ایسا اتحاد کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ مفکر اسلام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بالکل درست فرمایا ہے: " اسلامی خلافت سلطان عبدالحمید کے ساتھ ختم ہو کر

خواب وخیال بن گئی۔ فیصل نے اپنی ذات میں مسلمانوں کے لئے وہ کشش اور مرکزیت پیدا کرلی تھی جو اسلامی تاریخ میں صرف مسلمانوں کے کسی خلیفہ کے حصے میں آتی رہی ہے گویا خلافت کے قیام کے بغیر خلافت قائم ہو گئی تھی۔ اسلامی تاریخ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد کوئی شخصیت ایسی نہیں ملتی جس پر مسلمان قوم رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود کو بھول کر جمع ہو گئی ہو۔"

شاہ فیصل میں اتحاد عالم اسلامی سے متعلق جمال الدین افغانی کا جذبہ۔ سائنس اور علوم کے حصول سے متعلق سید احمد کی روشن خیالی نیز مجاہدہ اور ریاضت سے متعلق سید احمد بریلوی کا جوش عمل پایا جاتا تھا۔ انھوں نے عالم اسلامی کی دامے درمے۔ سخنے ہر طرح سے مدد کی۔ عرب قومیت کے بجائے وہ اسلامی اتحاد کے علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنے دور حکومت میں سعودی عرب میں مدرسوں۔ اسکولوں۔ کالجوں اور یونیورسیٹوں کا جال بچھا دیا۔ رفاہ عامہ کے کاموں کو بڑا فروغ دیا۔ حرمین شریفین کی بڑی توسیع کی اور حجاج کے آرام و آسائش کے متعدد اقدامات کئے۔ مکہ اور عرفات کے درمیان متعدد سڑکیں تعمیر کرائیں۔ مکہ اور مدینہ اور مدینہ اور جدہ کے درمیان دنیا کی بہترین سڑکیں تعمیر کرائیں۔ ان کے علاوہ سینکڑوں ہسپتال۔ کتب خانے اور مسافر خانے تعمیر کرائے۔ انھوں نے جدید علوم وفنون کی ترویج اور ترقی پر خاص توجہ دی۔ تعلیم نسواں کو فروغ دیا اور غلاموں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا۔ انھوں نے آرمکو (تیل نکالنے اور صاف کرنے کا کارخانہ) کو قومی ملکیت قرار دیا اور متعدد صنعتوں کو اپنے ملک میں قائم کیا۔

شاہ فیصل ایک انتہائی پاکباز۔ متشرع اور صاحب کردار حکمراں تھے۔ انھوں نے اپنی مملکت میں عدل و انصاف کی حکومت قائم کی۔ چھوٹے بڑے سے یکساں انصاف کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی مملکت میں جرائم کی بڑی کمی ہوگئی۔ کئی سال ہوئے جب وہ امریکہ کے دورہ پر گئے تو غالباً وہاں کے صدر نے ان سے سوال کیا۔ "یور مجسٹی آپ کے یہاں بڑے سخت قوانین نافذ ہیں۔ چوری کرنے پر ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ اور قتل کرنے پر گردن قلم کرلی جاتی ہے۔" شاہ فیصل نے جواب دیا۔ "یہ درست ہے۔ لیکن قوانین اگر جرائم کو ختم کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کے ایک شہر نیویارک میں ایک رات میں جتنے جرائم سرزد ہوتے ہیں میری ساری مملکت میں سال بھر میں بھی نہیں ہوتے۔ تو بتایئے کس کا قانون بہتر ہے، میرا یا آپ کا۔" امریکی صدر لاجواب ہوگئے۔

شاہ فیصل جو دنیا کے دولت مندترین حکمراں تھے بڑی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ اسی محل میں رہتے تھے جس میں وہ شہزادگی کے زمانے میں قیام پذیر تھے۔ وہ بہت معمولی غذا استعمال کرتے اور سادہ کپڑے پہنتے تھے۔ جدہ میں اپنے بھائی کے تعمیر کردہ قصر الحمرا کو انھوں نے رہائش کے لئے پسند نہیں کیا کیونکہ وہ ان کے لئے بہت "شاندار" تھا۔ وہ اسلامی مساوات کے بڑے قائل تھے۔ اور اپنی پرانی گاڑی میں اکثر ڈرائیور کے بغل میں بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ جبکہ ریاض میں متعدد شہزادوں کے پاس کیڈ لاک تھی۔ جس میں سونے کی چادریں لگی ہوئی تھیں۔ کتاب "ابن سعود" کے مصنف کینتھ ولیمز نے

اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے کہ ایک بار جب شہزادہ فیصل سے ملاقات ہوئی تو میں نے انھیں کورنش کی۔ فیصل نے میرا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور کہا: "کہ ہمارے مذہب میں اس قسم کی تعظیم صرف خدا کے لئے جائز ہے"۔

سعودی عرب کے اس عظیم حکمراں نے جس میں عام بادشاہوں کی خو بو بالکل نہیں پائی جاتی تھی۔ اپنی مملکت کو ایک جدید مملکت بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کی صنعت اور تجارت۔ تعلیم اور رفاہِ عامہ کے کاموں کو جدید خطوط پر آراستہ کیا۔ وہ دن میں سولہ گھنٹے کام کرتے تھے اور وقت کے اتنے پابند تھے کہ لوگ ان کی آمد و رفت کے اوقات سے اپنی گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔

افسوس اس عظیم حکمراں کو اس کے ایک آوارہ منش بھتیجے نے ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو شہید کر دیا۔ دنیائے اسلام کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ صدیوں سے دنیائے اسلام میں کسی شخص کا ایسا سوگ نہیں منایا گیا تھا۔

غرضکہ ایسے فقیر منش انسان تو بہت نظر آئیں گے جن کو زندگی کی تن آسانیاں اور دولت کی فراوانیاں کبھی میسر ہی نہیں آئی ہیں اور اس کی لذت سے ناآشنا ہوتے ہوئے انھوں نے سادگی اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی ہے۔ لیکن وہ انسان ان سے کہیں زیادہ عظیم ہے جسے زندگی میں ہر قسم کی تن آسانیاں۔ دولت کی فراوانیاں اور جاہ و منزلت کی جلوہ سامانیاں میسر رہیں لیکن ترک لذات کر کے اس نے انتہائی سادہ۔ پاک و صاف اور زاہدانہ زندگی بسر کی اور اس طرح شاہی میں فقیری اختیار کی۔ اسلامی تاریخ کے اولین دور میں تو ایسی بہت مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اس زمانے کے مسلمانوں میں

ایسی مثالیں شاذونادر ہی نظر آتی ہیں۔ موجودہ دور میں ایسی ایک نادر مثال شاہ فیصل بن عبدالعزیز نے فراہم کی ہے۔ جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد دنیائے اسلام کے عظیم اور صالح ترین حکمراں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ انھیں ایسے مومن کے لئے شاید اقبال نے کہا تھا:

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ڈاکٹر محمود حسین

بیسویں صدی عیسوی کے برصغیر ہند و پاکستان میں ایسے چند ہی مسلمان خاندان گزرے ہیں جن میں حقیقی بھائیوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ملک گیر اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں رامپور (یوپی) کے علی برادران، (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) کلکتہ کے سہروردی برادران (حسین شہید سہروردی، حسن سہروردی۔ حسان سہروردی وغیرہ) قائم گنج (یو۔ پی) کے ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈاکٹر یوسف حسین اور ڈاکٹر محمود حسین۔ لکھنؤ کے محمد وسیم۔ پروفیسر حبیب اور پروفیسر مجیب۔ غازیپور کے ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم نابینا۔ پٹنہ میں میں علی امام اور سید حسن امام۔ اور سی پی میں بھارت کے سابق چیف جسٹس ہدایت اللہ اور پاکستان کے سابق سکریٹری وزارت خارجہ محمد اکرام اللہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے بلبشتر نے سیاست یا قانون۔ ادب یا تعلیم و تدریس۔ مغربی اور مشرقی طب میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور اپنی فنی مہارت کی انمٹ چھاپ تاریخ کے صفحات پر چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر محمود حسین ضلع فرخ آباد کے قصبہ قائم گنج کے ایک شریف خاندان میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے تینوں بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی بلکہ کی اعلیٰ ترین درسگاہوں کے علاوہ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں انھوں نے کسب علم کیا۔ ڈاکٹر محمود حسین نے ۱۹۳۲ء میں ہائیڈل برگ (جرمنی) سے پی ایچ ڈی۔ اور ۱۹۶۱ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

ان بھائیوں نے آگے چل کر درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ان میں سب سے بڑے ڈاکٹر ذاکر حسین نے سادگی اور بلند خیالی۔ ایثار اور اعلیٰ صلاحیت اور قابلیت کی جو مثال قائم کی اسلامی ہند کی حالیہ تاریخ میں بلاشبہ وہ بے نظیر ہے۔ ایسے صاحب ظرف۔ شریف النفس اور عالم باعمل انسان زمانے میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ برصغیر میں وہ عظیم ترین ماہر تعلیم تسلیم کئے جاتے تھے۔ بھارت میں وہ صوبائی گورنر، نائب صدر اور صدر کے جلیل القدر مناصب پر فائز رہے۔ لیکن انھوں نے انتہائی فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کی اور اپنے بعد اپنی نیکنامی اور شہرت کے سوا کچھ بھی چھوڑ کر نہیں گئے۔ نہ کوئی بنک بیلنس۔ نہ شاندار کوٹھی اور نہ کوئی دوسری جائداد۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں بھی ماہر تعلیم اور شہرۂ آفاق ادیب ہیں۔ ان کی "روح اقبال" ہمارے شاعر اسلام پر چند بلند پایہ تصانیف میں سے ایک ہے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وہ پرو وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین نے پاکستان کو اپنے لئے منتخب کیا۔ قیام پاکستان کے وقت وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ قائد اعظم کی قدر شناس

نگاہوں نے اس جوہر کو پہلے ہی سے پرکھ لیا تھا۔ اور مشرقی پاکستان سے مجلس دستور ساز کا انھیں ممبر منتخب کرادیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صوبائی عصبیت کا بھوت ابھی پاکستان میں نمودار نہیں ہوا تھا اور فرزند زمین اور کوٹہ سسٹم کی اصلاحات سے پاکستانی عوام ناآشنا تھے۔ قائد اعظم نے صلاحیت اور اہلیت کو پاکستان میں ہر قسم کے عہدوں اور نمائندگیوں کے لئے اولین اور لازمی شرط قرار دیا تھا۔

پاکستان میں ڈاکٹر محمود حسین مرکزی وزیر تعلیم ڈھاکہ اور کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی میں وہ وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین کو یوں تو غائبانہ طور پر میں بہت دنوں سے جانتا تھا۔ لیکن ان سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۶ء میں ہوئی جب وہ کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ یونیورسٹی سول اسپتال سے متصل پرنسز اسٹریٹ پر واقع تھی۔ میں ایک غیر ملکی صحافی کو ان سے ملانے کے لئے گیا تھا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملے اور میں نے ان کا تعارف کرایا: "ڈاکٹر محمود حسین پاکستان کے ممتاز دانشوروں میں سے ایک ہیں"۔ غیر ملکی صحافی ڈاکٹر محمود حسین کی قابلیت اور اخلاق نے بہت متاثر ہوا۔

اس کے بعد سے ڈاکٹر محمود حسین سے برابر ملاقات ہوتی رہی۔ شرافت اور انسانیت، وجاہت اور وضعداری ان کی خاندانی صفات تھیں اور انھیں ورثہ میں ملی تھیں۔ وہ اتنے بڑے ہونے کے باوجود جس قدر جھک کر ملتے اس سے ان کی عظمت میں اور اضافہ ہوتا تھا۔ وہ شجر ثمردار کی طرح جھک کر ملتے تھے۔ جس زمانے میں وہ وزیر تھے اکثر ادبی مجلسوں میں ملاقات ہوتی تو سلام کرنے میں وہ ہمیشہ

سبقت کرتے تھے اور بہت خندہ پیشانی سے مزاج پرسی کرتے۔ ہمارے برگزیدہ پیغمبرؐ کے ارشاد کے مطابق سلام کرنے میں وہ ہمیشہ سبقت لے جاتے۔ وضعدار ایسے کہ وہی شیروانی اور پائجامہ جو ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین کا لباس تھا۔ وہی ڈاکٹر محمود حسین نے زندگی بھر زیب تن کیا۔ وجاہت تو سب بھائیوں کو ورثہ میں ملی تھی۔ نہایت سرخ سپید اور اچھے نقوش رکھتے تھے۔ انسانیت تو ان بھائیوں میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ بڑے بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین نے تو جامعہ ملیہ دہلی کی سربراہی چھپتر روپے ماہوار میں گزار دی اور جب گورنر، نائب صدر اور صدر ہوئے تو درویشی اختیار کرلی۔ چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین نے بھی بہت سادہ اور پاک صاف زندگی بسر کی۔ انکی زندگی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک تھی۔ سادگی اور بلند خیالی سے وہ متصف تھے۔

ڈاکٹر محمود حسین سے میری برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اور جب بھی میں ان سے ملتا تو نقشِ ثانی کو نقشِ اولیٰ سے بہتر پاتا۔ انھوں نے ازراہِ نوازش میری انگریزی کتاب ثقافت اسلام (HERITAGE OF ISLAM) کا پیش لفظ لکھا تھا اور جب بھی میں کوئی کتاب لکھتا ان کی خدمت میں پیش کرتا۔ وہ بہت خوش ہوتے اور اکثر خط کے ذریعہ اس پر بہت حوصلہ افزا تبصرہ کرتے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام سے بہت قبل بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سرپرستی میں انجمن ادبائے پاکستان قائم کی گئی جس کے پہلے صدر جسٹس ظہیر الحسن لاری صاحب تھے۔ اس میں پاکستان کے متعدد زبانوں کے سربرآوردہ ادیب اور مصنف شامل ہوئے۔ بابائے اردو کے انتقال کے بعد علامہ نیاز فتحپوری مرحوم نے اس کی سرپرستی قبول کی۔ ان کی سرپرستی میں یہ انجمن زیادہ فعال ہوگئی اور لاری صاحب کی جگہ ڈاکٹر محمود حسین کو اس کا صدر منتخب کیا گیا جسے انھوں نے بخوشی قبول کرلیا۔ وہ اس انجمن کی سرگرمیوں میں بہت دلچسپی لیتے

تھے اور اپنے مفید مشوروں سے اسے نوازا کرتے تھے۔ اس انجمن کا سکریٹری جنرل ہونے کی بنا پر میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔

ایک زمانہ تھا جب میں اکثر اتوار جامعہ ملّی ملیر میں گزارتا تھا۔ وہاں ڈاکٹر صاحب سے طویل ملاقاتیں ہوتیں اور تفصیلی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ جامعہ ملی ملیر کا شاندار تعلیمی ادارہ ان کی زندہ جاوید یادگار ہے۔ اس کا قیام ان کی محنت شاقہ اور مساعی جمیلہ کا مرہون منت ہے۔ انھوں نے اسے جامعہ ملیہ دہلی کا نقش ثانی بنانے کا خواب دیکھا تھا جو بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ یہ تعلیمی ادارہ جو شہر کے ہنگاموں اور تہذیب جدید کے شور و شغب سے دور ملیر کے ایک پر فضا مقام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے زیر انتظام رہتا اور ڈاکٹر صاحب کی عمر یاوری کرتی تو وہ اسے ایک آئیڈیل تعلیمی ادارہ بنا کر دم لیتے۔ دنیا میں ہر جگہ بہترین اور مثالی تعلیمی ادارے نجی انتظام میں چلا کرتے ہیں۔ دور کیوں جائیے تعلیمی لحاظ سے ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہمسایہ ملک بھارت میں جامعہ ملیہ دہلی۔ شانتی نکیتن۔ ندوہ لکھنؤ۔ مدرسۃ العلوم دیوبند۔ ہندو یونیورسٹی بنارس۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سارے کے سارے نجی تعلیمی ادارے ہیں جو بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں لیکن پاکستان میں نجی تعلیمی اداروں کو قومیانے کی وجہ سے اچھے اور بُرے تعلیمی اداروں کا معیار یکساں ہو گیا۔ معیار بہتر تو نہیں ہوا بدتر ضرور ہو گیا۔ موٹر گاڑی اور بیل گاڑی کو ایک ہی رفتار سے چلایا گیا۔ ظاہر ہے بیل گاڑی موٹر گاڑی کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی اس لئے موٹر گاڑی کو بیل گاڑی کا ساتھ دینا پڑا۔ امریکہ اور انگلستان میں بھی سارے اچھے تعلیمی ادارے نجی انتظام میں چلتے ہیں۔ آکسفورڈ۔ کیمبرج ہارورڈ سبھی نجی

تعلیمی ادارے ہیں جو دنیا بھر میں مشہور ہیں ۔ امریکہ اور انگلستان میں تو ابلاغ عامہ کے ادارے ۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو بھی نجی انتظام میں چلائے جاتے ہیں۔ دنیا کا سب سے مشہور T.V اور ریڈیو کا ادارہ بی بی سی ایک نجی ادارہ ہے جو اکثر و بیشتر برطانوی حکومت پر سخت تنقید کرتا ہے اور ہر معاملہ میں اپنی آزاد رائے رکھتا ہے ۔ برطانوی حکومت اس کے کام میں دخل در معقولات نہیں کرتی ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ہماری روایتی زبان میں انتہائی "میاں" قسم کے آدمی تھے ۔ ان کی شرافت انھیں کسی کی دل آزاری کی اجازت نہیں دیتی تھی وہ بہت خندہ پیشانی سے ملتے اور ان سے ملاقات کا بہت خوشگوار اثر دل پر پڑتا تھا۔ جو بہت عرصہ تک یاد آتا رہتا تھا۔ وہ ہمارے متوسط طبقے کے ایک انتہائی شریف النفس نمائندے تھے۔ بڑے وضعدار بڑے نیک نفس ۔ ایسی جنس سے وہ تعلق رکھتے تھے جو اب مفقود ہوتی جارہی ہے ۔

۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء کو وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ایک ایسے سفر پر جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ۔ یہ الفاظ لکھتے ہوئے مجھے اقبال کا یہ شعر بار بار یاد آرہا ہے ؎

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

منو میاں

(سید معین الدین اشرف)

عرصہ ہوا، غالباً ۵۸-۱۹۵۷ء کے دسمبر کی کوئی رات تھی۔ کراچی کے ایک اہم غیر ملکی سفارت خانہ میں ایک استقبالیہ دعوت تھی۔ مہمان اور میزبان چائے ناشتہ کے ساتھ ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے، ہیں بھی اسی سفارت خانہ کے پولیٹیکل کونسلر کی مقفیٰ اور شستہ اردو کا لطف اٹھا رہا تھا وہ کہنے لگا کہ میں نے اردو لکھنؤ میں سیکھی ہے جہاں میں کافی عرصہ تک اپنے ملک کے قونصل خانے میں تعینات تھا۔ ہمارے ساتھ حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات کے ایک بڑے افسر اور ادارہ بین الاقوامی امور پاکستان کے ایک ڈپٹی سیکرٹری مصروفِ گفتگو تھے۔ غیر ملکی کونسلر نے اپنی شستہ اردو میں بین الاقوامی امور کے ڈپٹی سیکرٹری سے سوال کیا۔ جس کا انھوں نے انگریزی میں جواب دیا۔ ان سے ایک اور سوال کیا۔

دوبارہ انھوں نے انگریزی زبان میں جواب دیا۔ اس پر کونسلر نے جھنجھلا کر کہا: "جناب کو اپنی مادری زبان میں گفتگو کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔" پاکستانی ڈپٹی سیکرٹری کے پاس جنہیں کالے صاحب کہنا بیجا نہ ہوگا، اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہاں سے وہ کھسک کر دوسری جانب چلے گئے۔

پاکستان میں آج کل کے نیم تعلیم یافتہ نوجوانوں اور خصوصاً لڑکیوں میں یہ وبا بڑی شدت سے پھیل رہی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اپنی مادری زبان کے بجائے گوراشاہی انگریزی اور اکثر لنگا جمنی زبان (آدھی انگریزی آدھی اردو) میں گفتگو کرنے پر فخر محسوس کرتی ہیں اور اس پہ پھولی نہیں سماتی ہیں۔ اس قسم کی حماقتیں اس احساسِ کمتری کو ظاہر کرتی ہیں جو پاکستانی نوجوانوں میں شدت سے پائی جاتی ہے جو دوسروں کی نقالی پر فخر کرتے اور اس سے اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے انحطاط پذیر معاشرے میں ہمارے نوجوان اپنے اسلاف کی شاندار روایات اور کارناموں کو بھلا کر مغرب کی اندھی تقلید کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے شدید احساس کمتری کا شکار ہو گئے ہیں۔

اس کے برعکس ترقی یافتہ اقوام کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ ان کا اپنا لباس اپنی زبان، اپنی ثقافت اور رہن سہن کا اپنی مخصوص طریقہ ہوتا ہے، جن کی ہر حال میں وہ پاسداری کرتے ہیں اور بجا طور پر اس پر فخر کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔ چین کے عظیم ملک کو لے لیجئے۔ پاکستان کے دو سال بعد آزاد ہوا ہے۔ آزادی سے قبل وہاں افیونیوں کی قوم بستی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد چینی قوم نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے، اس نے اقوام عالم کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ یہ سب کچھ

چین کی پرخلوص اور مثالی قیادت کی بدولت حاصل کیا گیا ہے جس نے انقلاب کے اصولوں پر بذاتِ خود سختی سے عمل کیا چینی لوگ اپنی زبان۔ اپنی روایات اور اپنی ثقافت کی سختی سے پابندی کرتے ہیں جہاں وہ جاتے ہیں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اپنی قومی تشخص کو ہر حال میں برقرار رکھتے ہیں۔ ہندوستانیوں نے بھی اپنا ایک قومی نظریہ۔ قومی ثقافت۔ قومی زبان اور قومی لباس اپنا لیا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں جب میں فتحپور (یو۔پی،) گیا تو میرے بہنوئی غلام مرتضیٰ صاحب مرحوم جو وہاں کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ اسٹیشن پر مجھے لینے آئے۔ کرتہ پائجامہ اور چپل پہنے ہوئے تھے۔ میں نے تعجب سے کہا کہ ہمارے یہاں ڈپٹی کمشنر اگر بیڈ روم سے ڈرائنگ روم میں آتا ہے تو سوٹیڈ بوٹیڈ ہوتا ہے اور آپ کرتے پائجامے میں ریلوے پلیٹ فارم پر لفٹ رائٹ کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہمارے ملک میں وزیر سے لے کر گھسیارے تک سب کا یہی لباس ہے۔ کرتہ اور پائجامہ۔ یہ حقیقت تھی۔ وہاں ہندوؤں نے بھی دھوتی کے بجائے پائجامہ پہننا شروع کر دیا ہے کیونکہ ایک دھوتی میں چار پائجامے بنتے ہیں اور ستر پوشی بھی پائجامے میں بہتر ہوتی ہے۔

اس کے برعکس ہم لوگ نقالوں کی قوم بن گئے ہیں جو دوسروں اور خاص کر اپنے سابق مغربی آقاؤں کی نقالی پر فخر کرتے ہیں اور آدھے تیتر اور آدھے بٹیر ہو کر رہ گئے ہیں۔ پاکستان کے موجودہ دور میں بھٹو صاحب نے شلوار قمیص کو جو اپنایا ہے اس سے ہمارے معاشرہ پر اچھا اثر پڑا ہے۔

انحطاط پذیر معاشرے میں لیکن مستثنیات بھی ہوتی ہیں۔ اسی قسم کی ایک نرالی شخصیت میرے پھوپھی زاد بھائی معین الدین اشرف (عرف منومیاں) کی ہے۔ جو تقریباً

پچیس سال سے کناڈا میں مقیم ہیں اور کینیڈین ہوگئے ہیں۔ وہ کینیڈین سول سروس کے ایک اہم عہدہ پر فائز ہیں۔ معین الدین اشرف ایسے افراد کہیں لاکھوں میں ایک ہوتے ہیں۔ وہ اقتصادیات کے ماہر ہیں۔ انگریزی لاجواب بولتے ہیں۔ لیکن جب پاکستانیوں سے ملتے ہیں تو اردو میں گفتگو کرتے ہیں، اور خاندان والوں میں بیٹھتے ہیں تو پوربی زبان بولتے ہیں۔ پوربی زبان وہ اتنی اچھی بولتے ہیں کہ مشرقی یوپی کا کوئی دیہاتی بھی ان سے اچھی پوربی زبان شاذ ونادر بول سکتا ہوگا۔ دفتری اوقات میں تو انھیں انگریزی لباس پہننا پڑتا ہے لیکن گھریلو اور نجی محفلوں اور تقریبات میں ہمیشہ مشرقی لباس میں نظر آتے ہیں۔ مغرب زدہ مسلمانوں میں خصوصاً ان میں جو مغرب کی ہوا بھی کھا چکے ہیں۔ اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا مغالطہ بلکہ خبط ہوتا ہے۔ اور اپنے اعزا کو وہ حقیر اور کمتر سمجھتے ہیں۔ غریب اعزا سے ملنا تو درکنار کہیں اگر ان کا سامنا ہو جاتا ہے تو اس سے ایسی بے رخی برتتے ہیں کہ دوبارہ وہ ملنے کی ہمت نہ کرتے ایسے نفس پرور اور خودغرض افراد صرف ایسے لوگوں کی پذیرائی کرتے ہیں جن سے ان کی غرض وابستہ ہوتی ہے سید معین الدین اشرف اس کے برخلاف انتہائی خلیق اور کنبہ پرور واقع ہوئے ہیں۔ ہندوستان پاکستان میں ان کے قریبی اعزا تو درکنار دوری اعزا، اور غریب پڑوسی بھی ان کی مالی امداد سے برابر مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ معین اشرف حضرت مخدوم جہانگیر اشرف سمنانی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دادا شاہ وجیہہ الدین اشرف مرحوم کچھوچھے میں مخدوم صاحب کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے بعد ازاں ان کے چچا سید حئی اشرف مرحوم جو بڑے فرشتہ خصلت اور عالم باعمل تھے سجادہ نشین ہوئے۔ معین اشرف کناڈا میں پچیس سال سے مقیم ہونے کے باوجود اپنے وطن

اور اعزا سے انتہائی محبت کرتے ہیں۔ جب کبھی پاکستان آتے ہیں تو کچھوچھہ ضرور جاتے ہیں۔ وہاں اپنے غریب اعزا سے بڑے خلوص اور محبت سے ملتے ہیں۔ وہاں کے گنوار باشندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ان سے بڑی محبت کرتے ہیں معین سب کے گھر پر جاتے ہیں اور ان کے حقیر تحائف اور خاطر داریوں کو بڑی خندہ پیشانی اور تشکر کے ساتھ قبول کرتے ہیں انھیں دیہاتی بولی کے ساتھ دیہاتی غذا بھی بہت پسند ہے، اور فرمائش کرکے وہ اسے پکواتے ہیں۔

غالباً ۱۹۶۸ء میں وہ کناڈا کی ملازمت ترک کرکے پاکستان آ گئے۔ یہاں ان کی شادی بیگم اکرام اللہ کی دوسری صاحبزادی ناز سے ہوئی جو انتہائی شائستہ خوش مزاج اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ یہاں پر انھیں مشرقی پاکستان میں CIBA کے جنرل منیجر کا بڑا عہدہ ملا۔ جس کا مشاہرہ پاکستان میں مقیم بڑے بڑے غیر ملکی ایگزیکٹیو کے ہم پلہ تھا مشرقی پاکستان کے اختتام کے بعد قدرتی طور پر ملازمت ختم ہوگئی۔ بعد ازاں وہ عالیہ ایرویز کے پاکستان میں خصوصی نمائندے کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن اس محکمہ کی سیاست سے وہ زیادہ عرصہ تک نباہ نہیں کرسکے، اور مجبوراً انھیں دوبارہ کناڈا جاکر ملازمت کرنی پڑی۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ جن افراد کی شادی بڑے خاندانوں میں ہوتی ہے وہ زیادہ تر زن مرید ہو جاتے ہیں اور سسرال والوں کے غلام بن جاتے ہیں۔ بس انھیں کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور اپنے کم حیثیت اعزا سے ناتہ توڑ کر باحیثیت سسرال والوں کی ناز برداری میں دن رات کوشاں رہتے ہیں۔ معین اشرف کی شادی بیگم اکرام اللہ کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ بلاشبہ پاکستان میں بیگم اکرام اللہ سے زیادہ باحیثیت اور خاندانی

اعتبار سے بلند پایہ کوئی خاتون نہیں ہے۔ وہ حسان سہروردی کی بیٹی ہیں۔ اور حسین سہروردی کی بہن ہیں۔ فضل الحق اور سر عبدالرحیم سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے۔ ان کے شوہر اکرام اللہ پاکستان کے پہلے سکریٹری وزارت خارجہ اور متعدد ملکوں میں پاکستان کے سفیر رہ چکے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی ہدایت اللہ ہندوستان کے چیف جسٹس اور قائم مقام صدر رہ چکے خود بیگم اکرام اللہ پاکستانی پارلیمان کی رکن اور مراکش میں پاکستانی سفیر رہ چکی ہیں اور کیمبرج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ انگریزی اردو کی وہ بہت اچھی مقرر اور ادیبہ ہیں۔

معین اشرف نے اتنی بلند پایہ سسرال میں اپنی انفرادیت قائم رکھی، اور سسرال والوں سے مرعوب ہونے کے بجائے اپنی روایات پر ہمیشہ فخر کیا اور اپنے غریب اعزا سے اسی طرح تعلقات برقرار رکھا بلکہ اپنی فرصت کا بیشتر حصہ انہیں کی صحبتوں اور خستہ قیام گاہوں پر بسر کیا۔

معین اشرف بڑے مرنجان مرنج انسان ہیں۔ روتوں کو ہنسانے والے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے ہیں اُسے زعفران زار بنا دیتے ہیں۔ ان کے جانے سے کراچی میرے لئے سونی ہو گئی ہے۔

حکیم محمد سعید

کسی عظیم دانشور کا قول ہے کہ "وقت انسانی زندگی کا سب سے زیادہ بیش قیمت سرمایہ ہے۔" مثل مشہور ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنے وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور اس قیمتی سرمایہ کی قدر و قیمت جانتے ہیں اور حتی الامکان اس کے ضیاع سے پرہیز کرتے ہیں۔

زندگی تو ہر فرد کی اچھی بری کٹ ہی جاتی ہے۔ شرابی ہمہ وقت شراب میں دھت رہتا ہے۔ جواری دن رات جوئے میں مست رہتا ہے۔ کھلاڑی کو کھیل کی۔ دولت مند کو دولت کی۔ تجارت پیشہ کو کاروبار کی، ہمہ وقت فکر دامن گیر رہتی ہے، لیکن ایسے خوش اوقات انسان شاذ و نادر ہی نظر آئیں گے جو مفید اور کارآمد زندگی گزارتے ہیں اور ان کی زندگی کا ہر لمحہ خدمتِ خلق کے لئے وقف ہوتا ہے۔ انھیں افراد میں ایک حکیم محمد سعید بھی ہیں۔

مصروفیت تو سینکڑوں قسم کی ہوتی ہیں۔ ہر کس بہ خیال خویش خبطے دارد اور وہ اسی خبط میں دن رات مصروف رہتا ہے۔ لیکن ایسی مصروفیتوں اور کارآمد مصروفیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ عام طور سے لوگ اپنا وقت بیکار مشاغل میں ضائع کرتے ہیں۔ لیکن ایک خوش اوقات انسان اپنی زندگی کا ہر لمحہ دینی اور دنیاوی اعتبار سے

کارآمد کاموں میں صرف کرتا ہے۔

حکیم محمد سعید صاحب کو یوں تو میں عرصہ سے جانتا تھا۔ اور شام ہمدرد میں ان کی جھلکیاں اکثر نظر آجاتی تھیں لیکن جس طرح وہ ایسی مجلسوں میں تقریر کرتے تھے اس کا اچھا اثر سامعین پر نہیں پڑتا تھا۔ وہ اچھے مقرر نہیں ہیں اور غالباً ہکلاتے بھی ہیں۔ سامعین غالباً یہی خیال کرتے تھے کہ حکیم صاحب تقریر کسی سے لکھا لائے ہیں۔ اور اچھی طرح اسے پڑھ بھی نہیں پا رہے ہیں۔ عام طور سے سرکاری وزیروں اور سفیروں کے متعلق جو مختلف تقریبات کی صدارت کرتے رہتے ہیں سامعین کی یہی رائے ہوا کرتی ہے۔

حکیم سعید صاحب کے متعلق میں نے سنا تھا کہ ان کے مطب میں بڑی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے اور مریض گھنٹوں انتظار میں لائن لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ خیال کیا کہ بڑے ڈاکٹروں کی طرح حکیم سعید صاحب کے یہاں بھی مریض وقت مقرر کرنے کے لئے دھکا پیل کرتے ہوں گے اور گھنٹوں انتظار کر کے اور بھاری فیس ادا کر کے وقت مقرر کراتے ہوں گے۔ بڑے ڈاکٹروں کی طرح حکیم سعید صاحب بھی مقررہ وقت سے دو گھنٹہ بعد مطب میں شاہانہ طریقہ سے داخل ہوتے ہوں گے اور چپراسی ہٹو بچو کرتے ہوئے دروازہ کھولتا ہوگا اور حکیم صاحب داخل دفتر ہو کر سکریٹری کو گھنٹی بجاتے ہوں گے کہ مقررہ وقت کے مریضوں کو باری باری بھیجو۔ مریض بیچارہ جس کا دس بجے دن کا وقت مقرر تھا، وہ حکیم صاحب کی خدمت میں بارہ بجے باریاب ہونے کو غنیمت سمجھتا ہوگا، کیوں کہ پاکستان کا یہی دستور ہے۔ یہاں دس 'بارہ بجے' بجتے ہیں اور اصلی وقت مقررہ وقت سے دو گھنٹہ بعد شروع ہوتا ہے۔ شادی بیاہ ہو یا دعوت مدارات، مشاعرہ ہو یا تقریری مباحثہ یہاں ہر قسم کی تقریبات مقررہ وقت سے دو گھنٹہ بعد شروع ہوتی ہیں۔

حکیم سعید صاحب کے متعلق میری یہ غلط فہمی حال ہی میں ایک خوشگوار حیرت میں تبدیل ہو گئی۔ میرے نوزائیدہ نواسے کو پیدائشی یرقان تھا۔ کئی ماہ اس کا علاج

کیا۔ ایلوپیتھک۔ ہومیوپیتھک اور یونانی سبھی علاج کیا خاطرخواہ افاقہ نہیں ہوا میرے ایک عزیز نے حکیم صاحب کا نام تجویز کیا۔ میں نے کہا کہ ان کے یہاں تو گھنٹوں پہلے قطار لگانی پڑتی ہے اور مریض رات رات بھر وہاں سوتے ہیں۔ غالباً جمعرات کا دن تھا۔ میں نے حکیم صاحب کو فون کیا پہلے اپنا تعارف کرایا پھر مدعا بیان کیا، کہنے لگے: "مریض بچوں کے لئے کوئی پابندی نہیں ہے۔ آپ سنیچر (شنبہ) کو آٹھ بجے صبح آئیں اور مجھے فون کر دیں میں فوراً بلوا لوں گا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں مریضوں کے جمِ غفیر سے گزرتا ہوا حکیم صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ انھوں نے بڑی توجہ اور شفقت سے بچہ کا معائنہ کیا اور دوا تجویز کی۔ خوش اخلاقی ایک اچھے معالج کی بہت بڑی صفت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سے مریض کا آدھا مرض دور ہو جاتا ہے۔ آج کل کے زمانے میں دو معروف ترین معالجوں حکیم سعید اور ڈاکٹر عبد الصمد میں یہ صفت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

اس دن گرمی کافی تھی لیکن حکیم سعید صاحب سفید شیروانی پاجامہ زیب تن کئے، وضعداری کا پیکر بنے بغیر ایر کنڈیشن کمرے میں صبح سے شام تک مریضوں کو بڑی توجہ سے دیکھتے رہے جبکہ آج کل کے زمانہ میں معمولی معمولی ڈاکٹر بھی ایر کنڈیشن کمروں میں بیٹھتے ہیں۔ اس دن مجھے حکیم صاحب کے اوقاتِ کار اور مصروفیات کا پتہ چلا۔ حکیم صاحب فجر کی نماز ادا کر کے پانچ ساڑھے پانچ بجے صبح کو مطب میں آ بیٹھتے ہیں، اور سہ پہر تک بلکہ اتوار کو شام تک مریضوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بلاناغہ مہینے کی ہر پہلے ہفتہ وہ دوشنبہ کو پشاور۔ منگل بدھ راولپنڈی۔ جمعرات جمعہ کو لاہور مہینے میں ایک جمعرات کو حیدرآباد اور سنیچر اتوار کو کراچی میں مریضوں کو دیکھتے ہیں۔ یہ ساری تگ و دو، محنت اور مشقت وہ اپنے صرفہ پر کرتے ہیں اور مریضوں کو کسی معاوضہ یا فیس کے بغیر دیکھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے پیشاب، پائخانہ، خون، اور بلغم کی جانچ اپنے متعلقہ محکمہ سے مفت کراتے ہیں۔ ان کے تین منزلہ مطب میں مریضوں کے بیٹھنے اور

انتظار کا بہت معقول انتظام ہے۔ ایسا کہ پاکستان کے اچھے سے اچھے مطب اور اسپتال تو کیا بیرونی ممالک کے ہسپتالوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔

حکیم سعید صاحب کی دیگر مصروفیات کی بابت مجھے قدرے معلومات تھیں لیکن جب ان کی تفصیل معلوم ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ یہ تو آدمی نہیں جنات ہے۔ ایسا مصروف اور انسان دوست شخص تو پاکستان میں مشکل سے ملے گا۔ جو دن رات خدمت خلق میں مصروف رہتا ہے اور تھکنے کا نام نہیں لیتا۔

حکیم سعید صاحب اپنی گوناگوں مصروفیات کے باعث بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ پاکستان کے اہم شہروں، کراچی۔ لاہور۔ راولپنڈی اور پشاور میں ہر ماہ وہ شام ہمدرد منعقد کرتے ہیں جن میں پاکستان کے ممتاز دانشوران شہروں کے سب سے بڑے ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں کسی علمی یا ادبی۔ سائنسی یا دور حاضرہ کے موضوع پر بڑی عالمانہ تقاریر کرتے ہیں اور اس طرح حکیم صاحب پاکستان میں دانشوروں کا ایک فورم تیار کرنے میں بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے شہرہ آفاق مسلمان سائنسداں الہیثم (ابوالحسن) اور البیرونی کی ہزار سالہ برسی پاکستان میں بڑے اعلیٰ پیمانے سے منعقد کی جس میں پاکستان کے بڑے بڑے مفکروں، سائنسدانوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ حال ہی میں انھوں نے کراچی میں علوم ریاضی کی عالمی کانگرس منعقد کی جس میں پاکستان اور بیرون پاکستان کے نامور ریاضی دانوں نے حصہ لیا۔

حکیم صاحب پاکستان اور بیرون پاکستان کے متعدد علمی اور فنی انجمنوں کے رکن اور عہدے دار ہیں، انھوں نے اس ملک اور بیرون ملک میں طب مشرقی کو متعارف اور مقبول بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور یورپ کی مختلف سائنسی اور علمی اداروں کی دعوت پر وہ اکثر دورے پر جاتے ہیں، جہاں وہ اپنی وضعداری خوش اخلاقی اور طب مشرقی کی ہمہ گیری سے وہاں کے لوگوں کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ حکیم صاحب

چاہے سوئٹزرلینڈ جائیں یا اٹلی۔ فرانس جائیں یا انگلستان ہمیشہ سفید شیروانی اور سفید پائجامہ میں ملبوس ہوتے ہیں۔ سردی اور گرمی کا ان کے لباس پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔

حکیم صاحب نے ہمدرد ٹرسٹ کا جس اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا ہے وہ ان کی فعال شخصیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اس کی تیار کردہ دوائیں دوا سازی کی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ہمدرد ٹرسٹ طب مشرقی اور دیگر معلومات سے متعلق متعدد جریدے شائع کرتا ہے، جو اپنی مفید معلومات اور دیدہ زیب طباعت کے لحاظ سے ملک کے اچھے سے اچھے جرائد کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان میں ہمدرد نونہال اور ہمدرد صحت بہت زیادہ مقبول ہیں۔ ہمدرد انگریزی نے تمام دنیا میں طب مشرقی کا پیغام پہنچایا ہے۔

حکیم صاحب نے ہمارے معاشرہ کے افراد کی جسمانی بیماریوں کے ساتھ ساتھ روحانی بیماریوں کے علاج کی جانب بھی پوری توجہ کی ہے، قرآن اور سنت کی روشنی میں انھوں نے ہماری معاشرتی برائیوں کے تدارک کے لئے " قرآن روشنی ہے" کتابچوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے وہ اپنی افادیت کے لئے بے نظیر ہے۔

غرضکہ حکیم سعید صاحب ہمارے ملک کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے خدا انھیں عمر خضری عطا کرے۔ ایسے افراد پاکستان میں کمیاب نہیں نایاب ہیں۔

میرے خیال میں حکیم صاحب کے یہاں خرابی صرف اتنی ہے کہ وہ پبلسٹی کے بڑے خواہاں رہتے ہیں اور اس قسم کے ثقافتی شو سے ان کا مقصد نمود و نمائش زیادہ ہوتا ہے جس سے نیکی کی افادیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ ان کے شام ہمدرد اور اسی قسم کی دوسری محفلوں میں زیادہ تر ایسے افراد مدعو کئے جاتے ہیں جو سوشل اعتبار سے بھاری بھرکم ضرور ہوتے ہیں اور کرسی نشین ہوتے ہیں لیکن زیر بحث موضوع سے انھیں دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا ہے۔

شاہد بھائی

مصارف زندگی کے اعتبار سے پاکستانی معاشرہ کو تین واضح درجات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پاکستانی معاشرہ میں ایسے افراد کی کثرت ہے جو اخراجات بیجا کے شکار ہیں اور اپنی استطاعت سے کہیں زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ فیشن پرستی میں سوٹ بوٹ زیب تن کئے جنٹلمین بنے گٹ پٹ کرتے پھرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اپنی مادری زبان چھوڑ کر گوراشاہی انگریزی میں بات کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایسے مرزا ظاہر دار بیگوں کی متوسط طبقے میں بہتات ہے۔ یہ لوگ فیشن کے سب سے زیادہ پرستار ہوتے ہیں اور فیشن کے ساتھ ساتھ ان کا حلیہ بھی روز بدلتا رہتا ہے۔ اس طبقہ کے افراد دوسروں کی نقالی اور فیشن پرستی میں مالی اعتبار سے پریشان حال رہتے ہیں۔

دوسرا طبقہ آسودہ حال اور صاحب استطاعت افراد کا ہے جن کے یہاں دولت کی فراوانی ہے وہ دولت کو پانی کی طرح بہاتے ہیں لیکن دوسروں پر نہیں بلکہ اپنے آرام و آسائش پر۔ ایسے لوگ خود پرستی اور خود فراموشی میں مگن رہتے ہیں۔ وہ اپنے غریب ہمسایوں کو ترحم کے بجائے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ غیر ممالک میں ایسے طبقہ میں مخیر افراد کی کثرت ہوتی ہے جو رفاہ عامہ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ دور کیوں جایئے اپنے ہمسایہ ہندوستان کے دولت مند طبقوں میں مخیر حضرات کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔

تیسرا طبقہ ان افراد پر مشتمل ہے جو دولت مند ہوتے ہوئے مال کو تجوریوں اور بنکوں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور عمر بھر عسرت کی زندگی بسر کر کے اپنی دولت ورثاء کو گل چھرے اڑانے کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں دولت سے نہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں، نہ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو معاشرہ بہت حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور صبح کے وقت ایسے افراد کا درشن ہو جانا منحوس خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس طبقہ میں ایسے عظیم انسان دوست افراد بھی پائے جاتے ہیں جو خود تو انتہائی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں لیکن اپنی دولت سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں اور دامے درمے۔ سخنے غیروں کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ شاہد بھائی ایسے ہی افراد کے زمرے میں شامل تھے۔ جن کی ہمارے ملک خدا داد پاکستان میں کال ہے۔ انھوں نے اپنے دہلی کے قیام میں جب انھیں ہر طرح کی آسودگی حاصل تھی، خود بڑی سادہ اور وضعداری کی زندگی بسر کی۔ معمولی سے معمولی لباس زیب تن کرنا۔ صوفے۔ قالین اور گدوں کے بجائے معمولی فرش پر بیٹھ کر کام کرنا۔ کار اور فٹن پر سفر کرنے کے بجائے ٹرام پر سفر کو ترجیح دینا۔ اور عمدہ سگار اور سگریٹ کے بجائے بیڑی پینے میں سبکی محسوس کرنا اور انگریزی ادب میں بی اے آنرز ہونے کے باوجود۔ غیر ملکی زبان میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتے ہوئے اپنی زبان میں بات چیت کرنے پر فخر کرنا ان سب صفات سے شاہد بھائی متصف تھے۔ اس کے برخلاف نادار اور حاجت مند ادیبوں اور فن کاروں کی ہر طرح سے مالی امداد کرنے میں شاہد بھائی بڑے کشادہ دل واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے رسالہ ساقی کے ذریعہ سینکڑوں ادیبوں کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

شاہد بھائی کو یوں تو میں بہت پہلے سے جانتا تھا اور دو ایک بار ان سے رسمی ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ لیکن انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے جولائی ۱۹۶۲ء

کے بعد ملا۔ جب میں پاکستانی محکمۂ اطلاعات کی ملازمت ترک کر کے برطانوی محکمۂ اطلاعات میں پریس افسر مقرر ہوا۔ مجھے یہاں شاہد بھائی کی خدمت کرنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ برطانوی محکمۂ اطلاعات میں ہر ماہ پانچ چھ سو روپئے انگریزی سے اردو میں تراجم کے لیے مخصوص کیے جاتے تھے۔ لندن میں برطانوی محکمۂ اطلاعات کے مرکزی دفتر سے ہر ہفتہ مختلف موضوعات پر درجنوں فیچر موصول ہوتے تھے۔ ان میں سائنس، تعلیم، معاشرتی بہبود اور روزمرہ زندگی سے متعلق بہت خوبصورت اور اعلیٰ قسم کے فیچر شامل ہوتے تھے۔ جن کا اردو ترجمہ کرا کے میں پاکستان کے مختلف اردو اخبارات اور جرائد کو بمعہ تصاویر ارسال کرتا تھا جو بہت پسند کیے جاتے تھے اور اخبارات و جرائد کے صفحے برطانوی فیچروں سے بھرے ہوتے تھے۔ ان فیچروں میں سائنس اور اس قسم کے مشکل موضوعات کے فیچر کا شاہد بھائی ترجمہ کیا کرتے تھے۔ ایسے دقیق سائنسی اور ٹیکنیکی فیچروں کا سلیس اور بامحاورہ اردو میں ترجمہ کرنا شاہد بھائی ایسے مشاق اور نامور مترجم کا ہی کام تھا۔ شاہد بھائی کے تراجم کو پڑھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہوتا تھا کہ یہ تراجم ہیں بلکہ ان پر اصل کا دھوکہ ہوتا تھا۔ شاہد بھائی وقت کی بڑی پابندی کرتے تھے جو وقت انھیں دیا جاتا تھا اس سے پہلے ہی وہ ترجمہ پہنچا دیا کرتے تھے۔ وہ قلم برداشتہ ترجمہ کرتے اور لکھنے میں کوئی کاٹ پیٹ نہیں کرتے تھے۔

برطانوی محکمۂ اطلاعات میں کام بہت تھا، سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی لیکن شاہد بھائی جب تشریف لاتے تو سارے افراد اپنے اپنے کام چھوڑ کر ان کی جانب متوجہ ہو جاتے۔ ان کی گنجینۂ گوہر جب شائع ہوئی تو اس کی ایک جلد انھوں نے مجھے بھی پیش کی۔ جس کو میں نے کئی بار شروع سے آخر تک پڑھا اور ہر بار نیا لطف پایا حالانکہ کوئی کتاب میں دوبارہ پڑھنے کا عادی نہیں ہوں۔ بعد ازاں ساقی کا جوش نمبر جب انھوں نے شائع کیا تو اس کی ایک کاپی مجھے بھی دی۔ اس کے متعلق میں پہلے ہی بہت کچھ سن چکا تھا۔

جوش صاحب بحیثیت انسان جیسے بھی ہوں لیکن اس زمانے میں اردو کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ شاعروں میں ایسی کمزوریاں اکثر پائی جاتی ہیں۔ اگر اس معیار سے جانچا جائے تو غالب شیکسپیئر، شیلی، کیٹس، اور آسکر وائلڈ بہت گھٹیا قسم کے انسان تھے لیکن بحیثیت شاعر اور ادیب ان کا مقام بہت بلند ہے۔ شاہد بھائی نے جب یہ نمبر مجھے پیش کیا تو میں نے شکایتاً کہا "شاہد بھائی آپ نے یہ نمبر نکال کر اچھا کام نہیں کیا۔ پاکستان میں اردو زبان کی جو مخالفت ہو رہی ہے اس کے پیش نظر آپ نے اردو کے سب سے بڑے شاعر کو ذلیل کر کے اردو کے سارے حمایتوں اور پرستاروں کے دل دکھلائے ہیں۔ آج کل تو یہ زمانہ ہے اور خصوصاً پاکستان میں اس پر شدت سے عمل کیا جاتا ہے کہ اپنے آدمیوں کے عیوب کی پردہ پوشی کی جاتی ہے۔ اور ان کی خوبیوں کا ڈنکا پیٹا جاتا ہے اور آپ ہمارے سب سے بڑے شاعر کے ذاتی عیوب کا ڈنکا پیٹ رہے ہیں۔" شاہد بھائی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہے۔ ہفتہ عشرہ وہ ہمارے دفتر نہیں آئے۔ اسی دوران میں ریڈیو پاکستان میں ان سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ میں نے کہا "شاہد بھائی آپ خفا ہو گئے۔ آخر ہمارے دفتر کیوں نہیں آتے۔ بہت سا ترجمہ آپ کے لئے رکھا ہے وہ آپ ہی کر سکتے ہیں دوسرا نہیں"۔ شاہد بھائی بڑے کشادہ دل انسان تھے، ہنس کر کہنے لگے "نہیں یہ بات نہیں ہے۔ کئی دوسرے ضروری کاموں میں مشغول تھا دو تین دن میں حاضر ہوں گا۔"

شاہد بھائی وضعداری اور شرافت کا پیکر تھے۔ میں نے زندگی میں کبھی انہیں سوٹ بوٹ میں نہیں دیکھا۔ وہی شیروانی اور کھڑا پائجامہ۔ جناح کیپ اور نیوکٹ جوتا سگریٹ کے بجائے بیڑی سے شوق فرماتے۔ جب کبھی سامنا ہوتا تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ مولوی نذیر احمد کے پوتے اور مولوی بشیر احمد کے صاحبزادے ہونے کی وجہ سے انہیں ادب کے ساتھ ساتھ مال و دولت بھی بہت کچھ ورثے میں ملا تھا۔ لیکن دولت کی فراوانی اور روپئے کی ریل پیل کے باوجود انھوں نے دہلی میں بہت سادہ زندگی بسر کی اور دولت

کو ضرورت مند ادیبوں پر پانی کی طرح بہایا۔

شاہد بھائی نے سینکڑوں ہزاروں شاعروں۔ ادیبوں۔ فنکاروں کی دامے درمے سخنے، ہر طرح کی امداد کر کے انھیں زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ انھیں میں سے ایک راجہ مہدی علی خاں صاحب بھی تھے جن کی زبانی سنئیے:

"غرضکہ سینکڑوں ادیبوں کے لئے شاہد احمد کا در برسہا برس تک درِ حاتم بنا رہا۔ وہی شاہد احمد آج ریڈیو میں اسٹاف آرٹسٹ ہے۔ اور صرف ساڑھے چار سو روپے ماہوار پا رہا ہے۔ حالانکہ ایسے کئی ساڑھے چار سو ہم لوگ اس سے چھین لیا کرتے تھے۔ زندہ باد شاہد احمد جو کبھی دلی کی رونق تھا۔ دلی کے ادب کا گہوارہ تھا۔ دلی کا دربار تھا۔ دلی کا بادشاہ تھا۔ ہر شاعر ہر ادیب کے لبوں پر اس کا نام تھا، اس طرح رہتا تھا کہ نام لینے والے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

زباں پر بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

ہم لوگوں کی یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ دونوں ملکوں کا یہ صاحب طرز انشا پرداز، واحد زباں دان، آج اس طرح گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے اور ہم لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی کہ شاہد احمد کا مشغلۂ روزگار موسیقی کی تعلیم ہے مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے برنارڈ شاہ ریوڑیاں بیچ رہا ہو۔ اور شکسپیئر نے نان کباب کی دکان کھولی ہو۔"

ملک خداداد پاکستان میں عظیم شخصیتوں کی جو ناقدری ہوئی ہے، شاہد احمد دہلوی درحقیقت اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔

منّا طارق

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

جمعہ ۲۱ فروری ۱۹۷۶ء اور سنیچر کی درمیانی شب کے سوا چار بجے صبح کو منّا طارق سوا سال تک اس دنیا میں دکھ جھیل کر ہم سب سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا اور ایسی جگہ چلا گیا جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ معصوم طارق تو سوا سال تک دکھ جھیل کر اپنی دکھ بھری زندگی سے نجات پا گیا، لیکن ہم لوگوں کو ہمیشہ کے لئے سوگوار چھوڑ گیا۔

اب سے سوا سال قبل جب منا طارق پیدا ہوا تو اچھا خاصا تھا۔ ساڑھے چھ پونڈ وزن تھا۔ ہولی فیملی ہسپتال میں پیدا ہوا تھا۔ جس کا نام بڑا لیکن کام کھوٹا ہے اور جس کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ یہاں بڑی لاپروائی برتی جاتی ہے، مگر بُرا ہو ٹیپ ٹاپ کا جسے دیکھو وہ اس پر ریجھ جاتا ہے اور اس کی جانب کھنچا چلا آتا ہے۔ لیکن تجربے کے بعد اکثر و بیشتر وہ اس ہسپتال سے شاکی اور پچھتاتا ہوا رخصت

ہوتا ہے۔

یہی تجربہ میرے نواسے منے طارق اور اس کی ماں ثریا کو ہوا۔ بچے کی پیدائش کے لئے اس کی ماں کو وہاں ایک ایسا غلط انجکشن لگا دیا گیا جس سے اس کے کولھے پر بڑا پھوڑا ہو گیا اور دو تین ماہ تک وہ سخت اذیت میں مبتلا رہی۔ اور منے طارق کو "تندرست" ہونے کا سرٹیفکیٹ دے کر ڈسچارج کر دیا گیا، جبکہ اسے پیدائشی یرقان تھا۔

میری بیٹی ثریا تو خدا خدا کر کے دو تین ماہ بعد صحت یاب ہو گئی، اور اُسے پھوڑے کا آپریشن کرانا پڑا۔ لیکن منے طارق کی بیماری میں کوئی خاطر خواہ افاقہ نہیں ہوا۔ پہلے سیونتھ ڈے ہسپتال میں داخل کیا گیا، جہاں بچوں کے لائق اور فائق معالج ڈاکٹر احمد صاحب نے اس کا بڑی توجہ سے علاج کیا اور آخر کار انھوں نے بھی اپنی رپورٹ میں آپریشن کی سفارش کی۔ اس کی جگر کی نالیوں میں کوئی رکاوٹ تھی جس سے فاسد مادہ حسبِ معمول خارج نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن اس ہسپتال کے سرجن کو مرض کے متعلق صحیح اندازہ نہیں تھا اور اس کا خیال تھا کہ پیٹ چاک کرنے کے بعد مرض کی تشخیص ہو سکے گی۔ محض تشخیص کے لئے ایک دو تین ماہ کے کمزور بچے کے پیٹ کا آپریشن کرانا کسی طرح طبیعت کو قابلِ قبول نہ تھا۔ جناح ہسپتال کے سرجنوں اور ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا گیا، جنھوں نے بچے کی کمزوری کی بنا پر آپریشن کی مخالفت کی۔

آخر کار مشرقی پاکستان سے نو وارد ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا جن کا کافی شہرہ تھا، اور پاکستانی ڈاکٹروں کے برخلاف وہ نفیر منش

انسان ہیں اور دوا کی قیمت بہت واجبی وصول کرتے ہیں۔ ان کے علاج سے ابتدا میں یرقان کو کافی فائدہ ہوا لیکن پھوڑے پھنسی اور پیچش کی شکایت پیدا ہو گئی مجبوراً بچے کو یونانی علاج کی جانب رجوع کرنا پڑا۔ ہمدرد دواخانے کے حکیم سعید صاحب نے جو بڑے خوش مزاج اور خدا ترس انسان ہیں اس کا بڑی توجہ سے علاج کیا۔ دو تین ماہ کے علاج سے اسے ظاہراً افاقہ محسوس ہوا۔ لیکن اس کے خون کے امتحان سے معلوم ہوا کہ اصل مرض گھٹنے کے بجائے بڑھ گیا ہے۔ مجبوراً کراچی کے ایک مشہور ہومیو پیتھک معالج سے رجوع کرنا پڑا، جو انتہائی نازک مزاج واقع ہوئے ہیں اور مریض کا حال سنانے میں اکثر خفا ہو جاتے ہیں۔ ان کے علاج سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوا۔ مآل کار مشرقی پاکستان والے ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوبارہ رجوع کیا گیا۔ ان کے علاج سے یرقان کو تو فائدہ ہوتا رہا، لیکن تحال شروع ہو جاتا ان کا علاج آخری وقت تک جاری رہا۔

دوا کے ساتھ دعا کا بھی سلسلہ جاری رہا۔ میں نے خانہ کعبہ اور روضۂ نبویؐ پر اس معصوم کی صحت کے لئے بارہا گڑگڑا کر دعا مانگی۔ اس دوران میں میری کوئی نماز ایسی نہیں ہوئی جس میں اس کے لئے دعا نہ مانگی ہو۔ متعدد بار اس کی صحت کے لئے آیت کریمہ اور "یا سلامُ" کا ختم پڑھا گیا۔ بزرگوں سے بھی دعائیں کرائی گئیں۔ کہتے ہیں بچوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ڈھائی سالہ منی سحر نے بارہا اپنے ننھے ہاتھ آسمان کی جانب اٹھا کر اپنی توتلی زبان میں کہا: "اللہ میاں میرے بابے دینے طارق کو بابے کہتی تھی، کو جلدی اچھا کر دو۔" لیکن اگر علاج ہی زندگی کی ضمانت ہوتا اور دوا ہی مرض کا علاج ہوتی تو دنیا میں کسی امیر آدمی کا مرض علاج

نہ ہوتا اور کوئی رئیس زندگی سے مایوس ہو کر موت سے ہمکنار نہ ہوتا۔ خدا نے اپنی قدرت کے کیا کیا کرشمے دکھائے ہیں۔ حکیم جالینوس معدہ کی بیماریوں کا دنیا میں سب سے بڑا معالج تسلیم کیا جاتا ہے اور آج بھی اس کی جوارشِ جالینوس معدہ کی سب سے مفید دوا مانی جاتی ہے لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ وہ معدہ کی بیماری میں ہی زندگی سے دست بردار ہوا۔ اسی طرح حکیم بوعلی سینا درد قولنج کے سب سے نامور معالج تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لاکھوں مریضوں کو اس موذی مرض سے انھوں نے نجات دلائی اور اسی مرض میں وہ ملکِ بقا کو سدھارے۔ اسی طرح دعا بھی اگر ہمیشہ مستجاب ہوتی تو دوا کی کیا ضرورت تھی۔ خود ہمارے برگزیدہ پیغمبر کے اکلوتے صاحبزادے حضرت ابراہیم کا صغر سنی میں انتقال ہو گیا۔

لیکن دل اس لئے دکھتا ہے کہ اس معصوم نے اپنی سوا سالہ زندگی میں بڑا دکھ جھیلا۔ ایک دن بھی وہ آرام سے نہیں سویا۔ زکام۔ کھانسی۔ ہچکی۔ تحال۔ بخار۔ کھجلی، پھوڑے پھنسی کا وہ مسلسل شکار رہا اور اندر اندر اسے خدا جانے کیا کیا تکلیفیں اور درد رہا ہوگا جسے وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے جب دیکھتا تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ مسلسل فریاد کر رہا ہے۔ اور کبھی خوش ہوتا تو اپنی گردن ہلاتا۔ اس کی کھجلی کا یہ عالم تھا کہ کھجاتے کھجاتے وہ اپنے کان اور بدن کو لہولہان کر لیتا۔ آخری ایام میں جب اس کے تیماردار بہت اکتا گئے تو منّے طارق کو بظاہر صبر آگیا اور صبح کے وقت وہ گھنٹوں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا جبکہ اس کی تیماردار نماز اور وظیفے میں مشغول ہوتی۔

منّے طارق کی صحت کے لئے دعا کرتے ہوئے اکثر دل میں خیال پیدا ہوتا

کہ "یا اللہ یہ معصوم بے زبان کیوں اتنا دکھ جھیل رہا ہے۔ یہ تو معصوم ہے" اور بار بار زبان پر یہ جملہ آیا کہ "یا خدا میرے پاس انسان کا دل ہے میں کیسے اس معصوم کے دکھ کو برداشت کروں" لیکن انسان کی فہم محدود اور ناقص ہوتی ہے۔ خدا ہی اپنی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

منے طارق نے آخری تین دن بڑے اذیت ناک گزارے۔ اسے تیز بخار رہا آخری دو دن تو اس کی پلک تک نہیں جھپکی۔ آخری رات اس کو سخت بےچینی رہی اس کی سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی اور وہ بار بار اپنے سر کو جھٹکے دے رہا تھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُسے کیا تکلیف تھی۔ مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا اور میں تو اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تیمارداروں کا بیان ہے کہ آخری دو تین گھنٹے وہ بہت زور زور سے کراہتا رہا۔ اس نحیف و نزار کے کراہنے کی آواز دوسرے کمروں تک سنائی دیتی تھی۔ آخر کار سوا چار بجے صبح کو اس معصوم کی بیقراری کو قرار آ ہی گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

سیّد محمد جعفری

وہ بھی کیا زمانہ تھا، جب کراچی میں پاکستان کے مرکزی محکمہ اطلاعات کا صدر دفتر واقع تھا اور وہ بھی کیا دن تھے، جب اس دفتر میں بڑی بڑی صاحب علم وفن اور باغ وبہار شخصیتیں رونق افروز تھیں۔ ان میں سے سب سے نمایاں شخصیت سید محمد جعفری صاحب کی تھی۔ جو بڑے باغ وبہار انسان تھے اور جن کی اچھوتی مزاحیہ شاعری کا ڈنکا سارے برصغیر ہند و پاکستان میں بج رہا تھا۔

مشاعروں نے اردو شعرا اور اردو شاعری کو عوام وخواص سے روشناس کرانے اور اردو شاعری کو مقبول عام بنانے میں بہت شاندار کردار ادا کیا ہے۔ بیسویں صدی نے اردو مشاعروں کے بڑے بڑے مقبول شاعر پیدا کئے۔ جو مشاعروں کو لوٹ لیا کرتے تھے، اور جن کے کلام کو سن کر سامعین واہ واہ سبحان اللہ سے پنڈال اڑا دیا کرتے تھے۔ مشاعروں کے ان مقبول شعرا کے سرخیل حضرت جگر مرادآبادی تھے جن کے کلام کی تاثیر اور سرمستی نے انہیں قبول عام کا درجہ دیا تھا۔ مزید برآں قدرت نے

انھیں نور کا گلا عطا کیا تھا اور جب یہ اپنا اچھوتا کلام اپنے اچھوتے انداز میں سناتے تو سامعین سرشاری اور سرمستی میں جھومنے لگتے اور سارا پنڈال واہ واہ کے نعروں سے گونجنے لگتا۔ یوں تو جدید اردو غزل کے چار ستون حسرت۔ فانی۔ اصغر اور جگر اور ان کے علاوہ بھی اکبر۔ صفی۔ عزیز۔ آرزو۔ فراق۔ روش اور ساغر کے کلام بھی مشاعروں میں بڑی قدر اور توجہ سے سنے جاتے تھے، لیکن مشاعروں میں شعرا کی مقبولیت کے لئے پرتاثیر کلام کے ساتھ ساتھ دلکش انداز بیان بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں صفات جب اکٹھی ہو جائیں تو واہ واہ کے ڈونگرے بھی بے حساب برسنے شروع ہو جاتے ہیں۔

اسی لئے مشاعرہ کے شعرا میں جن میں یہ دونوں صفات پائی جاتی ہیں حضرت جگر مراد آبادی، حفیظ جالندھری۔ ماہر القادری۔ احسان دانش۔ مجروح سلطان پوری۔ فنا کان پوری۔ معین جذبی۔ شکیل بدایونی۔ ساغر نظامی۔ نقشب جارچوی۔ ساحر صدیقی اور زہرہ نگاہ خاص طور سے بہت کامیاب رہے ہیں اور سامعین نے ان کے کلام کو سن کر واہ واہ سے مشاعروں کے اکثر پنڈال اڑا دیئے ہیں۔

یہ تو سنجیدہ اور غیر مزاحیہ شعراء کا ذکر تھا۔ مزاحیہ شعراء میں سب سے زیادہ مقبول حضرت اکبر الہ آبادی۔ حضرت ظریف لکھنوی۔ بوم میرٹھی۔ ظریف جبلپوری اور پاکستان میں عظیم ترین سید محمد جعفری تسلیم کئے جاتے ہیں۔ حضرت اکبر الہ آبادی کے متعلق تو یہ معلوم نہیں کہ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے یا نہیں۔ کیونکہ ان کا انتقال میرے سن شعور سے پہلے ہو چکا تھا، لیکن بہ حیثیت

مزاحیہ شاعر کے ان کا کلام نہ صرف زبان اردو میں لاجواب ہے بلکہ دنیا کی کسی شاعری میں اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار ضرب المثل ہو کر زبان زد خاص و عام ہیں۔ باقیماندہ مندرجہ بالا مزاحیہ شعرا کو مشاعروں میں میں نے بارہا سنا ہے۔ ان کا کلام سن کر محفل مشاعرہ زعفران زار میں تبدیل ہو جاتی تھی اور ہنستے ہنستے سامعین کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد سید محمد جعفری کی مانگ صرف پاکستان کے مشاعروں میں ہی نہیں بلکہ بھارت کے مشاعروں میں بھی ہوتی تھی اور ان کی شرکت سے مشاعروں میں جان پڑ جاتی تھی،

یوں تو میں سید محمد جعفری کو "عظیم الشان" سالانہ مشاعروں میں دو ایک بار پہلے سن کر ان کو داد دے چکا تھا، لیکن ان سے میری شناسائی ۱۹۵۱ء میں ہوئی، جب میں مرکزی محکمہ اطلاعات میں بحیثیت جرنلسٹ (انفارمیشن اسسٹنٹ) کے ملازم ہوا۔ جعفری صاحب اس وقت انفارمیشن افسر تھے اور ان کے ساتھ اس محکمہ کے انفارمیشن افسروں میں بہت لائق اور فائق پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے سابق نمائندہ خصوصی رشید احمد رزاقی صاحب اور امریکہ کے سند یافتہ کمال فاروقی صاحب بھی تھے۔ مرکزی محکمہ اطلاعات اس زمانہ میں بلند پایہ ادیبوں اور صحافیوں کا گہوارہ تھا۔ ان میں زیبا ردولوی۔ خلیل قدوائی اور سید محمد جعفری تو پاکستان کے جانے پہچانے شعرا میں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ برصغیر کے شہرۂ آفاق جریدے، نئے دور کے سابق ایڈیٹر اور مشہور افسانہ نگار خاتون ممتاز شیریں کے شوہر نامدار ڈاکٹر صمد شاہین۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے نائب سکریٹری مرزا علی اظہر متعدد کتابوں کے مصنف پروفیسر محمود بریلوی اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام

کے مضمون نگار بزمی انصاری بھی اس محکمہ سے وابستہ تھے۔ ان کے علاوہ متعدد ایسی شخصیتیں بھی اس سے منسلک تھیں جنھوں نے بعد ازاں میدان صحافت اور نشریات میں بڑا نام پیدا کیا۔ ان میں ریاض فرشوری جو ریڈیو پاکستان پر فیچر نگار اور متعدد روزناموں میں کالم نویس نیز محبوب جمال زاہدی جو بعد ازاں ڈان کے نیوز ایڈیٹر مقرر ہوئے قابل ذکر ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت بھی اس محکمہ سے برسوں منسلک رہے۔

غالباً ۱۹۵۴ء میں میری ترقی بحیثیت اسسٹنٹ انفارمیشن افسر ہوگئی تو میرا تبادلہ فارن (غیر ملکی) پبلسٹی برانچ میں ہوگیا۔ جس کے سربراہ اسلم صدیقی تھے جو اب ریٹائر ہوکر کئی انگریزی کتابوں کے مصنف ہیں، میرے کمرے میں محبوب جمال زاہدی جو اب ڈان کے نیوز ایڈیٹر ہیں اور محمد دین صاحب جنھیں سب لوگ ان کے انگریزی لب ولہجہ کی وجہ سے ڈین (DEEN) صاحب کہا کرتے تھے۔ جو اب ترکی میں پاکستان کے پریس اتاچی ہیں بیٹھا کرتے تھے اور سامنے والے کمرے میں جلیل قدوائی۔ رشید رزاقی صاحب۔ ڈاکٹر صمد شاہین اور سید محمد جعفری صاحب بیٹھا کرتے تھے۔ اس کمرے میں دن بھر رونق رہتی تھی۔ اور آنے جانے والے مہمانوں، ادیبوں، صحافیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ جہاں جعفری صاحب کے چٹ پٹے اور گرما گرم اشعار۔ رزاقی صاحب کے برجستہ جملوں، ڈاکٹر صمد شاہین کے عالمانہ لیکن پیچیدہ تبصروں اور جلیل قدوائی کے طولانی قصوں سے مہمانوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ غرض کہ دن بھر اس کمرے میں جشن کا سماں رہتا تھا۔ ہو حق کی صدائیں اکثر بلند ہوکر ملحقہ کمرے والوں کو بھی اپنی جانب متوجہ

کرلیتی تھیں اور ہم لوگ بھی اس بزم طرب سے محظوظ ہونے کے لئے وہاں پہنچ جاتے تھے۔ وہ دن اب خواب و خیال ہو گئے۔ جب یاد آتے ہیں تو دل کا عجیب حال ہو جاتا ہے۔

سید محمد جعفری صاحب بڑے مرنجا مرنج انسان تھے۔ ظریف مرحوم کی طرح وہ اپنے اشعار سے سامعین کو ہنساتے اور محفل کو زعفران زار بنا دیتے لیکن خود نہیں ہنستے تھے۔ بہت ہوا تو مسکرا دیتے۔ دوسروں کو ہنسا کر لطف اندوز ہوتے تھے۔ جس مشاعرے میں وہ شامل ہوتے تھے۔ اس کی رونق دوبالا ہو جاتی مشاعروں میں عموماً وہ آخر میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کو سننے کے لئے سامعین اپنی جگہ پر جمے بیٹھے رہتے اور جب جعفری صاحب اپنا کلام سناتے تو پنڈال میں بھونچال آ جاتا اور قہقہوں سے کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی مشاعروں میں انھیں ایک نظم کے بعد چھٹی نہیں ملتی تھی۔ دو تین نظمیں سنانی پڑتی تھیں۔ اس کے بعد بھی سامعین کا اصرار جاری رہتا۔ ان کی سبھی نظمیں بڑی دلکش ہیں لیکن ان میں کلرک۔ ایبسٹریکٹ آرٹ۔ پرانی موٹر۔ وزیروں کی عید۔ نیلامی کوٹ۔ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کے سیاسی حالات یہاں تک کہ سیاسی اور برسرِ اقتدار شخصیات پر بہت لطیف طنز کیا ہے۔ وزراء اور سفرا مشاعرے اور نجی محفلوں میں جعفری صاحب کے طنز آمیز اشعار سن کر محظوظ ہوتے تھے۔

جعفری صاحب بڑے برجستہ گو تھے۔ کلیم کے تحت مجھے ایک باغ الاٹ ہوا تو انھوں نے برجستہ آدھے درجن اشعار مجھے سنا دیئے جو میرے حافظہ سے محو ہو گئے ہیں، افسوس ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی مجموعۂ کلام نہیں طبع کرایا۔

اور نہ وہ اپنے اشعار اخباروں اور رسالوں میں بھیجتے تھے۔

جعفری صاحب بڑے بے باک شاعر تھے۔ وہ مشاعروں اور نجی محفلوں میں جس میں اکثر وزراء اور سفرا شریک ہوتے تھے برسر اقتدار شخصیات پر چوٹ کرنے سے باز نہیں رہتے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں انھوں نے بھارت کے مرد آہن سردار پٹیل پر بھی چوٹ کی اور ایک نجی محفل میں جس میں پنڈت نہرو شریک تھے یہ نظم سنائی۔ اس کا ایک شعر تھا۔

مسلمان سے لڑنے چلا ہے پٹیل
چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل

برسر اقتدار حضرات بھی جعفری صاحب کے طنز پر محظوظ ہوتے تھے اور برا نہیں مانتے تھے۔ کیونکہ جعفری صاحب کے طنز میں تلخی کے بجائے لطافت اور نفرت کے بجائے یگانگت پائی جاتی ہے۔ ایک بار صدر ایوب خاں کے سامنے انھوں نے "چور بازاری" کی نظم پڑھی جس میں برسر اقتدار حضرات کا خوب خوب مذاق اڑایا گیا تھا۔

جعفری صاحب نے تجریدی آرٹ پر ایک بڑی دلآویز نظم لکھی ہے جس میں تجریدی آرٹ کی بڑی گت بنائی گئی تھی۔ اس کا ایک مصرعہ ہے:

جس کو سمجھے تھے انناس وہ عورت نکلی

یو این او (UNO) کے متعلق ان کی شہرہ آفاق نظم کا ایک پر مغز مصرعہ ہے:

یو ایس اے کا یو (U) ہے اس میں اور باقی تو ہی نو (NO)

کشمیر میں یو این او کے کردار کے متعلق فرماتے ہیں:

کیسا اچھا فیصلہ کرتا رہا کشمیر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جعفری صاحب کو اقبال اور غالب کے مصرعوں کے ساتھ تضمین کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی اور اس صفت میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔

جعفری صاحب جنھوں نے قرض لے کر مکان بنوایا تھا اپنے مکان کا نام بیت المقروض رکھا تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اپنا مجموعۂ کلام نہیں چھپوایا اور ان کا کلام صفحۂ قرطاس کے بجائے ان کے لوحِ دماغ میں محفوظ تھا۔

دوستوں اور دشمنوں کو ہنسانے والا یہ مرنجامرنج انسان آخر کار، جنوری ۱۹۷۶ء کو اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو کوچ کر کے اپنے دوستوں کو ہمیشہ کے لئے سوگوار چھوڑ گیا۔

اردو کے مایۂ ناز شاعر صفی لکھنوی نے اپنے چھوٹے بھائی ظریف لکھنوی کے انتقال پر جو برصغیر کے عظیم مزاحیہ شاعر تھے ایک شعر کہا تھا جس کا ایک لاجواب مصرعہ ہے: "ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رلا کے اٹھا!"

سید محمد جعفری کے انتقال پر یہ مصرعہ بے اختیار زبان پر آرہا ہے کیونکہ یہ ان کے بالکل حسبِ حال ہے۔

محمد شعیب

لیجئے شعیب صاحب بھی ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسی جگہ جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ وہ عالمی مالیات میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔

پاکستان میں یوں بھی عالمی شخصیتوں کا قحط الرجال ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے قیام پاکستان کے بعد صرف پانچ افراد نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے دو تو سائنس داں ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی دونوں حضرات ایف آر ایس (فیلو رائل سوسائٹی) ہیں۔ دو حضرات نے اسلامیات میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر حمید اللہ (جو درجنوں زبانوں میں اسلام سے متعلق بلند پایہ تصانیف اور مضامین کے مصنف ہیں اور آج کل پیرس میں مقیم ہیں) اور پانچویں تھے محمد شعیب جو داغ مفارقت دے گئے اور جو چوبیس سال سے عالمی بنک کے اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز تھے۔ جنھیں عالمی بنک نے جیتے جی نہ چھوڑا اور بحیثیت مشیران کا تعلق عالمی بنک سے مرتے وقت تک قائم رہا۔

شعیب صاحب ۶؍ستمبر ۱۹۰۴ء کو جونپور یوپی۔ انڈیا کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم جونپور میں پائی، اس کے بعد الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۲۴ء میں بی اے اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ معاشیات میں اول آئے۔ بعدازاں ۱۹۲۶ء میں ایم اے (معاشیات) اور ایل ایل بی ساتھ پاس کیا۔ اسی سال انھوں نے آڈٹ اکاؤنٹس کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کیا۔

شعیب صاحب نے غیر معمولی حافظہ پایا تھا جو کتاب ایک بار پڑھ لیتے تھے وہ حفظ ہو جاتی تھی۔ اس معاملے میں انھوں نے ایک بار اپنے ممتحن کو سخت مغالطے میں ڈال دیا۔ امتحان کے ایک پرچے میں انھوں نے مختلف کتابوں سے بڑے طویل حوالے دیے۔ ممتحن نے جب کاپی جانچی تو اس نے خیال کیا کہ اس طالب علم نے ضرور نقل کی ہے اور اس طرح انھیں نمبر بہت کم ملے۔ جس پر شعیب صاحب کو تعجب ہوا۔ انھوں نے دوبارہ کاپی جانچنے کی درخواست دی اور ممتحن کے پاس جاکر وہ سارے جوابات جو انھوں نے تحریر کئے تھے اور اس کے علاوہ مختلف کتابوں کے طویل حوالہ جات بھی اُسے زبانی سنائے۔ ممتحن کو شعیب صاحب کے غیر معمولی حافظہ پر سخت حیرت ہوئی اور اس نے اپنی غلط فہمی کی تلافی کردی۔

شعیب صاحب غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں زبردست ترقی کی تھی۔ اور اپنے سے متعدد سینئر انگریز افسروں پر بھی سبقت لے گئے اور ۱۹۴۲ء میں چیف کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس کے عہدہ پر انھیں ترقی دے دی گئی۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان عالم وجود میں آیا تو یہاں انھوں نے متعدد عہدوں پر بہت نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ انھوں نے

ہندو پاکستان کے اثاثوں کی تقسیم کا معاملہ بھی بخیر و خوبی سلجھایا۔ اور پاکستان کی دفاعی سروسوں کی مالیات کو منظم کیا۔ پاکستان میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹس کی بنیاد رکھی جس کا شمار دنیا کے اہم متعلقہ اداروں میں ہوتا ہے۔ اور اس ادارے نے ہزاروں اکاؤنٹنٹ پیدا کیے، جو پاکستان اور بیرونِ پاکستان اہم خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

پاکستان میں شعیب صاحب کے ساتھ لیکن انصاف نہیں کیا گیا۔ لیاقت علیخاں وزیر اعظم تھے۔ جب شعیب صاحب کے مقابلہ میں ایک بہت کمتر اور جونیر حضرت کو مالیات کا سکریٹری بنا دیا گیا تو شعیب صاحب ایسے شاندار تعلیمی اور سروس ریکارڈ رکھنے والے شخص کو اس کا بڑا دکھ ہوا انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور عرصہ تک دفتر نہیں گئے۔ اس زمانے میں وہ الہ آباد یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے اور میں اس کا ایک ادنیٰ کارکن تھا۔ ایک صبح کو میں ایک اور اولڈ بوائے کی معیت میں شعیب صاحب سے ملنے گیا۔ وہ اپنے اسٹاف لائنز والے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھے بالائی کھا رہے تھے جو انھیں بے حد مرغوب تھی۔ کہنے لگے میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اب میں انکم ٹیکس پریکٹس کروں گا، اور اس سے دس گنا زیادہ پیسے کماؤنگا۔

بعد ازاں معلوم ہوا کہ شعیب صاحب کا استعفیٰ منظور نہیں ہوا، اور کچھ دنوں بعد انھیں عالمی بنک میں بحیثیت ڈائرکٹر کے جگہ مل گئی۔ بعد ازاں وہ ترقی کر کے اس کے نائب صدر بن گئے۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جنھیں یہ اعزاز بخشا گیا تھا اور دنیا میں غالباً واحد شخص تھے جن کا تعلق عالمی بنک سے چوبیس سال تک قائم رہا۔ اور جن کو عالمی بنک نے جیتے جی نہیں چھوڑا۔

۱۹۵۸ء میں جب ایوب خاں نے انھیں پاکستان کا وزیر خزانہ بنایا تو امریکہ کے موقر روزنامے نیویارک ٹائمز نے اپنے اداریہ میں شعیب صاحب کو شاندار خراج تحسین ادا کیا اور انھیں مشرق کا عظیم ترین ماہر مالیات گردانا۔

شعیب صاحب ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۲ء تک پاکستان کے وزیر خزانہ رہے۔ ۱۹۶۲ء میں انھوں نے پاکستان کابینہ سے استعفیٰ دے دیا، لیکن ۱۹۶۳ء میں انھیں دوبارہ پاکستان کی وزارت خزانہ کی پیش کش کی گئی، جسے انھوں نے قبول کر لیا اور ۱۹۶۷ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ عالمی بنک ان کے لئے چشم براہ تھا۔ جب وہ امریکہ جانے لگے تو الہ آباد یونیورسٹی اور اولڈ بوائز نے ہوٹل انٹر کانٹینٹل میں انھیں الوداعی ڈنر دیا۔ رخصتی تقریر میں وہ کہنے لگے کہ میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ جب کبھی کوئی آزمائش کی گھڑی آئے تو اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے پھر ہنس کر کہنے لگے حالانکہ میں یہاں کی آزمائش سے بھاگ نکلا، اگرچہ کافی انتظار کے بعد جانے کی اجازت ملی۔

شعیب صاحب اردو شاعری کے دلدادہ تھے۔ اور مشاعروں میں وہ بڑی دلچسپی لیتے تھے بڑے سخن فہم اور جدید اردو شاعری کے شیدائی تھے۔ خصوصاً جگر مرادآبادی اور اصغر گونڈوی ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ جگر اور اصغر سے ان کی یہ وابستگی انھیں الہ آباد یونیورسٹی کے مسلم ہوسٹل سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہاں کے سالانہ مشاعروں کے یہ دونوں انتہائی مقبول شعراء تھے۔

شعیب صاحب نے پاکستان کی زرعی معیشت کو نیم صنعتی معیشت میں تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کو ایک صنعتی ملک بنانے کا سہرا انھیں کے سر ہے مجھے یاد ہے

عالمی بنک نے اپنی رپورٹ میں اس معاملہ میں پاکستان کی بڑی تعریف کی تھی اور لکھا تھا کہ ترقی پذیر ممالک میں پاکستان نے بین الاقوامی قرضوں کو سب سے بہتر طور سے استعمال کیا ہے۔

اپنے بارے میں

(ا)

سعودی عرب میں ایک ماہ

حکومت سعودی عرب کی دعوت پر جب میں ۲۵ر جنوری ۱۹۷۵ء کو سعودیہ طیارے سے ریاض کے ایرپورٹ پر مقامی وقت کے مطابق ½ ۸ بجے شب کو پہنچا تو طیارہ سے نیچے اترتے ہی سوٹ میں ملبوس ایک طویل قامت صاحب نے انگریزی زبان میں مجھ سے سوال کیا: "آپ جمیل احمد ہیں"۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کہنے لگے" میں وزارۃ العالام (وزارت اطلاعات) میں تعلقات عامہ کا ڈائرکٹر ہوں اور آپ کے استقبال کے لیۓ آیا ہوں"۔ مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنے مسافروں میں پہلی نظر میں انھوں نے کس طرح مجھے پہچان لیا۔ شاید اس لیۓ کہ فرسٹ کلاس سے صرف دو مسافر اترے اس میں سے ایک میں تھا، وہاں سے مسٹر عزالدین جو سوڈانی ہیں اور وزارت اطلاعات سعودی عرب کے تعلقات عامہ میں اہم عہدہ پر فائز ہیں اور اچھی خاصی انگریزی بولتے ہیں، قریب ہی واقع مشہور صحاری پیلس ہوٹل میں لے گئے۔ جہاں پہلی منزل پر میرے لیۓ ایک کمرہ پہلے سے مختص تھا۔

یہ ہوٹل ریاض کا سب سے شاندار اور بڑا ہوٹل ہے ۔ اور مہینوں قبل یہاں کمرہ مختص کرانا پڑتا ہے ۔ ریاض میں آنے والے اہم غیر ملکی تجار، صنعت کار اور صحافی اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں جو ایر کنڈیشن اور بہت آرام دہ ہے ۔ اس ہوٹل میں ساڑھے چار سو سے زائد کمرے ہیں لیکن یہ سارا کا سارا مغربی ممالک کے سیاحوں ۔ تجار، اور صنعت کاروں سے بھرا رہتا ہے ۔ تقریباً تین ہفتے کے قیام کے دوران مجھے یہاں ایک دن صرف چند جاپانیوں سے ملاقات ہوئی، ورنہ اس دوران میں مجھے یہاں ایک بھی ایشیائی نظر نہیں آیا ۔ ہاں میرے یہاں جانے کے دو تین دن بعد یہاں عالمی بنک کے محمد شعیب صاحب آنے والے تھے اور ان کے لیئے ایک کمرہ مختص تھا ۔ اس وجہ سے اس ہوٹل میں بڑی اجنبیت کی محسوس ہوتی تھی ۔ کسی سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا ۔ ایک دن جب میں مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھ کر ہوٹل میں داخل ہوا تو عقب سے ایک صاحب نے سلام علیکم کہہ کر مجھے مخاطب کیا ۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک نہایت خوش رو نوجوان، مغربی لباس زیب تن کئے میری جانب بڑھا ۔ کہنے لگا "میں البانی مسلمان ہوں اور اس ہوٹل میں مقیم ہوں اور سوئٹزرلینڈ کی لائف اسٹاک کمپنی کا نمائندہ ہوں" دو تین دن تک وہ وہاں مقیم رہا ۔ بعد ازاں کویت چلا گیا ۔

اس ہوٹل کے استقبالیہ اور ڈرائنگ روم میں بیرونی مینجر وغیرہ اچھی خاصی انگریزی بولتے تھے اور بیرے بھی انگریزی سمجھ لیتے اور اس میں شد بد کر لیتے تھے ۔ اس ہوٹل میں مغربی ممالک کے سربر آوردہ کاروباری افراد کی بڑی ریل پیل تھی، جو سعودی حکومت کو خوش کرنے اور ان سے کاروباری مراعات حاصل کرنے کے لئے

دن رات کو شاں رہتے تھے۔ ایک امریکی ڈپلومیٹ نے ایک امریکی میگزین میں حال میں لکھا تھا کہ سعودی عرب میں امریکن اور یورپین اسی طرح ٹوٹ پڑے ہیں جس طرح سونے کی تلاش میں یورپ کے لوگ امریکہ پر ایک زمانے میں ٹوٹ پڑتے تھے۔

رات بھر ہوٹل میں آرام کرنے کے بعد میں نو بجے نیچے لاونج میں آیا تو سعودی حکومت کے تعلقات عامہ کے ڈائرکٹر مسٹر عز الدین میرے منتظر تھے۔ میرے استعمال کے لئے ایک امپالا کار مع ڈرائیور کے انھوں نے مخصوص کردی تھی۔ میں ان کے ساتھ وزارت اطلاعات گیا اور وہاں ڈائرکٹر جنرل تعلقات عامہ مسٹر سلیمان شبیلی اور ڈائرکٹر جنرل پریس مسٹر غالب سے ملاقات ہوئی۔ دونوں انگریزی اچھی خاصی بولتے ہیں۔ مسٹر شبیلی بڑے اخلاق اور خلوص کے ساتھ ملے۔ کہنے لگے کہ آپ سعودی عرب کو اپنا ملک اور ہمیں اپنا بھائی سمجھیں۔

اس ہفتہ میں نے ریاض میں مختلف کتب خانے دیکھے جن میں یونیورسٹی (جامعہ) اور انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن (ادارہ) اور ادارہ عبدالعزیز اور دارالکتب وطنیہ کے کتب خانے بہت بڑے تھے۔ ان میں عربی کی بیشمار کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ اور جدید امریکی طرز کی فہرست کتب CATALOGUE مرتب کی گئی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن اور یونیورسٹی کی عمارتیں اور ساز و سامان بہت جدید قسم کا ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی امریکی یونیورسٹی یا لائبریری میں ہم داخل ہو گئے ہیں۔ ان اداروں میں متعدد پاکستانی اور ہندوستانی مسلمان بھی کام کرتے ہیں۔

ان کتب خانوں میں انگریزی کی کتابیں بہت کم ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا۔ ہٹی اور فلبی کی کتابوں کے سوا ایک انگریزی داں محقق کو یہاں سعودی عرب کی تاریخ سے متعلق مواد بہت کم دستیاب ہو سکتا ہے۔ فلبی۔ ولیمز اور امین ریحان کی جو انگریزی کتابیں سعودی عرب اور سعودی عرب کے معمار ملک عبدالعزیز سے متعلق یہاں دستیاب ہیں وہ زیادہ تر ڈائری اور تذکرے کی شکل میں تحریر کی گئی ہیں۔ ان میں روزمرہ کے واقعات کی بھرمار ہے اور انھیں سوانح حیات نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے سعودی عرب کے معمار ملک عبدالعزیز کی شخصیت نمایاں ہو کر نہیں ابھرتی ہے اور ان کی عظمت کا نقش قلوب پر مرتب نہیں ہوتا ہے۔

ریاض میں ان ایام میں غیر ملکی وفود کی بھرمار تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ایک ہفتے کے دوران وہاں صحافت، فلم۔ ٹیلی ویژن۔ فوٹو گرافوں کے تقریباً دو درجن وفود وارد ہوئے۔ جن میں سے امریکہ۔ انگلستان۔ فرانس۔ جاپان۔ اسپین۔ چاڈ۔ اور جرمنی کے متعدد فلمی اور صحافیوں کے وفود وہاں آئے۔ اتنے وفود تو پاکستان میں سال بھر میں بھی نہیں آتے جتنے ریاض میں ایک ہفتہ کے دوران آئے۔ ان میں برطانوی صحافیوں کے وفد میں انگلستان کے متعدد نامور صحافی شامل تھے۔ جاپانیوں کے متعدد ٹی وی۔ فلم فوٹو گرافی اور صحافیوں کے وفود آئے۔ جغرافیہ کی شہرہ آفاق عالمی میگزین کے ایک فوٹو گرافر اور ایک صحافی بھی دو تین ہفتے کے لئے سعودی عرب آئے۔ لیکن سعودی حکومت کے تعلقات عامہ کے صرف دو تین انگریزی داں افسران ان وفود سے متعلق انتظامات پر مامور تھے۔ اور انھیں سعودی عرب کی مختلف شخصیات سے ملاتے تھے۔

ریاض میں صحاری پیلس ہوٹل شہر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر ایر پورٹ کے قریب واقع ہے۔ پاکستانی اور ہندوستانی حضرات جو ریاض میں ملازمت کرتے ہیں وہ شہر میں رہتے ہیں۔ اس طرح میں اردو بولنے والی دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ ہوٹل میں ڈائننگ روم میں بھی علیحدہ دو کرسیوں والی میز پر بیٹھتا تھا۔ دوسرے مغربی افراد اپنی ٹولیوں میں بیٹھتے تھے۔ ڈائننگ روم کا منیجر جو بیرٹی تھا بہت اچھی انگریزی بولتا تھا۔ لیکن کھانے کے نام فرانسیسی زبان میں بتاتا تھا جو میرے لیے بالکل نامانوس تھے، اور اکثر عجیب وغریب قسم کے کھانوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ مشروبات (شراب کے علاوہ) البتہ اچھی ہوتی تھیں اور صبح اور شام کا ناشتہ البتہ اپنی طبیعت کے مطابق بہت اچھا اور قسم قسم کا ہوتا تھا۔

ریاض میں تعمیرات کا کام بڑے زور شور سے جاری ہے۔ سڑکوں کا نظام بہت اچھا اور مغربی ہے، اور جدید طرز کی عمارتیں تیزی کے ساتھ سطح زمین پر ابھر رہی ہیں۔ سڑکیں بہت کشادہ اور ہموار۔ جگہ جگہ ان پر جدید طرز کے روشنی کے سگنل آویزاں ہیں۔ سڑکوں پر دوڑنے والی بڑی بڑی گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں اس ملک کی روزافزوں دولت کا پتہ دیتی ہیں۔ پرانی اور چھوٹی گاڑیاں یہاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ مغربی شہروں کے طرز پر یہاں مختلف اشیاء کی بڑی بڑی دوکانیں ہیں جہاں کمپیوٹر کے ذریعہ قیمتوں کا حساب لگایا جاتا ہے۔

سعودی عرب کے حکمراں ملک فیصل عبدالعزیز اس ملک کے انتہائی ہردلعزیز سربراہ ہوئے ہیں جو ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے۔ انتہائی افسوس ہے کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء کو اس عظیم مسلمان حکمراں کو ان کے ناہنجار بھتیجے نے شہید

کردیا جس سے دنیائے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور اس طرح دنیائے اسلام کو متحد کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ شاہ فیصل نے گزشتہ عشرے میں دنیائے عرب کو ایک انتہائی باوقار، پرخلوص اور باصلاحیت قیادت فراہم کی اور ساری دنیائے اسلام میں ان کی انتہائی عزت کی جاتی تھی۔ اور ان کی بات کو سب سے زیادہ وزن دیا جاتا تھا۔ گزشتہ عرب اسرائیل جنگ میں جس طرح انھوں نے جنگ میں شامل عرب ممالک کی دامے، درمے، سخنے امداد کی اس نے انھیں دنیائے اسلام کا قائد اعظم بنا دیا ہے۔ عربوں نے جب تیل کا حربہ مغربی ممالک اور اسرائیل کے خلاف استعمال کیا تو امریکہ کو یہ خیال تھا کہ اس معاملہ میں تیل پیدا کرنے والے ممالک متفقہ موقف اختیار نہیں کر سکیں گے۔ لیکن شاہ فیصل کی قیادت میں تیل پیدا کرنے والے ممالک نے متفقہ موقف اختیار کر کے مغربی ممالک جاپان اور خصوصاً امریکہ کو سخت آزمائش میں مبتلا کر دیا، اور ان کی معیشت کو سخت نقصان پہنچایا۔

شاہ فیصل نے اپنے قدیم حلیف امریکہ کو بھی چیلنج کر دیا کہ اگر وہ اپنی یہودی نواز پالیسی کو ترک نہیں کرے گا تو سعودی عرب اسے تیل کی مراعات نہیں دے گا۔ مغربی ممالک کو آخر کار جھکنا پڑا، اور انھوں نے سعودی عرب اور دیگر تیل پیدا کرنے والے ممالک کی خوشامد شروع کر دی۔

شاہ فیصل ایک بہت دیانت دار، با اصول اور متشرع انسان تھے۔ پنج وقتہ پابندی سے نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ اور جمعہ کے دن جامع مسجد ریاض میں عوام کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ دوست دشمن سبھی ان کی عزت کرتے

دن میں سولہ گھنٹہ وہ اپنے دفتر دیوان مالکی میں جم کر کام کرتے تھے۔ اور رات کو دس بجے دفتر سے اٹھتے۔ انھوں نے اس دفتر میں مجھے ۱۱ر فروری کو دوبارہ شرف باریابی بخشا۔ اس سے قبل میں جدہ کے قصر الحمرا میں ۱۲ر جنوری ۱۹۷۵ء کو جب حج کرنے گیا تھا ان سے مل چکا تھا۔ وقت کے وہ اتنے پابند تھے کہ لوگ ان کی آمد و رفت سے اپنی گھڑیاں ملاتے تھے۔

میں نے ریاض میں انیس دن قیام کیا۔ میں سرکاری مہمان تھا اور سعودی حکومت نے میری ہر طرح سے خاطر داری کی۔ مجھے جو امپالا گاڑی ملی تھی اسے میں صرف دو تین گھنٹے استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ ڈرائیور عبدالہادی عربی کے علاوہ کوئی زبان نہیں جانتا تھا، اس لئے میں دو بجے دن کو اسے خدا حافظ کہہ دیتا تھا۔ عربی جاننا سعودی عرب میں بہت ضروری ہے اور میری سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ میں عربی نہیں جانتا تھا۔

ایک دن میں ریاض سے تقریباً بیس میل دور سعودی حکومت کے قدیم صدر مقام درایا گیا۔ جہاں سعود اول اور شیخ عبدالوہاب کے مزار ہیں۔ میں اپنے ساتھ ایک ہندوستانی نوجوان محمد اسد کو لے گیا تھا۔ جو ریاض کے ایک کتب خانہ میں ڈپٹی لائبریرین تھے وہ عربی خوب بولتے ہیں۔ وہ میری ترجمانی کے فرائض ادا کرتے تھے۔ درایہ کے گورنر نے ہم لوگوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔ دوران گفتگو میں مسٹر اسد نے گورنر سے پوچھ لیا کہ شیخ عبدالوہاب کا مزار کہاں ہے؟" اس پر گورنر صاحب نے جو ایک عمر رسیدہ سعودی تھے قبر پرستی کے خلاف ایک لمبا لیکچر دیا۔ گفتگو عربی میں تھی، لیکن جذبات کے اتار چڑھاؤ سے میں نفس مطلب

سمجھ گیا۔ بعد ازاں ہم لوگوں نے قدیم سعودی محلات، قلعہ اور جامع مسجد دیکھی، جو کچی مٹی کی بنی ہوئی ہیں اور اب کھنڈرات میں تبدیل ہوگئی ہیں لیکن سعود اول اور شیخ عبدالوہاب کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ریاض سے ۱۲ فروری کو میں جدہ کے لئے سعودی ایرلائینز کے طیارے سے روانہ ہوا۔ قبل از وقت میرے پروگرام سے جدہ میں سعودی حکومت کے تعلقاتِ عامہ کے دفتر کو مطلع کردیا گیا تھا اور تعلقاتِ عامہ کے افسر مسٹر احسام مجھے خوش آمدید کہنے جدہ ایرپورٹ پر موجود تھے۔ وہ واجبی انگریزی بولتے تھے۔ انھوں نے مجھے جدہ کے شاندار قصر الاحمر ہوٹل میں ٹھیرایا۔ اور بعد ازاں مجھے وزارت اطلاعات بھی لے گئے جہاں میں متعدد حکام سے ملا۔ دوسرے دن میں مسٹر احسام کی معیت میں مکہ معظمہ پہنچا، جہاں انھوں نے مجھے حرم سے متصل شبرہ ہوٹل میں ٹھہرایا۔ جہاں میرے لئے دو کمروں کا ایک سوٹ پہلے سے مختص تھا۔ مکہ معظمہ کے قیام کے پانچ دن میں میں نے پانچ عمرے کئے۔ یہاں حرم میں مجھے نوے فیصدی پاکستانی حجاج ملے جو پاکستان واپس جانے کے لئے بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ وہ حکومت پاکستان کے بڑے شاکی تھے جس کی عدم توجہی سے انھیں پانچ پانچ ماہ مکہ معظمہ میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ ہندوستانی حجاج بھی تین ماہ کے اندر واپس چلے جاتے ہیں اور ترکی اور انڈونیشی حجاج جن کی تعداد پاکستانی حجاج سے امسال کہیں زیادہ تھی، ایک دو ماہ کے اندر واپس چلے جاتے ہیں۔ لیکن پاکستانیوں کو پانچ پانچ ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس میں سے اکثر پاکستانیوں کی حالت زار دیکھ کر ترس آتا ہے

بعض تو بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور انتہائی گندے اور میلے لباس میں ملبوس رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ میں پاکستانی حاجیوں کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ عُسرت اور گرم مزاجی کی وجہ سے اکثر وہ مقامی دوکانداروں سے بھڑ جاتے ہیں۔

مکہ معظمہ میں پانچ دن قیام کرنے کے بعد میں مدینہ منورہ کو روانہ ہوا۔ میرے ساتھ وزارت اطلاعات کے مسٹر حسام تھے۔ وزارت اطلاعات نے ہمارے استعمال کے لئے نئی امپالا گاڑی اور ایک اردو داں ڈرائیور مہیا کیا تھا جس نے چار گھنٹے میں ہمیں مدینہ منورہ جو ساڑھے تین سو میل ہے پہنچا دیا راستے میں مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ جولائی ۱۹۲۶ء میں جب میری والدہ، دادی اور والد صاحب نے حج کیا تھا تو اتنا طویل سفر اونٹ کی پیٹھ پر کیسے طے کیا ہوگا۔ راستے میں تقریباً ایک گھنٹہ ہم نے بدر میں قیام کیا اور شہدائے بدر کے مزار پر فاتحہ پڑھا اور وہاں کی مشہور مچھلی کھائی۔ مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہی دل کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ اور طبیعت میں ہیجان بپا ہو گیا۔ یہ خیال کر کے کہ اس شہر نے کتنے عظیم انسانوں کی قدم بوسی کی ہے جن کا ثانی چشم فلک نے کبھی دیکھا ہے اور نہ دیکھنے کی امید ہے، تو دل کی دنیا تہہ و بالا ہونے لگی۔ مسجد نبوی پر جب پہلی نظر پڑی تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے جس کے ایک گوشے میں گنبد خضرا کے نیچے دنیا کے تین عظیم ترین انسان محو خواب ہیں۔

وہاں کے شاندار ہوٹل قصر مدینہ کے آرام دہ کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا۔ چار روزہ قیام کے دوران میں نے سارے تاریخی مقامات کی بار بار زیارت کی۔

شہدائے احد اور جنت البقیع میں متعدد بار فاتحہ خوانی کے لئے حاضری دی۔ جنت البقیع میں داخل ہوتے ہی دل میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا۔ اور اہلبیت کے مدفن پر فاتحہ پڑھتے وقت آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ عم رسول حضرت عباس۔ خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا۔ حضرت امام حسن۔ حضرت زین العابدین۔ حضرت جعفر صادق اور حضرت موسیٰ کاظم کی شخصیت ان کی سیرت اور کارنامے نگاہوں کے سامنے پھر گئے، دل یہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا کہ ایسے عظیم انسان دنیا میں دوبارہ پیدا ہوں گے۔ امہات المومنین نیز حضرت عبداللہ بن عمر حضرت امام مالک، خلیفہ ثالث حضرت عثمان۔ حضرت حلیمہ سعدیہ اور شہدائے احد کے مدفن پر فاتحہ پڑھا اور بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اس قبرستان میں کتنے عظیم انسان دفن ہیں۔ ایک روایت کے مطابق قیامت کے دن اس قبرستان سے ایسے دس ہزار انسان اٹھیں گے، جن کے چہرے چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔

مدینہ منورہ کے دوران قیام میں روزانہ روضہ رسولؐ پر سلام پڑھنے حاضر ہوتا تھا۔ سلام پڑھتے وقت بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے تھے اور دل سے آواز نکلتی تھی "اے خاتم الانبیا اور کائنات کے عظیم ترین انسان اپنے ایک گنہگار امتی کا سلام قبول کرو۔ اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی شفاعت کیجو"۔

مدینہ منورہ سے جمعہ کی نماز مسجد نبوی میں ادا کرکے ۲۱ ر فروری کو ہم لوگ جدہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں سبزی مارکیٹ میں احسام صاحب نے خرید و فروخت کے لئے گاڑی روکی۔ میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ گاڑی کے قریب ہی پلاسٹک کی تھیلی میں سفید الائچی کا ایک بڑا پیکٹ کسی کا

گر گیا تھا۔ وہاں سے متعدد راہ گیر گزرے لیکن کسی نے اسے اٹھانے کی زحمت نہیں کی۔ ایک راہ گیر نے گزرتے ہوئے وہ پیکٹ اٹھا کر گاڑی کے مڈگارڈ پر رکھ دیا۔ ڈرائیور آیا تو اس نے بھی اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ راستے بھر دوسری گاڑی والے اسے اشارہ کرتے رہے کہ الائچی کا پیکٹ اس کی گاڑی پر رکھا ہوا ہے لیکن ڈرائیور نے اسے ہاتھ لگانا گوارا نہ کیا اور آخر کار وہ سڑک پر کہیں گر گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہاں صرف یہ ہے کہ سعودی عرب میں چوری مفقود ہے۔ جوہری بلاخوف وخطر اپنی دوکان کھلی چھوڑ کر دوپہر کو نماز پڑھنے اور کھانا کھانے چلے جاتے ہیں اور کوئی شخص سڑک پر پڑی ہوئی چیز بھی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ وہاں ایمانداری کا یہ عالم ہے۔ اس کے دو دن بعد جب میں کراچی پہنچا تو اسی دن جنگ اخبار کی دو خبروں پر میری نظر پڑی۔ لاڑکانہ میں ایک گھڑی ساز ۹ بجے دن کو اپنی دکان کھول رہا تھا۔ اس نے گھڑیوں کا تھیلا پاس ہی رکھ دیا اور قفل میں کنجی گھمائی۔ پلٹ کر دیکھا تو تھیلا غائب تھا۔ دوسری خبر میں چند گرہ کٹ حیدرآباد کی ایک دکان میں گھس گئے۔ ایک شخص کی جیب پر وار کیا تو ایک نوجوان نے دیکھ لیا اس نے گرہ کٹ کو پکڑنا چاہا تو اس کو چھرا مار دیا، دوسرا نوجوان آگے بڑھا تو دوسرے گرہ کٹ نے اسے بھی چھرا مار دیا۔ اور دونوں فرار ہو گئے۔ سعودی عرب میں چوری کے فقدان کے برخلاف پاکستان میں دن دہاڑے ڈاکہ زنی نے میرے لئے ایک بہت دل شکن تضاد پیش کیا۔

مدینہ منورہ سے جدہ واپسی کے دوران بدر کے مقام سے قبل سڑک

پہاڑی علاقے سے گزرتی ہے۔ اور کافی پر پیچ ہے۔ اس دن بارش ہو رہی تھی۔ ہمارا ڈرائیور بڑا اشتاق تھا۔ وہ اپنی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا۔ اتفاقاً ایک موڑ پر ہماری گاڑی کی ٹکر دوسری سمت سے آنے والی ایک ٹیوٹا ۲۰۰۰ سے ہو گئی ٹیوٹا کا ڈرائیور جائے حادثہ پر ہلاک ہو گیا۔ اور اس میں سفر کرنے والے باقیماندہ تین آدمی شدید زخمی ہوئے۔ ہماری گاڑی جو بہت مضبوط اور بھاری تھی، محفوظ رہی صرف سامنے کا حصہ قدرے دب گیا۔ ہم لوگوں کو خفیف ضربیں آئیں اور جھٹکا البتہ بڑا شدید لگا۔ ہمارا ڈرائیور اپنی جگہ سے نہیں ہٹا اور پولیس کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ وزارت اطلاعات کو خبر کی گئی۔ انھوں نے ہماری جدہ واپسی کا انتظام کیا اور پولیس نے ہمارے بیانات قلم بند کر کے گلوخلاصی کی۔ ڈرائیور کو حراست میں لے گئے۔ بدر کے ایڈ منسٹریٹر (ڈپٹی کمشنر) کو وزارت اطلاعات نے ہدایت کی، ان کے مہمانوں کو بیان لے کر جانے دیا جائے اور انھیں جدہ جانے کے لئے گاڑی فراہم کی جائے۔ جو ہمیں کی گئی اور ہم اس سے بارہ بجے شب میں جدہ پہنچ گئے۔

جدہ میں مجھے وہاں کے مشہور ریاض ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ جہاں ایک سوٹ پہلے سے میرے لئے مختص تھا۔ جس میں ڈرائنگ روم۔ ریڈیو۔ ٹی۔ وی جائے نماز۔ قرآن شریف، خوشبوئیں۔ خط لکھنے کے کاغذ وغیرہ سبھی کچھ بڑے قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے دن بھر میں صاحب فراش رہا۔ مجھ سے پلنگ سے اٹھا نہیں جاتا تھا۔ تیسرے دن ۲۳ فروری کو سعودی طیارے سے میں کراچی پہنچ گیا۔

سعودی عرب میں دولت کی جو ریل پیل ہے۔ اس کا اندازہ ٹائم میگزین کے ۶ر جنوری ۱۹۷۵ء کے پرچے اور لندن اکنامسٹ کے مضامین سے لگایا جاسکتا ہے، دولت کا توازن اب امریکہ اور یورپ سے عرب ممالک کی جانب جھک گیا ہے اور وہ دنیا کی مالیات پر جس طرح چاہیں اثر انداز ہو سکتے ہیں اور عالمی اقتصادیات اب ان کے رحم و کرم پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی ممالک کے فنی کارکن، سرمایہ دار۔ صنعت کار۔ صحافی سعودی عرب اور دیگر عرب ریاستوں پر گدھ کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں اور اس کی دولت سے حتی الامکان فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی ممالک کی دولت اسلامی ممالک ہی میں رہے، عرب ممالک کا پیسہ ہندوستانی مسلمان اور پاکستان کے فنی کارکن یہاں صنعتوں کا ایسا جال بچھادیں جس کی وجہ سے اسلامی ممالک جنگ اور امن کے سازوسامان میں مغربی ممالک کے دست نگر نہ رہیں۔ اور ہر معاملے میں خود اپنے کفیل ہو جائیں۔ اس کے لیے پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کو عرب ممالک اور ان کے سربراہوں کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے انھیں اپنی محنت اور قابلیت، دیانت اور وفاداری کی ساکھ قائم کرنی چاہیے۔ اور اپنے ملکوں میں پیدا کردہ اشیاء کے معیار کو بلند کرکے مغربی ممالک کے برابر لانا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے ابھی تک یہ بات پیدا نہیں ہوسکی ہے یہی وجہ ہے کہ عرب ممالک اپنی ضروریات کے لیے مغربی ممالک کی تیار کردہ اشیاء اور وہاں کے افراد پر انحصار کرتے ہیں اور سعودی عرب کے بازار ہر قسم کے مغربی سازوسامان سے بھرے پڑے ہوئے ہیں، اور ان کے تیل کے کارخانے امریکیوں اور غیر ملکیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں

کچھ اپنے بارے میں

(۲)

۱۹۱۳ء میں رجب کی کوئی تاریخ تھی، جب میں ضلع فیض آباد کے گاؤں تاجپور کے ایک معزز زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ ہمارے گھرانے میں اولاد نرینہ کی بڑی کمی تھی۔ میرے دادا کے بڑے بھائی لاولد تھے۔ اور میرے دادا کے ایک ہی لڑکا تھا اور میں اپنے والد کی پہلی اولاد نرینہ تھا۔ مجھ سے قبل ان کے دو بیٹے مردہ پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے میری پیدائش پر جس قدر دھوم دھڑکا نہ ہوتا کم تھا۔ میری پیدائش پر کچھوچھہ شریف کے سجادہ نشین مولانا شاہ وجیہہ الدین صاحب اشرفی نے جنھیں ہمارے بھائی بہن مولانا دادا کہتے تھے۔ میرے کان میں اذان دی۔ نام تجویز کیا۔ مجھے دو پیسے میں میرے والدین سے خریدا۔ اور جب میں چار سال کا ہوا تو میری بسم اللہ کی رسم بھی ادا کی۔ شاہ وجیہہ الدین صاحب میری پھوپھی کے خسر تھے۔

جب چار پانچ سال کا ہوا تو مکتب میں بٹھایا گیا۔ میرے والد نے جو علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور زمینداری کے ساتھ ساتھ تجارت بھی

کرتے تھے ایک قابل اور پرجوش استاد مولوی محمد نصیر کو میری تعلیم کے لئے ملازم رکھا۔ وہ ہمارے گھر ہی پر رہتے تھے اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد گھر کے ایک فرد سمجھے جانے لگے۔

یہ مکتب میرے گھر کے ایک کمرے میں لگتا تھا۔ میرے والد نے گاؤں میں ہمارے خاندان کے دوسرے ہم عمر لڑکوں کو میرے ساتھ بٹھا دیا تھا تاکہ میری دلبستگی بھی رہے اور وہ بچے بھی ابتدائی تعلیم سے بہرہ مند ہو جائیں۔ مولوی نصیر صاحب ایک ماڈرن مولوی تھے اور کچھ عرصے قبل ندوہ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تھے۔ انھوں نے میل ٹرین کی رفتار سے مجھے قرآن مجید ختم کرایا۔ اقبال کا ترانہ، بچے کی دعا اور حالی کی" وہ دنیا میں رحمت لقب پانے والا" حفظ کرائی جسے ہم مکتب بچے بڑی خوش الحانی سے روزانہ صبح کورس کے طور پر پڑھا کرتے تھے۔ مولوی صاحب شام کو ہم لوگوں کو کھیل کے میدان میں لے جاتے تھے اور گاؤں میں پہلا فٹ بال انھوں نے منگایا تھا جسے بچے بڑے ذوق وشوق سے کھیلتے اور کبھی کبھی مولوی صاحب بھی ہم لوگوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتے تھے۔

اس زمانے میں کانگریس اور خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ مولوی نصیر صاحب کانگریس خلافت کے بڑے پرجوش مبلغ تھے۔ ان کی تبلیغ کا اثر میرے والد نے بھی قبول کیا اور وہ بھی زمینداری اور تجارت کو تج کر خلافتی ہو گئے۔ احمد آباد کانگریس کے اجلاس میں میرے والد نے پانچ ہزار والی کرسی کا ٹکٹ خریدا، اور بدیشی مال کا جب بائیکاٹ ہوا تو مجھے یاد ہے

میرے والد نے اپنے۔ والدہ۔ گھر والوں اور خاندان والوں کے بدیشی کپڑوں کا ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا۔ خلافت کے چندے میں گاؤں والوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور خواتین نے اپنے زیور تک دے دئے۔

میرا گھر خلافت کا اہم ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ جہاں روزانہ درجنوں والنٹیئر آتے جاتے اور کھاتے پیتے رہتے تھے۔ گھر کی دولت پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اور میرے والد "خلیل میاں کی جے" کے نعروں سے ضلع کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ اور "بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دیدو" گھر گھر بڑی عقیدت سے گایا جاتا تھا۔

میرے والد بہت اچھے مقرر تھے۔ وہ بڑی موثر تقریر کرتے، لیکن اپنی گفتار میں ذرا محتاط تھے۔ اس لئے قانون کے شکنجے میں نہیں آتے تھے۔ اس کے برخلاف مولوی نصیر صاحب بڑے پرجوش مقرر تھے، اور تقریر کے دوران اول فول بک جاتے تھے اور انگریزوں کے خلاف گالی گلوج پر اتر آتے تھے، بلکہ بعض وقت ان کی تقریروں سے بغاوت کی بُو آتی تھی۔ اس لئے دھر لئے جاتے تھے۔ اور جیل کی سزا کاٹ کر باہر نکلے" تو استقبالیہ جلسوں میں ہی ایسے بے قابو ہو جاتے اور ایسی دھواں دھار تقریر کر جاتے کہ گھر پہنچنے سے قبل ہی انھیں دوبارہ حکومت کا مہمان بنا دیا جاتا۔ غرضکہ وہ اتنی بار جیل گئے کہ جیل برڈ (جیل کی چڑیا) ہو کر رہ گئے۔

میرے دادا ضلع کی ایک بڑی مسلم ریاست کے مدار المہام تھے۔ اور راجہ صاحب میرے دادا کی اتنی عزت کرتے تھے کہ انھیں ہمیشہ "بھائی صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میرے دادا نے اس ریاست کے بنانے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ میرے والد جب خلافت میں شامل ہوئے تو دادا نے بہت روکا کہ بنی بنائی ساکھ کو مٹی میں

مت ملاؤ اور پشتینی دولت کو پانی کی طرح مت بہاؤ۔ لیکن میرے والد پر خلافت کا رنگ ایسا چڑھ گیا تھا کہ دنیا اور دولت انھیں ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ میرے والد کی تحریک پر رعایا راجہ صاحب کی باغی ہوگئی اور ان کی رسد رسائل، ان کا حقہ پانی بند کر دیا۔ مجبوراً میرے دادا کو ملازمت سے استعفیٰ دے کر گھر بیٹھنا پڑا۔

میرے والد بھی دھن کے پکے تھے۔ قومی فریضہ کے مقابلے میں انھوں نے دنیاوی جاہ وحشمت اور باپ کی خفگی کی بھی پرواہ نہ کی۔ اور جو راہ اختیار کی تھی اس پر آخر وقت تک قائم رہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے ہماری مالی حالت تباہ ہوگئی۔ بعد ازاں انھوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت بھی اس جوش وخروش کے ساتھ کی۔

ہمارے دادا بڑے نیک اور محنتی انسان تھے۔ وہ اپنی اولاد سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ اس کے برخلاف دادی بڑی تیز مزاج اور خود پرست خاتون تھیں۔ گاؤں والے ان سے ڈرتے تھے۔ اور اکثر ان کی ڈانٹ پھٹکار کا نشانہ بنتے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں میرے دادا کو میری دادی نے کافی تنگ کیا۔

میری والدہ ایک انتہائی دیندار اور فرشتہ خصلت خاتون تھیں۔ میں ساتویں درجے میں تھا کہ فریضۂ حج کی واپسی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی ساری باتیں اب بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ میں نے ایسی دیندار۔ خدا ترس۔ نیک طینت اور عظیم خاتون اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔ سارا خاندان ان کی عزت کرتا تھا۔ جو کوئی بھی ان سے ایک بار ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ زندگی کے آخری زمانے میں انھیں مختلف صدمات نے دق کا مریض بنا دیا تھا۔ اور فریضۂ حج کے سلسلے میں حجاز کی گرمی نے اس مرض کو ابھار دیا۔ حج کی واپسی پر گھر پہنچنے سے قبل ۳ ستمبر ۱۹۲۶ء

کہ کان پور ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ میری زندگی کا سب سے زیادہ سوگوار دن تھا۔

میرے والد نے میری والدہ کے انتقال کے تین چار ماہ بعد خاندان کی ایک خاتون سے شادی کر لی جو عمر میں میری دونوں بڑی بہنوں سے چھوٹی تھیں، اور بہت تیز مزاج مشہور تھیں۔ لیکن خلاف توقع شادی کے بعد ان میں بڑی خوشگوار تبدیلی واقع ہوئی۔ اور بڑی ہمدرد اور خوش مزاج بن گئیں۔

میری دو بڑی بہنوں میں سب سے بڑی زاہدہ مرحومہ واقعی اسم با مسمیٰ تھیں انتہائی شریف النفس اور نیک طینت بڑی حد تک وہ میری والدہ کا پرتو تھیں۔ ان کی حد درجہ رواداری ان کی سسرالی زندگی کو ناخوشگوار بنانے کا باعث ہوئی وہ سب کو خوش رکھنا چاہتی تھیں جو امر محال تھا۔ اس کے برخلاف دوسری بڑی بہن شاکرہ مرحومہ نے جو قدرے بے پرواہ تھیں کامیاب سسرالی زندگی گزاری۔ چھوٹی بہن فاطمہ بڑی متواضع لیکن ذرا شکی مزاج واقع ہوئی ہیں۔

میرے دونوں چھوٹے بھائی مجھ سے کافی مختلف ہیں۔ وہ ہیں زمانہ شناس اور میں ٹھہرا زمانہ ناشناس۔ یہاں ایک واقعہ کا بیان برمحل ہوگا، صنعتی ترقیاتی بنک میں میں افسر تعلقات عامہ تھا۔ میرے ایک بڑے افسر نے مجھ سے ایک بار کہا: "خواجہ صاحب آپ اپنا کام اے ون (A-One) یعنی بہترین طریقہ سے سرانجام دیتے ہیں پھر بھی آپ کی خاطرخواہ ترقی نہیں ہوتی۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ آج کل کے زمانے اور خصوصاً پاکستان میں کام سے زیادہ سلام چلتا ہے (کارگر ہوتا ہے)"۔ میں نے جواب دیا" آپ کی ہمدردی اور ذرہ نوازی کا شکریہ۔ مگر کیا

کیا جائے سلام کے آداب سے ابھی میں واقف نہیں۔ کیونکہ اپنے خاندان میں پہلا شخص ہوں جو ملازمت کر رہا ہے۔ غلامی کے آداب آتے آتے آئیں گے۔"

بیویوں کے معاملے میں ہمارے پھوپھی زاد بھائی زیادہ خوش قسمت ثابت ہوئے ہیں۔ خاص کر میاں چھبن (سید شرف الدین اشرف) کی بیوی سیرت اور صورت دونوں میں بلند پایہ۔ میاں منو (سید معین الدین اشرف) کی بیوی انتہائی شائستہ تعلیم یافتہ اور خوش مزاج۔ میاں شمشو (سید شمس الدین اشرف) کی بیوی اللہ میاں کی گائے ہیں۔

اپنے بارے میں کیا لکھوں۔ من آنم کہ من می دانم۔ ایں بندہ حقیر سراپا تقصیر گنہگار رحمت ایزدی کا امیدوار۔ طبیعت بڑی حساس پائی ہے۔ طبیعت میں جلد بازی اور قدرے اختلاج پایا جاتا ہے۔ اس لئے تحریر سے تو کام چلا لیتا ہے لیکن تقریر میں نروس ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقابلہ کے تحریری امتحانوں میں ہمیشہ اچھے نمبر حاصل کرتا رہا۔ لیکن انٹرویو میں اکثر و بیشتر گول ہو گیا۔ بحرانی حالتوں میں قوت فیصلہ جواب دیدیتی ہے۔ لیکن اگر پڑ جائے تو وہی مثل ہے مرتا کیا نہ کرتا جھیل جاتا ہے۔ طبعاً کم آمیز واقع ہوا ہے۔ اس لئے احباب کا دائرہ محدود بلکہ معدوم ہے۔ جو لوگ نہیں جانتے وہ بندہ کی طبعی خاموشی کو تمکنت پر محمول کرتے ہیں لیکن حقیقتاً بندہ سراپا عجز و انکسار ہے۔ نظر تاریک پہلو کو زیادہ دیکھتی ہے۔ وسوسوں اور وحشت کا یہ عالم ہے کہ بچے اگر باہر جاتے ہیں جب تک واپس نہیں آجاتے طبیعت کو قرار نہیں آتا ہے۔ اکثر انتظار میں رات کٹ جاتی ہے۔ میری بیوی کے واحد بھتیجے "لیٹ لطیف" کی زندہ مثال ہیں وہ گاڑی چھوٹنے

کے ایک گھنٹہ بعد اور میں ایک گھنٹہ قبل پہنچ جاتا ہوں۔

میری والدہ کے انتقال کے چند ماہ بعد میرے والد نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی وکیل کو ہمارے رشتہ کے ماموں قاضی انعام اللہ صاحب سابق ایڈیٹر صدائے مسلم کے پاس جو مسلم ہائی اسکول کانپور میں ہیڈ کلرک تھے تعلیم حاصل کرنے بھیج دیا۔ میں اس وقت ساتویں درجہ کا طالب علم تھا۔ اور وکیل تیسرے درجے کے ہمارے ماموں دیندار لیکن بہت تنگ مزاج اور چڑچڑے واقع ہوئے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر لعن طعن کرنے لگتے۔ اور اکثر ہاتھ چھوڑ دیتے۔ میں تو بڑا سخت جان تھا ان کی سختیوں کو تقریباً چار سال تک جھیلتا رہا۔ لیکن چھوٹے بھائی اس مشق ستم کی تاب نہ لاکر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور کانپور سے اکبر پور پہنچکر دم لیا۔

حلیم مسلم ہائی اسکول بہت اچھا اسکول تھا۔ اس کے ہیڈ ماسٹر عبد الحمید خاں صاحب تھے، جو ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے آئے تھے۔ لیکن بڑے نستعلیق قسم کے ذرا چڑچڑے مزاج کے تھے۔ چوڑی دار پاجامہ شیروانی اور ترکی ٹوپی زیب تن کرتے تھے۔ وہاں ایک انتہائی ماڈرن مولوی محمد طاہر فاروقی آئے، جو کرکٹ کھیلتے تھے اور بہت دنوں تک طلبا کا موضوع گفتگو بنے رہے۔ انگریزی اسکول میں مولوی کا تصور ابھی تک بہت دقیانوسی تھا۔ صوم صلوٰۃ کے پابند مشرع اور وضعدار قسم کے بزرگ۔ اس اسکول میں دوسرے مولوی کچھ اسی قسم کے تھے اور حالی ثانی معلوم ہوتے تھے۔ اسی اسکول میں ۱۹۲۹ء میں منعقد شدہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں کو

میں نے پہلی بار دیکھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے کانفرنس کی صدارت کی تھی۔ ان کی تقریر کا نقش اب بھی میرے دل پر ہے۔ میں اس زمانے میں نویں درجہ کا طالب علم تھا۔

جلیم مسلم ہائی اسکول سے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرکے میں نے گورنمنٹ کالج فیض آباد میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی بڑے دلچسپ دو سال گزرے۔ ایف اے کے آخری سال میں فیل ہو گیا۔ تحریری امتحان میں میری زندگی کی یہ پہلی اور آخری ناکامی تھی۔ میں ہوسٹل میں قیام پذیر تھا۔ سالانہ امتحان قریب تھے۔ ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ مسٹر بنرجی سے ایک معاملے میں سخت کلامی کی بنا پر مجھے ہوسٹل چھوڑنا پڑا۔ اس کا مجھ پر بہت برا نفسیاتی اثر ہوا۔

دوسرے سال پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے ایف اے پاس کرنے کے بعد الہ آباد یونیورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اور مسلم ہوسٹل میں قیام پذیر ہوا۔ یہ ہوسٹل میور سنٹرل کالج کے احاطہ میں واقع تھی اور اس سے متصل وسیع الفریڈ پارک تھا۔ جس میں شہرہ آفاق پبلک لائبریری واقع تھی۔ اس ہوسٹل کی روایات میں علی گڑھ یونیورسٹی کا رنگ غالب تھا۔ اس سے متصل میور ہوسٹل کے برخلاف جہاں پڑھائی کا ماحول رہتا تھا مسلم ہوسٹل میں کھیل کود کا دور دورہ رہتا تھا! اس کے باوجود آئی سی ایس اور دوسری مرکزی ملازمتوں کے مقابلہ کے امتحانات میں جو مسلمان طلباء کامیاب ہوتے، وہ اسی ہوسٹل کے ہوتے تھے۔ مرکزی ملازمتوں میں کامیاب ہونے والے اس ہوسٹل کے طلباء کی فہرست بہت طویل ہے، جو یہاں نہیں دی جا سکتی ہے۔

اس ہوسٹل میں داخل ہونے والے نئے طلباء کو فرسٹ ایرفول (FIRST

YEAR FOOL) کہا جاتا تھا۔ اور انھیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا اور بیوقوف بنایا جاتا تھا۔ اس میں رات میں ان کے بستر پر صراحی پھوڑنا۔ تکیہ سے ان کی مرمت کرنا۔ پلنگ الٹ دینا۔ انھیں گانے اور اشعار سنانے پر مجبور کرنا اور اسی قسم کی دوسری شرارتیں شامل ہوتی تھیں۔ اگر کوئی طالب علم اس پر اکڑتا تھا تو اسے اور بھی زیادہ تنگ کیا جاتا تھا۔ ایک مثال یہاں کافی ہوگی۔ بدایوں کے ایک طالب علم بھائی مظاہر تھے۔ جو واقعی بیوقوف اور جملہ باز تھے۔ جنھوں نے ایک سینئر طالب علم پر جملہ بازی کردی۔ سہ پہر کو جب یونیورسٹی سے وہ واپس آئے تو دیکھا کہ ان کے دروازے پر ایک پوسٹر لگا ہے جس پر جلی حرفوں میں تحریر تھا۔

"مظاہر کے کمرے میں گدھا بندھا ہے۔ گدھے سے ملنے کو گدھا چلا ہے"۔

مظاہر نے جو کمرہ کھولا تو واقعی ایک گدھا اس میں بندھا تھا۔

فرسٹ ایر فولز کو تنگ کرنے کا سلسلہ شاہ جلال کے فاتحہ تک جاری رہتا۔ یہ فاتحہ بڑے دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ اس میں سارے فرسٹ ایر کے طلباء کی حاضری ضروری ہوتی تھی۔ ہال میں وہ آگے بٹھائے جاتے تھے، اور سینئر طلبا ان کے پیچھے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی شاہ جلال کا روپ دھارتے تھے۔ بڑا چوغہ۔ لمبی داڑھی۔ اونچی کلاہ زیب تن کئے عربی فردٹ بولتے جاتے تھے۔ قلعہ الموت کے شیخ الجبال کی طرح وہ بڑے پر اسرار طریقے سے ظاہر ہوتے اس کے بعد خطابات تقسیم کرنے کی رسم شروع ہوتی۔ ہر فرسٹ ایر طالب علم کو بہت موزوں خطاب دیا جاتا تھا۔ بعض اشعار کی شکل میں ہوتے تھے۔ بعض جملوں کی صورت میں۔ جس طالب علم کا نام پکارا جاتا وہ کھڑا ہو جاتا۔ بعد ازاں

اس کے خطاب کا اعلان ہوتا اور سینئر طلباء کے قہقہوں کے ساتھ ساتھ وہ کڑھتا اور شرماتا ہوا بیٹھ جاتا۔

مسلم بورڈنگ ہاؤس کا سالانہ طرحی مشاعرہ اور طلبائے قدیم کا عشائیہ بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا تھا۔ مشاعرہ چندے سے ہوتا تھا۔ شہر کے سربرآوردہ اشخاص سے چندہ وصول کیا جاتا تھا۔ اس میں سر تیج بہادر کا چندہ سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ دسمبر کے وسط میں یہ سالانہ مشاعرہ منعقد ہوتا اس میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے نامور شعرا کو مدعو کیا جاتا تھا اور ان کی بڑی خاطر مدارات اور آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ مشاعرہ دس بجے شب سے شروع ہو کر صبح تین بجے تک جاری رہتا۔ ڈاکٹر اقبال کے علاوہ جو مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی نامور شاعر ہو گا جو اس مشاعرہ میں شریک نہ ہوا ہو۔ ان مشاعروں میں جگر۔ فانی۔ اصغر۔ جوش شکیل بدایونی۔ حفیظ جالندھری۔ روش صدیقی۔ صفی۔ سائل دہلوی۔ آرزو لکھنوی۔ تاباں بدایونی۔ ساغر نظامی کا رنگ بہت جمتا تھا اور مزاحیہ شعرا میں ظریف لکھنوی کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ تو مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ دوسرے دن شام کو ہوسٹل کے ہال میں مشاعرہ منعقد ہوتی تھی جس میں بیرونی شعرا اپنا چیدہ چیدہ غیر طرحی کلام سناتے تھے۔ یہ بہت مخصوص محفل ہوتی تھی۔ اس کے بعد باہر سے آنے والے شعرا الہ آباد میں متعدد مشاعروں اور نجی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس میں سے ایک مجلس سر تیج بہادر سپرو کے یہاں بھی منعقد ہوتی تھی۔

طالب علمی کا زمانہ زندگی کا سب سے خوشگوار زمانہ ہوتا ہے اور وہ بھی الہ آباد یونیورسٹی اور مسلم بورڈنگ الہ آباد یونیورسٹی کا ماحول جب یاد آتا ہے تو طبیعت میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی کچھ جھلکیاں مولانا نامی۔ ڈاکٹر حفیظ سید پروفیسر دیب اور راناڈے کے ابواب میں نظر آجائیں گی۔

طالب علمی کا سنہرا زمانہ ۱۹۳۷ء میں ختم کر کے جب میں ملازمت کے سلسلہ میں غلامی کے دور میں داخل ہوا تو شادی کا طوق بھی گلے میں ڈال دیا گیا۔ نئی احساس ذمہ داری نے ملازمت کی تگ و دو پر مجبور کیا اور آئی سی ایس اور پی سی، ایس کے امتحانات میں شریک ہونے کے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ جبکہ مجھ سے بہت کم تر درجہ کے طالب علم جن کو میں اکثر پڑھایا کرتا تھا مقابلہ کے امتحانات میں کامیاب ہوکر اچھے منصبوں پر فائز ہو گئے۔ مقابلہ کے امتحانات کے لئے دو تین سال یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ جس کے لیئے میرے پاس نہ سرمایہ تھا، اور شادی کے بعد نئی ذمہ داریوں کی وجہ سے نہ اس کی گنجائش۔ مجبوراً معلمی پر قناعت کرنی پڑی۔ اس طرح میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی میرے والد نے مجھے شادی کے لئے مجبور کر کے کی۔ جس نے میرے مستقبل کو بہت نقصان پہنچایا چھوٹی ملازمت کرنے کے بعد بڑی ملازمت ملنی محال ہوتی ہے جبکہ اس وقت کے ہندوستان میں ملازمتوں کا کال تھا اور میں فتحپور ایسی چھوٹی جگہ پر مسلم ہائی اسکول میں معلم تھا۔ جہاں مطالعہ کے لئے کوئی ڈھنگ کا کتب خانہ بھی نہ تھا۔ بقول کسے "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" شادی نے میرے مستقبل کو تاریک کر دیا۔

ملازمت کے سلسلے میں میں نے بڑے پاپڑ بیلے۔ ۱۹۴۲ء میں فوجی رسد و رسائل کے دفتر میں ایک سال تک ملازمت کی۔ یہ زمانہ کان پور اور دہلی میں گزرا۔ اور بعد ازاں جی آئی پی ریلوے کے یورپین گریڈ گارڈ میں میرا تقرر ہو گیا۔ یہ گریڈ بہت اچھا تھا اور اسی سال ہندوستانیوں کے لئے کھلا تھا اور اس میں ترقی کے بڑے امکانات تھے۔ اگرچہ یہ ملازمت میرے مزاج کے خلاف تھی۔ لیکن وہی مثل ہے مرتا کیا نہ کرتا۔ اس زمانے کے ہندوستان میں ملازمتوں کی کمیابی اور شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں نے مجھے اسے قبول کرنے پر مجبور کیا۔ طلبا پر حکم چلانے کے بعد اب میں گاڑی کو لال اور ہری جھنڈی دکھا کر چلانے لگا۔ زندگی کا ٹائم ٹیبل الٹ پلٹ گیا۔ نہ دن کو چین نہ رات کو آرام، نہ کھانے کا ٹھیک، نہ سونے کا۔ لیکن اس ملازمت میں مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کا بڑا موقع ملا۔ جبلپور سے الہ آباد تک سرسبز پہاڑیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چلا گیا تھا۔ ان سرسبز پہاڑیوں کے درمیان سے جس میں جا بجا ہرن کلیلیں بھرتے اور مور ناچتے نظر آتے تھے۔ جب ہماری ٹرین گزرتی تو طبیعت میں بڑی جولانی پیدا ہوتی اور جنت نشان ہندوستان کے وہ مناظر نظروں میں پھر جاتے جن کی تعریف میں ہزاروں سال سے شعراء رطب اللسان ہیں۔ الہ آباد سے مغل سرائے تک ریلوے لائن کے دونوں جانب حدِ نظر تک دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت مردہ سے مردہ دل کو زندہ کرنے کے لئے سامان مہیا کرتے تھے۔ وہ سبزہ زار اور وہ برکھا رت اب پاکستان میں خواب و خیال ہو گئی ہے۔ یہاں تو ٹرین سے سفر کیجئے تو راستے بھر دھول پھانکئے

جائیے۔ کھڑکی کھولنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔

اسی زمانے میں پاکستان کا غلغلہ ہر جانب سے بلند ہوا۔ برصغیر کی مسلم اقلیت کے صوبوں اور خصوصاً یو،پی میں تحریک پاکستان شباب پر تھی۔ بقول قائداعظم مسلم اقلیتی صوبے پاکستان کی جنگ کے ہراول دستے تھے۔ اور پنڈت نہرو کے اخبار نیشنل ہیرالڈ کے مطابق یو،پی کے مسلمانوں نے جناح صاحب کے لئے پاکستان بنوایا ورنہ ان علاقوں میں جہاں پاکستان قائم ہوا آخر وقت تک سرکاری طور پر پاکستان کی مخالفت ہوتی رہی۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت۔ پنجاب میں خضر حیات خاں کی یونینسٹ وزارت۔ سندھ میں جی ایم سید اور بنگال میں فضل الحق شیاما پرشاد مکرجی کے گروپ آخر وقت تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ یو،پی ہی میں صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو کی مسلم رابطہ کی تحریک (MUSLIM MASS CONTCT MOVEMENT) کو ناکام بنادیا گیا۔ اور یہاں مسلم نشستوں کے ضمنی انتخابات میں کانگریسی امیدواروں کی شکست نے پنڈت نہرو کے دعوے کو جھوٹا ثابت کردیا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں۔ برطانوی حکومت اور کانگریس اور قائداعظم کے چیلنج کو درست ثابت کردکھایا کہ ایک تیسری جماعت مسلم لیگ بھی ہے۔ یو،پی کے مسلمانوں میں پاکستان کے لئے بڑا جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ اور مسلم قوم کے "اسلحہ خانے" علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے حصول پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پاکستان کے حصول میں کانگریس کی ناعاقبت اندیشی کو بڑا دخل تھا۔ کانگریسی وزارتوں نے اگر رواداری اور فراخدلی سے

کام لیا ہوتا تو مسلم اقلیتی صوبوں میں تحریک پاکستان زور نہ پکڑتی۔ اور انھیں علاقوں کے مسلمانوں کے مثالی اتحاد اور جوش وخروش نے آخر کار پاکستان کے حصول کو آسان بنادیا اور پاکستان کو مسلم ہند کی ملک گیر تحریک بنا دیا اور قائد اعظم کے دو قومی نظریہ کو صحیح ثابت کر دیا۔

یو پی کے مسلم نوجوانوں میں اپنی خوابوں کی جنت پاکستان کی خدمت کا جذبہ بہت شدید تھا۔ قائد اعظم اور مرکزی حکومت نے جب مسلم ملازمین کو اس بات کا اختیار دیا کہ چاہے وہ پاکستان چاہے ہندوستان میں ملازمت کریں اور پاکستان جانے سے ان کی ملازمت برقرار رہے گی تو زیادہ تر مسلمان سرکاری ملازمین نے پاکستان جانے کو ترجیح دی۔ میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ وطن کی محبت بھلا کس کے دل میں نہیں ہوتی۔ فارسی کا مشہور مصرعہ ہے:

خاکِ وطن از ملک سلیماں خوشتر

لیکن خوابوں کی جنت کی خدمت کا جذبہ جہاں بقول قائد اعظم "اسلامی حکومت" قائم ہونی تھی وطن کی محبت پر غالب آگیا۔ اور ہم لٹے پٹے بمبئی کے راستے بحری جہاز سے کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔

الہ آباد سے بمبئی اور وہاں سے کراچی کا سفر بڑا صبر آزما تھا۔ الہ آباد اسٹیشن پر سارے مہاجرین کی بری طرح تلاشی لی جاتی تھی اور چند جوڑے کپڑے کے علاوہ انھیں کوئی چیز لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ کتابیں تک چھین لی جاتی تھیں اور تلاشی کے بعد انتظار میں ہفتوں پلیٹ فارم پر پڑا رہنا پڑتا تھا۔ جب تک تلاشی نہ ہو جائے گاڑی میں سوار ہونے کی اجازت نہ تھی۔

راستہ بھر راشٹریہ سیوا سنگھیوں کے حملے کا خطرہ تھا۔ جھانسی بھوپال وغیرہ میں گاڑیوں پر کئی حملے ہو چکے تھے۔ بمبئی پہنچے تو ذرا جان میں جان آئی لیکن یہاں حشر کا میدان بپا تھا۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ حاجیوں کے مسافر خانے میں جس میں ایک دو ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی پچاس ہزار مہاجرین پاکستان جانے کے لئے ٹھونسے ہوئے تھے۔ صفائی اور ستھرائی تو الگ رہی، رات میں ایک کے اوپر دوسرا لدا پڑتا تھا۔ یہ ہمت شکن ماحول دنوں، ہفتوں نہیں مہینوں جاری رہتا تھا۔ پاکستانی دفتر سے جو وہاں قائم کیا گیا تھا جب جہاز کا ٹکٹ مل جاتا تو جا کر حاجی کیمپ کے چڑیا خانے سے خلاصی ملتی۔ جہاز کا بھی یہ عالم تھا کہ دو ہزار کی گنجائش میں سات آٹھ ہزار مسافر بھر دئے جاتے تھے۔ ہم جس جہاز سے آئے اس کی یہی کیفیت تھی۔ خیریت ہوئی کہ جاڑے کا موسم تھا، گرمی ہوتی تو کتنے اپنی خوابوں کی جنت میں پہنچنے سے قبل ہی راہئ ملک عدم ہو جاتے۔

کراچی کی بندرگاہ پر جب ہمارا جہاز لگا تو مسافروں میں عجب جوش و خروش کا عالم تھا۔ پاکستان کی "مقدس" سرزمین جب نظر آئی تو مسافروں نے نعرۂ تکبیر۔ پاکستان زندہ باد اور قائد اعظم زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سارا جہاز نعروں سے گونج رہا تھا۔ لیکن ساحل پاکستان سے ان نعروں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ چند افراد جو گودی پر نظر آئے وہ اپنے عزیزوں کی تلاش میں آئے تھے۔ سرزمین پاکستان کی اس سرد مہری سے دل کو دھچکا سا لگا۔ رات ہم لوگوں نے کیماڑی کے ایک شیڈ میں بسر کی۔ اس زمانے میں پھلوں کی بہتات تھی۔ انگور، انار، سیب کوڑیوں کے مول

فروخت ہو رہا تھا، چار آنے سیر قندھاری انار اور چھ آنے سیر انگور۔ کھانے کا بھی یہی حال تھا۔ چار آنے میں پیٹ بھر کے گوشت روٹی کھا سکتے تھے۔ اور اچھا خاصہ مزیدار۔ ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان کی یہ ارزانی بڑی خوش کن تھی۔

کوٹری میں میری تعیناتی ہوئی۔ لیکن یہاں کی دنیا ہی نرالی تھی۔ اور ریلوے کے رسم و رواج ہندوستانی ریلوے سے بالکل مختلف تھے۔ جی، آئی، پی، ریلوے میں گارڈ کو بالائی آمدنی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور پاکستان میں کوئی گارڈ اپنی جیب گرم کئے بغیر کوئی سامان ہی نہیں چڑھاتا تھا۔ اور اگر وہ اس سے انکار کرتا تو ریلوے اسٹاف اس کے خلاف ہو جاتا تھا۔ کیونکہ اس سے ان کی بالائی آمدنی پر اثر پڑتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستانی ریلوے کے گارڈ کوٹھیوں اور فیکٹریوں کے مالک تھے۔ حالانکہ ان کی تنخواہ کے گریڈ ہندوستان سے آئے ہوئے گارڈوں کے مقابلہ میں بہت کم تھے۔ یہ حالت دیکھ کر ہندوستانی ریاستوں کے ضلعدار یاد آ گئے، جو پندرہ روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے، لیکن پانچسو کے گھوڑے پر سواری کرتے۔ ریلوے ڈبوں میں چوری عام تھی۔ اس میں اکثر ریلوے اسٹاف ملوث ہوتا تھا۔ ایسے ماحول میں میرے لئے کام کرنا محال تھا۔ ہر طرف رشوت کی گرم بازاری تھی، جو اب بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ دوسرے سب دھان یہاں بائیس پسیری تھے۔ ہندوستان سے آنے والے زیادہ تنخواہ پانے والے گارڈوں سے پاکستان کے ۸۵ روپے ماہوار پانے والے گارڈ سینیئر کر دیئے گئے اور اس طرح ہم ایسے یورپین گریڈ

گارڈوں کا مستقبل یہاں تاریک ہو گیا۔ اور ترقی کی ساری راہیں مسدود ہو گئیں۔ یہاں کے پٹواریوں کی طرح یہاں کے ریلوے اسٹاف کو تنخواہ سے کوئی سروکار نہ تھا، ان کا کام تو دستِ غیب سے چلتا تھا اور خوب چلتا تھا۔

مجبوراً مجھے ریلوے کو خیرباد کہہ کر اپنے پرانے محکمہ تعلیم میں پناہ لینی پڑی سرکاری اسکول میں کچھ عرصہ تک معلمی کی اور پھر مرکزی دفتر اطلاعات میں انفارمیشن اسسٹنٹ (جرنلسٹ) ہو گیا۔ مرکزی وزارتوں میں ہر جگہ کوٹہ سسٹم لاگو تھا۔ کراچی کا کوٹہ صرف دو فیصد تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مقابلہ کے امتحانوں میں کراچی کا اسی فیصد پانے والا بدقسمت درخواست دہندہ منتخب نہیں ہو سکا۔ اور مشرقی پاکستان کے تیس فیصد پانے والے افراد منتخب ہو گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ کوٹہ سسٹم کا متعدی مرض اس ملکِ خداداد میں بُری طرح پھیلا۔ اور اب تو یہ عالم ہے کہ ملازمتوں۔ پرمٹوں۔ لائسنسوں۔ کالجوں کے داخلے اور ملازمتوں میں بھی اہلیت اور صلاحیت کے بجائے کوٹہ سسٹم کا سکہ چلتا ہے جس سے پاکستان کی کارکردگی کا معیار بہت گر گیا ہے اور کوٹہ سسٹم کے تحت وفود میں بھیجے جانے والے افراد غیر ممالک میں اکثر جگ ہنسائی کا سبب بنتے ہیں۔ کوٹہ سسٹم نے پاکستان میں علاقائیت۔ صوبائیت اور نااہلیت کو جس قدر فروغ دیا ہے اور اس ملک کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا اندازہ مستقبل کا مورخ ہی لگا سکے گا۔ قائدِ اعظم نے تو صلاحیت اور اہلیت کو پاکستان میں حصولِ ملازمت اور ترقی کی شرطِ اوّلین قرار دیا تھا لیکن ان کے جانشینوں نے اس کے برعکس نااہلیت اور ناکارکردگی کو فروغ دیا۔ اس زمانے میں ہمارے ملک سے

باصلاحیت اور قابل افراد کی غیر ممالک کو بڑے پیمانے پر مراجعت پاکستان میں کوٹہ سسٹم کے نفاذ کی وجہ سے ہے کراچی کے افراد کے لئے مرکزی ملازمتوں میں ترقی کی راہیں بڑی حد تک مسدود ہو گئی ہیں، اور اسے اتفاق کہیے یا شومیٔ قسمت، مسلم ہندوستان کی کریم (بالائی) کراچی میں جمع ہو گئی تھی علوم و فنون کے مختلف شعبوں کے بہترین باصلاحیت افراد ہندوستان سے آکر کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ اور یہ عجیب بات تھی کہ کراچی کے باصلاحیت افراد کو مغربی ترقی یافتہ ممالک امریکہ۔ کناڈا۔ انگلستان وغیرہ میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا لیکن پاکستان میں کوٹہ سسٹم کے تحت ان کے لیے بہت کم گنجائش تھی۔

مرکزی وزیر اطلاعات میں جہاں میں اسسٹنٹ انفارمیشن افسر ہو گیا تھا تنخواہ کی کمی کی وجہ سے مجھے ریڈیو اور اخبارات کے لئے مضامین لکھنے کی اجازت لینی پڑتی تھی جس کی اجازت آسانی سے مل جاتی تھی کیونکہ میں زیادہ تر غیر متنازعہ قسم کے تاریخی اور ثقافتی مضامین لکھتا تھا۔ اس سے میری آمدنی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس طرح میرا تعارف پاکستان کے تعلیم یافتہ اور سفارتی حلقوں میں ہو گیا۔ اور ۱۹۶۲ء میں جب میرا برطانوی محکمہ اطلاعات میں دوگنے مشاہرہ پر پریس افسر کی آسامی پر تقرر ہوا تو میں نے حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات سے استعفیٰ دے دیا جو منظور ہو گیا۔

برطانوی محکمہ اطلاعات کا کام ہمارے محکمہ اطلاعات سے بالکل مختلف تھا۔ میں اگر یوں کہوں تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ہمارا محکمہ اطلاعات برطانوی محکمہ اطلاعات سے ابھی دو صدی پیچھے ہے۔ برطانوی محکمہ اطلاعات میں جس سلیقے اور سائنٹفک

طریقے سے نشر و اشاعت کا کام ہوتا ہے اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی دوسرا ملک نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں تو اس کا دو فیصد بھی کام نہیں ہوتا ہے۔ وہاں خبروں۔ فیچروں۔ تصاویر کو بہت حقیقت مندانہ اور فراست سے تقسیم کیا جاتا ہے اور پاکستانی اخباروں رسالوں میں استعمال ہونے والے برطانوی مواد کی روزانہ۔ ہفتہ وار اور ماہانہ پیمائش اور تجزیہ کیا جاتا تھا پریس سے تعلقات عامہ کے لیے دو گھنٹے مخصوص تھے، اور پریس افسر روزانہ اخباروں کے ایڈیٹروں سے تبادلہ خیال کے لیے جایا کرتا تھا۔ یہ اس کا سب سے اہم فریضہ تھا۔

انگریز تو بڑا حقیقت پسند ہوتا ہے۔ برطانوی اقتصادی کساد بازاری اور برطانوی سیاسی حکمت عملی کی بنا پر اُسے اپنے عملے میں ۱۹۶۵ء کے بعد کافی تخفیف کرنی پڑی۔ برطانوی محکمہ اطلاعات پر بھی اس کا اثر پڑا اور پاکستان میں پریس افسر کی جگہ ختم کر دی گئی۔

مجھے تقریباً تین چار ماہ تک بیکار رہنا پڑا بعد ازاں مجھے پاکستان صنعتی ترقیاتی بنک میں افسر تعلقات عامہ کی جگہ مل گئی۔ لیکن یہاں کی دنیا برطانوی محکمہ اطلاعات سے بالکل الٹی تھی۔ برطانوی محکمہ اطلاعات میں کام ہی کام تھا اور بات کرنے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور صنعتی بنک میں کوئی کام ہی نہ تھا۔ گپ شپ اور مٹر گشتی میں دن گزر جاتا تھا۔ بد قسمتی کہیے یا خوش قسمتی ہمیں مینجنگ ڈائرکٹر ایسے ملے تھے جو پریس سے بہت خائف تھے اور پریس والوں کا سامنا کرنے سے بے حد گھبراتے تھے۔ ایک بار ایک مشہور روزنامے کا نمائندہ میرے پیچھے پڑ گیا کہ میں آپ کے ایم ڈی کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں

ایم ڈی سے کہا تو کہنے لگے کہ میں ڈاک (سوالات کے کٹہرے) میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا اپنے چار سالہ دور میں ایم ڈی صاحب نے کسی غیر ملکی صحافی سے ملاقات کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ صحافیوں سے ایسا ڈرتے اور بدکتے تھے جیسے کہ قصائی سے گائے ڈرتی ہے۔
اس معاملہ میں دوسرے دو ایک نیم سرکاری اداروں کے سربراہ بہت تیز تھے اور وہ ڈھونڈھ کر غیر ملکی صحافیوں کو انٹرویو دیا کرتے تھے۔ جس سے ان کے اداروں کی کارکردگی کی دنیا بھر میں بڑی پبلسٹی ہوا کرتی تھی۔

صنعتی بنک میں میرا کام اس وقت ہوتا تھا جب یہاں کوئی غیر ملکی وفد آتا تھا۔ اس وقت میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو سب کو جمع کر دیتا تھا۔ اس بنک کی حقیقی پبلسٹی کا موقع مجھے سال میں ایک بار ملتا تھا جب اس کا سالانہ اجلاس ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن۔ ریڈیو کے علاوہ سارے روزناموں میں اس کی تصاویر۔ خبریں اور اس پر اداریے لکھانے کا کام میں بخیر و خوبی سرانجام دیتا تھا۔ ایک سال میں نے صنعتی ترقیاتی بنک کی کارکردگی کی تعریف میں بائیس اردو انگریزی اخبارات سے اداریے لکھوا دئیے جو پاکستان میں ایک نہ ٹوٹنے والا ریکارڈ ہے۔ اس سال سارے نیم سرکاری ادارے جن میں پی آئی اے۔ نیشنل شپنگ۔ نیشنل بنک۔ اسٹیٹ بنک۔ پیکیک (PICIC) این آئی ٹی (NIT) آئی سی پی (ICP) شامل ہیں۔ اور جو ہمارے بنک کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ رقم پبلسٹی پر صرف کرتے ہیں۔ ان کی کارکردگی سے متعلق اخبارات میں لکھے جانے والے اداریوں کی مجموعی تعداد غالباً بیس سے زائد نہ تھی۔ اس سلسلے میں مجھے یہ غیر معمولی کامیابی محض اس لئے ہوئی تھی کیونکہ میں اخباروں کے ایڈیٹروں سے ذاتی طور پر واقف تھا اور ان کے لئے میں نے سینکڑوں مضامین لکھے تھے اور اکثر لکھا کرتا تھا۔

جنوری ۱۹۷۲ء میں صنعتی ترقیاتی بنک سے پچپن سال میں ریٹائر ہو گیا۔ یہ بھی میری قسمت کی خوبی تھی کہ اس کے پانچ چھ ماہ بعد ریٹائر ہونے کی عمر اٹھاون سال بڑھا دی گئی۔

اس درمیان میں میں کئی کتابوں کا مصنف ہو چکا تھا اور انگریزی زبان میں میری تصنیف "سو عظیم مسلمان"، جس کا پیش لفظ عالمی شہرت کے مورخ اور ادیب صحافی پروفیسر رشبرک ولیمز نے لکھا ہے۔ غیر ممالک خصوصاً یورپ اور امریکہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اب میرا مشغلہ تصانیف کے ذریعے مسلمانوں کے کارناموں سے مغرب اور مشرق کو حتی المقدور اپنی استعداد کے مطابق روشناس کرانا ہے لیکن پاکستان میں سنجیدہ ادب کی جو کساد بازاری اور یہاں کے پبلشر صاحبان ایسی کتابوں کو چھاپنے کے لئے جو نخرے کرتے ہیں وہ یہاں کے مصنفوں کے لئے بہت ہمت شکن ہے۔

مصنّف کی چند نادر تصانیف

"مشہور مسلمان سائنس داں"

مصنفہ: خواجہ جمیل احمد

پیغمبر اسلامؐ کی بے مثل تعلیم نے ایک ایسے انقلاب کو جنم دیا جس نے تیس سال کے قلیل عرصہ میں عربوں کو صاحب سیف و قلم بنا دیا، اور قرونِ وسطیٰ میں وہ ایک ایسی تہذیب کے بانی ہوئے جس کی ضوفشانیوں نے دنیا سے جہالت کی تاریکیوں کو دور کر کے ایسے افراد کو پیدا کیا جو زمانہ وسطیٰ میں مختلف سائنسی علوم کے امام تسلیم کئے گئے اور علوم و فنون کی وہ شمعیں روشن کیں جو مغرب میں نشاۃ ثانیہ کا سبب بنیں، مگر یہ بات ہمارے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کو بہت کم معلوم ہے کہ مسلمان سائنس دانوں ہی کے کارناموں پر جدید سائنس کی عظیم عمارت تیار ہوئی ہے۔ یہ کتاب انہی نامور مسلم سائنسدانوں کے عظیم الشان کارناموں پر روشنی ڈالتی اور مغربی مورخوں اور مصنفوں کے اقوال سے انھیں ثابت کرتی ہے۔

قیمت: چھ روپے ۶/-

اسلامی تہذیب کے گہوارے

مصنفہ: خواجہ جمیل احمد

اسلام کے برگزیدہ پیغمبرؐ کے تاریخی الفاظ نے کہ علم حاصل کرو خواہ وہ چین ہی میں کیوں نہ دستیاب ہو"۔ مسلمانوں میں حصولِ علم اور تلاش حقیقت کی ایسی لگن لگا دی جس نے انھیں علوم وفنون کا امام بنا دیا۔

زمانۂ وسطیٰ میں جب مغرب پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اسلامی ممالک میں علوم وفنون کی شمعیں روشن تھیں۔ مدینہ اور کوفہ، بغداد اور قرطبہ، قاہرہ اور نیشاپور، بخارا اور سمرقند اسلامی علوم وفنون کے اہم مراکز تھے جہاں دینی اور دنیاوی تعلیم کے بڑے بڑے مدارس درس وتدریس میں مشغول تھے۔ جن کی ضوفشانیوں نے آخر کار مغرب کی تاریکی کو دور کر کے وہاں پر نشاۃ ثانیہ کو جنم دیا۔

اس کتاب میں ایسے ہی تقریباً چالیس شہروں کا ذکر ہے جہاں اسلامی علوم وفنون کے اہم مراکز قائم تھے۔ ان میں سے متعدد مضامین مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز ریڈیو پاکستان کی غیر ملکی سروس سے بھی مختلف زبانوں میں نشر ہو چکے ہیں۔ ان مضامین میں ضروری تبدیلی کر دی گئی ہے۔

قیمت: دس روپے۔

وراثتِ اسلام

(خواجہ جمیل احمد)

دَورِ وسطیٰ میں جب سارا یورپ جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دنیائے اسلام میں علوم وفنون کی شمعیں روشن تھیں۔ قرطبہ اور بغداد، پالرمو اور قاہرہ کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ضوفشانیوں نے آخرکار یورپ کی جہالت کو دُور کرکے مغرب کی نشاۃ ثانیہ کو جنم دیا۔

اسلام کے برگزیدہ پیغمبرؐ اور ان کے مقدس صحابہ کرامؓ کی بے مثل تعلیم اور مثالی زندگی نے ایک ایسا حیرت انگیز انقلاب برپا کیا جس نے تیئس سال کے قلیل عرصہ میں خانہ بدوش عربوں کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنا دیا۔ اسلام کا یہ انقلاب مادی اور روحانی، اخلاقی اور علمی شعبہ ہائے زندگی پر محیط تھا۔ اس انقلاب نے بڑے بڑے صاحبِ سیف وقلم، عظیم مفکر، سائنس دان، اُولو العزم حکمران اور فاتح، بے مثل صاحبِ کردار و اخلاق پیدا کئے۔

وراثتِ اسلام میں دنیائے اسلام کے اس زرّیں دور کی مادی اور روحانی ترقیوں کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جو مغرب زدہ لوگوں کی اس غلط فہمی کو دور کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوگی کہ دنیا کی ساری ترقی مغرب کی مرہونِ منت ہے۔

قیمت: مجلد، ۶/۵۰

۵۱۲

نقوشِ سلیمانی

(مصنفہ سید سلیمان ندوی)

علامہ سید سلیمان ندوی کی عالمانہ تحریروں سے اردو ادب کو وسعت ملی اور اردو زبان کو اس وقت اعتماد دیا جب وہ دشمنوں کے نرغے میں تھی انھوں نے قلمی جہاد کیا اور اردو زبان کے لئے سپر بن گئے۔ وہ اردو اور اس کے مزاج سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔

نقوش سلیمانی میں دو طرح کے مضامین شامل ہیں ایک تو علمی اور تنقیدی، دوسرے فکری مسائل پر، ان کی تحریر میں شگفتگی اور خیال کی گہرائی ملتی ہے۔ زبان کے عام مسائل پر بھی انھوں نے دور رس باتیں کہی ہیں۔ کلکتہ کا خطبۂ صدارت، مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے لئے آج بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے انھیں معلوم ہوگا کہ ان کے لئے اردو کی اہمیت کیوں ضروری ہے، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب زندگی کا رنگ و آہنگ بدل رہا ہے۔ اس لئے زبان کا ڈھنگ بھی ضرور بدلے گا۔

سید صاحب کی تحریریں علمیت کا خزانہ ہونے کے باوجود اصطلاحات کی گرانباری سے آزاد ہیں۔ آپ کا اندازِ بیان واضح اور دل آویز ہے۔ خوش بیانی کا یہ لطف علمی اور ادبی کتابوں میں مشکل ہی سے ملتا ہے۔

نقوش سلیمانی ہمارے ادب کی ایسی کتابوں میں شامل ہے جو ہر دور میں زندہ رہتی ہیں۔ تعلیم یافتہ افراد کے لئے اس کا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔

مجلّد اور خوبصورت گرد پوش کے ساتھ قیمت: پندرہ روپے ۱۵/-

اردو اکیڈمی سندھ، کراچی

خواجہ جمیل احمد کی دوسری تصانیف

مشہور مسلمان سائنس دان

زمانۂ وسطیٰ میں دنیائے اسلام نے ایسے عظیم سائنس داں پیدا کئے جن کے کارناموں پر جدید سائنس کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوگی۔ اس کتاب میں ان ہی نامور سائنس دانوں کا ذکر ہے۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ صفحات ۲۰۸ ۔ مجلد گردپوش سے مزیّن ۔ قیمت: چھ روپے پچاس پیسے

اسلامی تہذیب کے گہوارے

زمانۂ وسطیٰ میں جب مغرب پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اسلامی ممالک میں علوم وفنون کی شمعیں روشن تھیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی چالیس شہروں کا ذکر ہے جو اسلامی علوم وفنون کے مراکز رہے ہیں۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ صفحات ۳۷۶ ۔ مجلد قیمت: دس ۱۰ روپے

وراثتِ اسلام

اس نادر کتاب میں دنیائے اسلام کے اس دور کی مادی اور روحانی ترقیوں کی ایک جھلک دکھائی گئی ہے جن کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں ملتی ہے۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ صفحات ۲۲۴ ۔ مجلد قیمت: سات روپے

اردو اکیڈمی سندھ کراچی